شیرازہ
افسانہ نمبر
جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر

دوماہی شیرازہ سرینگر

(افسانہ نمبر)

جلد ۱۵ شمارہ ۳، ۴، ۵، ۶

نگران و مدیرِ اعلیٰ

محمد یوسف ٹینگ

مدیرِ مسئول

رشید نازکی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر کشمیر

ترتیب

ناشر: سیکرٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سری نگر (کشمیر)

مطبع: جے، کے آفسیٹ پرنٹرس دہلی ۶

کتابت: غلام رسول علم گری بازار سرینگر

تعداد:

قیمت:

خط و کتابت کے لئے پتہ:
ایڈیٹر "شیرازہ" (اُردو)
کلچرل اکاڈمی، لال منڈی سرینگر

ڈوگری

کشمیری

پیش لفظ

"شیرازہ" کا یہ "افسانہ نمبر" کشمیر میں افسانے کی رفتار کا ایک جامع نقش پیش کرنے میں شاید کام یاب رہے! یہ واقعہ ہے کہ "افسانہ نمبر" کی ترتیب کا فیصلہ ذرا دیر سے ہوا اور ہمیں بڑی عجلت سے کام لینا پڑا۔ حالاں کہ ترجمہ بذاتِ خود ایک صبر آزما کام ہے، خاص طور پر اس لیئے کہ افسانے کی زبان عام ادبی انداز سے ذرا ہٹ کر ہی چلتی ہے۔ ہم نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ ہر زبان کے تاریخی اِرتقاء کا ایک مختصر سا جائزہ بھی پیش کیا جا سکے۔ لیکن افسوس ہے کہ پنجابی اور ڈوگری کے بارے میں ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ کشمیری جائزے میں ہمارے جائزہ نگار نے نئے قافلے کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کیا ہے، حالاں کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہمارے جوان سال افسانہ نگار بڑی کام یاب کوششوں میں مصروف ہیں اور تخلیقی اعتبار سے ان کی کہانیاں زندگی کی چھاتیوں کے بہت قریب نظر آ رہی ہیں ——— ایسے افسانہ نگاروں میں روشن لال پونیر، بشیر اختر، غلام نبی شاکر، ناصر منصور، غلام محمد آجر، رتن لال مجنوں اور دوسرے کہانی کار قابلِ ذکر ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے قارئین "افسانہ نمبر" کو پڑھ کر صحیح فیصلہ کر سکیں گے!

رشید نازکی

۱۶ مارچ ۱۹۷۷ء

پنجابی

جموّں و کشمیر میں اردو افسانہ کے نئے اُفق

محمد اسد اللہ وانی

جموّں و کشمیر میں اُردو افسانے کی ابتدا پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں سے ہوتی ہے مگر یہاں کی افسانہ نگاری کی تاریخ جب تک ادھوری سمجھی جائے گی جب تک کرشن چندر کا ذکر نہ کیا جائے، جن کا جموّں و کشمیر کے ساتھ گہرا لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے یہاں کے دل کش باغوں، دل رُبا کوہساروں، سرسبز و شاداب وادیوں، عطر بیز مرغزاروں، مترنّم و نغمہ ریز جھرنوں، آبشاروں اور رومان انگیز فضاؤں میں پرورش پائی۔ پھولے پھلے اور پروان چڑھے اور یہاں کے علمی، ثقافتی، تہذیبی اور تمدّنی خزینوں سے متاثر و سرشار ہو کر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ پروفیسر بلاقی رام سے لے کر بے بنکھ فرشتہ تک ان کے متعدد ناول اور افسانے ریاست اور اس کے ماحول سے متعلق ہیں۔ کردار یہاں کے عوام کی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا "ہاتو" زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی خاطر جد و جہد میں مصروف، دکھائی دیتا ہے، جن کے لبوں پر کرشن چندر نقرئی قہقہے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کرشن چندر بنیادی طور پر رومان

کے بعد کے افسانوں میں زندگی کی تلخیوں اور مدھر تاؤں کا سنگیت ساتھ ساتھ ملتا ہے۔ "نرکھ"، "شام و سحر"، "ہماری دُنیا"، "کیچڑ کے دیوتا" اور "بہتے چراغ" اسی قبیل کے افسانے ہیں

پریم ناتھ پردیسی کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں قدرت اللہ شہاب، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، مولا رام کوٹی (نرسنگھ داس نرگس)، ٹھاکر پونچھی، کوثر سیمابی، موہن یاور، دیا کرشن گردش، کیف اسرائیلی، اخگر عسکری، سوم ناتھ زتشی اور مہندر ناتھ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی، قدرت اللہ شہاب، رامانند ساگر، ٹھاکر پونچھی، پریم ناتھ در، مہندر ناتھ اور کشمیری لال ذاکر کے افسانے فن اور تجربے کے لحاظ سے بڑی حد تک ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فن پاروں میں زیادہ ترجموں و کشمیر کے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ اسی لئے ان سب نے اپنے افسانوں میں ڈوگرہ شاہی کے مظالم، سیاسی و سماجی بے راہ روی، معاشی و اقتصادی بدحالی، سرمایہ داری اور جاگیر داری نظام، اُس دَور کی جہالت، پراگندگی بھُوک، افلاس، ظلم و ستم اور ظالم و مظلوم کی مختلف عنوانات و موضوعات کا سہارا لے کر نقاب کُشائی کی ہے۔

اس دَور کے سبھی افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں فن کی نئی قدروں اور نئے رُجحانات کو سموتے وقت انتہائی خلوص اور بے باکی سے کام لیا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی کا "بہتے چراغ"، "شام و سحر" اور قدرت اللہ شہاب کا "سردار جسونت سنگھ"۔ افسانے کے کردار نئی روشنی، نئی قدروں اور نئے رُجحانات کے علم بردار ہیں۔ ٹھاکر پونچھی نے "خانہ بدوش"، "یہ پتھر میرے ہیں"، "بے خواب کواڑ" اور موہن یاور نے "اُڑتے آنچل"، "سیاہ تاج محل"، "تیسری آنکھ" جیسے افسانے لکھ کر جنسی اور نفسیاتی کشمکش کے پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ رامانند ساگر نے "ٹنمرگ کے اڈے پر"، "آئینے"، "آبِ حیات" اور پریم ناتھ در نے "آرخ تھو"، "نیلی آنکھیں"، "کاغذ کا واسدیو" افسانے لکھ کر جہاں تشبیہات، استعارات، اشاریت اور ابہام سے کام لیا ہے وہاں طنز کے نشتر بھی چبھوئے ہیں۔ جہاں تک ان افسانوں کا تعلق ہے، ان میں وارداتِ قلب اور نفسیات کا تحلیلی تجزیہ خلاقانہ ہے۔ طنز و مزاح کے علاوہ استعارات اور تشبیہات کی مدد سے جس شگفتہ بیانی کا مظاہرہ

پرست اور جذباتی فن کار ہیں۔ لیکن ان کے فن میں رومان کے ساتھ ساتھ گہرا اور کاری طنز بھی ہوتا ہے جو زندگی کے حقائق کو چھوتا ہے۔ اس طرح ان کے افسانوں میں حقیقت اور رومان کا امتزاج ملتا ہے؛ پریم ناتھ پردیسی کی ادبی زندگی کا سفر اُس وقت شروع ہوتا ہے جب یہاں کے عوام مُطلق العنانی کی آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے افسانوں میں درد و کرب، حاکمانہ جور و جبر، حرمان و یاس، غربت و افلاس، غلامی، جہالت، سماجی نابرابری، طبقاتی کشمکش، بے کاری اور پریشانی جیسے ہوش رُبا موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔

پریم ناتھ پردیسی ابتدا سے ہی ادب برائے ادب کے نقیب تھے مگر جب پریم چند کی کہانی "کفن" اور "انگارے" کی اشاعت کے ساتھ ہی انجمن ترقی پسند مصنّفین کا باضابطہ قیام بھی عمل میں آیا۔ تو پردیسی کو یہ احساس شدت کے ساتھ ہوا کہ ادب برائے ادب کا نظریہ زندگی کے حقائق کو سمجھنے کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا۔ اسی لئے اُنھوں نے رجعت پسندی، رومانیت، داخلیت، فراریت، اور تصور پرستی کو ترک کر کے ادب کے خارجی اور افادی پہلوؤں پر کافی توجہ دی۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں صدیقہ بیگم سیوہاروی کو لکھا: "...... ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اُس پر میں فخر نہیں کر سکتا...... اس وقت مجھے یہ احساس نہ تھا کہ ایک افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطنِ عزیز کے کیا فرائض ہیں۔[1]"

پریم ناتھ پردیسی کے خط سے ہمیں دو باتوں کا اشارہ ملتا ہے۔ ایک یہ کہ ان کا ادب کے بارے میں کیا نظریہ تھا اور دوسرے جموں و کشمیر میں اُردو افسانہ نگاری کی ابتدا ۱۹۳۱-۳۲ء سے ہوئی ہے۔ آپ جموں و کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک کی بنیاد ڈالنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے مُلک کے سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیا۔ اپنے افسانوں کو رومانی اور داخلی غار سے نکال کر زندگی کے افادی اور خارجی پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ اُن

---

[1] ہمارا ادب ۱۹۶۹ء "مضمون پریم ناتھ پردیسی اور اُس کا تخلیقی ذہن"

ایک جگہ آپ لکھتے ہیں:- "اب آپ کے چراغ نہیں جلیں گے سیٹھ جی -- دُنیا کو امن کی ضرورت ہے!"[1] یہ جملہ امن کے لئے اُن کے دِل میں موجود تڑپ کا اظہار ہے۔

مُلک کی تقسیم کے ساتھ ہی ہماری ریاست بھی بٹ گئی۔ بہت سے افسانہ نگار پاکستان چلے گئے اور کچھ مُلک کے دوسرے حصّوں میں جاکر رہائش پذیر ہوگئے اور کئی افسانہ نگاروں کے تخلیقی سوتے خشک ہوگئے۔ قدرت اللہ شہاب، محمد عمر نورُ الٰہی، کوثر سیمابی، محجوبہ یاسمین، طالب گورگانی، کیف اسرائیلی، گُلزار احمد فدا، عبدالحمید نظامی، اخگر عسکری، شیخ منظور الٰہی، عبدالعزیز علائی اور عزیز کاش ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے جس کی وجہ سے ریاست ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی ایک بہت بڑی ٹولی سے محروم ہوگئی۔ رامانندساگر، کشمیری لال ذاکر، دیا کرشن گردش، جگدیش کنول، کنول نین پرواز، کُندن لال، ٹھاکر پونچھی اور پریم ناتھ در وغیرہ ریاست سے باہر ہندوستان کے مختلف گوشوں میں تلاشِ معاش کی خاطر بکھر گئے اور اپنی تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ پریم ناتھ پردیسی وفات پا گئے۔ ممولا رام کوٹی (نرسنگھ داس نرگس) اور موہن یاور نے صحافت کا کام سنبھالا اور کم وبیش افسانے بھی تخلیق کرتے رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ عرصہ تک یہاں کی ادبی فضا پر جمود وتعطّل کا عالم طاری رہا لیکن رفتہ رفتہ حالات سُدھرے تو یہاں کے ادبی اُفق پر کچھ نئے چہرے اُبھرے جنھوں نے اُردو افسانے کو نئی جہتوں سے رُوشناس کرایا۔ ان میں علی محمد لون، تیج بہادر بھان، پُشکر ناتھ، برج کتیال، حامدی کاشمیری، برج پریمی، غلام رسُول سنتوش، اختر محی الدّین، صوفی غلام محمد، نور شاہ، غ، م جانباز، اُمیش کول، بنسی نردوش، جگدیش بھارتی، مخمور بدخشی، شبنم قیوم، رام کمار ابرول اور وید راہی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنے ادبی زندگی کا آغاز اُردو زبان میں لکھنے سے کیا۔ اور پھر کشمیری یا ڈوگری کی طرف مائل ہو گئے۔ ان میں علی محمد لون، اختر محی الدین، جگدیش بھارتی، بنسی نردوش، اُمیش کول اور غلام رسُول سنتوش کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ جنھوں نے کشمیری میں افسانے تخلیق کئے۔ علی محمد لون نے کشمیری

---

[1] "بہتے چراغ" صفحہ ۲۹۵

کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ جمولا رام کوٹی (نرسنگھ داس نرگس) نے "غریب کی عید"۔ "ہری جن لڑکی"۔ "قانون کے محافظ" افسانوں میں شخصی حکومت، جاگیر دارانہ نظام، اقتصادی بدحالی، سماجی و طبقاتی کش مکش اور دیہاتی ماحول کی عکاسی بدرجہ اتم موجود ہے۔ حسن و عشق کا موضوع اگرچہ پٹا ہوا ہے مگر حکام کی بے دردی اور سرمایہ داروں کی بالادستی کے باوجود ان کے افسانوں میں دیہاتی دوشیزاؤں کی آہیں، ان کا بے لوث پیار، نقرئی قہقہے اور شرمیلی مسکراہٹیں بھی ملتی ہیں۔

مہندر ناتھ، سوم ناتھ زتشی اور کشمیری لال ذاکر نے اپنے افسانوں میں انسانی زندگی، اس کے لوازمات کے ساتھ ساتھ ذہنی پراگندگی اور جنس و نفسیات سے متعلق انتہائی حسین مرقعے پیش کئے ہیں۔

جموں و کشمیر میں افسانہ نگاری کے اس دور میں اور بھی کئی فن کار سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے کنول نین پروانہ، محمود ہاشمی، جگدیش کنول، کندن لال، گنگا دھر بٹ دیہاتی، وجے سومن سوسن اور دیانند کپور نے بھی افسانوی ادب میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ان کے ساتھ ہی محجوبہ یاسمین نے "دل ہی تو ہے"۔ "شیخ منظور الٰہی نے "ایک سال"۔ گلزار احمد فدا نے "آپا کے پاس" عزیز کاشر نے "رجی"۔ محمد عمر نور الٰہی نے "گلوری"۔ شیخ عبدالعزیز علائی نے "سرائے"۔ طالب گورگانی نے "ہاتھی نالہ"۔ عبدالحمید نقشبندی نے "تحفہ" جیسے مختلف عنوانات کے تحت افسانے لکھ کر روزمرہ زندگی، اس کے مسائل، عوام کے جذبات اور اُس وقت کے اہم تقاضوں کو اپنے فن میں برتنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ہماری افسانہ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ اس وقت ہوا جب ۱۹۴۷ء میں آزادی کی صبح طلوع ہوئی۔ جموں و کشمیر کو بھی شخصی حکومت سے نجات ملی۔ مگر ملک کی تقسیم سے ادیبوں کا بھی بٹوارہ ہوگیا۔ احباب و اقارب بچھڑ گئے۔ کئی فرقہ دارانہ فسادات میں مارے گئے۔ کشمیر پر قبائلیوں کا حملہ ہوا۔ سارا شیرازہ بکھر کے رہ گیا۔ کئی خونچکاں داستانیں وجود میں آئیں۔ ادیب اور فن کار یہاں تک متاثر ہوئے کہ پریم ناتھ پردیسی نیشنل ملیشیا National Militia میں بھرتی ہوگئے۔ ان ہی حالات سے متاثر ہوکر "نغمۂ جنگ" اور "بہتے چراغ" جیسے افسانے لکھے،

بامسی": "آس نراس" اور گلوان" ندرتِ خیال   اندازِ بیان اور طرزِ تحریر کے لحاظ سے اعلیٰ فنّی نمونے ہیں۔ ان افسانوں میں حقیقی زندگی، اس کے مسائل، اُن کا عمیق مطالعہ اور احساس و فکر کی مکمل ہم آہنگی ملتی ہے۔"گالی"، "گاڑی" اور "پردہ نشین" افسانوں میں اچھے کردار ملتے ہیں جو جموں و کشمیر کے پروردہ ہیں۔

"نورشاہ کے افسانوں میں شاعرانہ تخیّل طرازیاں سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانے سے لے کر اس وقت تک کے سبھی افسانوں میں یکساں اور ہموار فضا ملتی ہے جس نے ان کے افسانوں کو ایک محدود دائرے میں مُقیّد کر دیا ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کے افسانوں میں "زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ملتی ہیں۔[1]"

"ایک رات کی ملکہ"، "بے گھاٹ کی ناؤ"، "ویرانے کے پھول" اور "من کا آنگن اُداس اُداس" افسانوں میں حقیقی معنوں میں ان ہی زخم خوردہ دلوں کی دھڑکنیں ہیں۔ انداز شگفتہ، مگر بے ساختہ نہیں۔ ابتدائی افسانوں میں مُشاہدے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ "سوکھی ندی کا گیت"، "لمحے اور زنجیریں"، "پتھر اور انسان"۔ افسانوں میں زندگی کے انفرادی اور خارجی پہلوؤں کو اُجاگر کرکے تلخ اور حسین لمحات کو ایک ہی لڑی میں پرویا ہے۔

محمور بدخشی کے افسانوں میں بقولِ ڈاکٹر محی الدّین زورؔ "ان کی گفتگو اور اندازِ طبیعت کے خلاف ان کے افسانوں میں مُسکراہٹیں کم اور طنز کاری زیادہ ہے۔ انھوں نے ہنستے چہروں سے زیادہ افسُردہ دلوں کو پیش کیا ہے اور ہوس کاروں اور مکّاروں پر بھرپور طنز کرنے کی کوشش کی ہے۔[2]" لیکن "نیل کنول مُسکائے"، "عبداللہ دیوانہ"، "یہ خلش کہاں سے ہوتی" اور "ہار جیت" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں اوّل مُشاہدے کی کمی محسوس ہوتی ہے، دوم وہ کشمیری محاورات کا براہِ راست لفظی ترجمہ کرجاتے ہیں جس کی وجہ سے کہانی کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

---

[1] "شاعر" ناولٹ نمبر ۱۹۷۱ء تعارف نورشاہ   [2] شیرازہ ۱۹۶۰ء زور نمبر ص ۱۶۱

میں لکھا اور اپنے لئے ایک خاص مقام بنالیا۔ لیکن انھوں نے اُردو کے ادبی سرمایے میں کمی بہت سے اضافے کئے ہیں۔ انھوں نے "مونچھوں والی گڑیا"، "سُکھ کا ساحل"، "پاپی پجاری کی سنتان" اور "بُت شکن" جیسے کئی ڈرامائی انداز کے افسانے لکھے۔ اختر محی الدّین نے "لونڈ رچ" لکھ کر اُردو افسانہ کے ایک مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ اسی طرح انھوں نے "پیوند" اور "رات مرگئی" اور "اہیرن" جیسے عمدہ افسانے لکھے۔ غلام رسول سنتوش، جو کہ بُنیادی طور پر ایک مصوّر ہیں انھوں نے "خزاں کی خوشبو"، "ایک موت، ایک مُسکراہٹ"، "یہ قربتیں، یہ دُوریاں" اور "ڈل کے باسی" نامی افسانوں میں مُصوّرانہ جدّت پیدا کی ہے۔ رام کُمار ابرول اور وید راہی نے ڈوگری ادب کو اپنا اُوڑھنا بچھونا بنا دیا۔ اس دَور کے افسانہ نگاروں میں سے حامدی کاشمیری، نور شاہ، تیج بہادر بھان، پُشکر ناتھ اور برج پریمی نے اچھا لکھا۔ برج کتیال، شبنم قیوم، اور محمود بدخشی نے درمیانہ روِش اختیار کی۔ رغ، م، جانباز اور صوفی غلام محمد نے بہت کم لکھا۔

حامدی کاشمیری کے ابتدائی افسانوں پر معاشرتی اور اصلاحی رنگ غالب ہے مگر بعد کے افسانوں میں جدیدیت کی بُو باس ملتی ہے۔ "سراب"، "سُندری"، "وادی کے پھُول"، "برف میں آگ" اور "آگ ہے اور دھواں نہیں" افسانوں میں جہاں شعری پیکر تراشیاں ہیں وہاں مُشاہدے کی باریکی اور غور و فکر کی گہرائی کے ساتھ جنس کا شدید احساس بھی ملتا ہے اور حسن و عشق کی حقیقی داستانیں بھی۔ ان افسانوں میں فن کی اہمیّت، کشمیری کلچر اور عوام کی نفسیاتی زندگی کی تہہ در تہہ کڑیاں یک جا ملتی ہیں۔

تیج بہادر بھان کا افسانہ "جہلم کے سینے پر" اپنے جلو میں کشمیر کا مخصوص ماحول لئے ہوئے ہے۔ "عورت"، "جوتے" اور "سہارا" افسانوں کے ذریعے انھوں نے جمّوں و کشمیر کے عوام کے دِلوں کی ہو بہو ترجمانی کی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، جن کو عوامی زندگی کا عمیق مشاہدہ ہے۔ ان کے افسانوں پر کشمیری زبان کے لب و لہجہ اور محاوروں کا کافی اثر ہے ــــ پُشکر ناتھ حقیقت نگار ہیں۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں حقیقت اور تخیل کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے۔ وہ بدلتی فضاؤں کے ترجمان ہیں۔ "اندھیرے اُجالے"، "ڈل کے

ہے۔ اس کے بعد نوجوان افسانہ نگاروں کا ایک بہت بڑا قافلہ رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔
ان میں مالک رام آنند، او، پی شرما سارتھی، وجے سوری، گیان چند شرما، سوم ناتھ ڈوگرہ،
ہردے کول بھارتی، یش سروج، کلدیپ رعنا، ڈی، کے کنول، امر مالموہی، ہری کرشن کول،
راجیش گوہر، گھنشیام سیٹھی، ساگر کاشمیری، ریاض پنجابی، ڈاکٹر ظہور الدین، موتی لال کیور، عمر مجید،
عبدالغنی شیخ (لداخی) نعیم اختر، شمس الدین شمیم، کشوری منچندہ، اجیت کمار بخشی اور
حسن ساہو کے نام خصوصی طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان میں سے بھی بہت
سے افسانہ نگاروں نے کشمیری اور ڈوگری میں لکھا اور بہت سے اُردو میں لکھتے رہے۔ جب ہم
ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ موضوعات
متنوّع ہوتے ہوئے جمہوریت، سوشلزم، مارکس ازم، جدیدیت، طبقاتی کش مکش، ہند چین اور
ہند و پاک کی جنگیں، عرب اسرائیل اور ویت نام و قبرص کے مظلوموں کی آہ و فغاں
کے مشترک احساسات ملتے ہیں۔ ان میں موجودہ سائنسی، سماجی، سیاسی اور تکنیکی دور کے انسان
کا درد و کرب بھی موجود ہے۔ خلائی کھوج اور تسخیر قمر نے ادب میں نئی فضاؤں کا سماں باندھ
دیا ہے۔ مشینی دور نے ادب میں انسانی زندگی کی پراگندہ مزاجی اور نفسا نفسی کو شدید تر
کر دیا۔ ان افسانوں میں ایک طرف سماج کے رِستے ہوئے ناسوروں کا ذکر ہے تو دوسری طرف
انسان کی کس مپرسی اور تنہائی کا گہرا احساس ملتا ہے۔
چنانچہ مالک رام آنند کے "دہکتے پھول"، "شبنم آنکھیں"، "اپنے وطن میں اجنبی"، "پائلٹ"
"سرخ برف"، "زرد پتے"، یش سروج کے "زمین پیاسی ہے"، "خون کا قرض"، سوم ناتھ ڈوگرہ کے
"دو آنسو"، "دو خط"، "ایک کہانی"، "میرے ارمان"، "میرے سپنے"، امر مالموہی کے "موت کی آرزو"
"سحر ہونے تک"، "انگارے"، کشوری منچندہ کے "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبّت کے سوا"،
"سڑک انصاف کرتی ہے"، "بھوک"، "الیکشن"، وجے سوری کے "زندہ لاش"، "خدا اور انسان"،
او، پی شرما سارتھی کے "درد"، "مجرم کون؟"، "اپنے وطن سے اپنے وطن میں" اور گیان چند

برج کتیال، شبنم قیوم اور برج پریمی نئی فضا اور نئے رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ تخیلی تانے بانے کم اور حقیقت پسندانہ عناصر بہت زیادہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں روزمرہ زندگی کے چٹخارے اور عام ماحول کی تصویر کشی کے علاوہ طنز کا عنصر بھی وافر ملتا ہے۔ اسی طرح سے برج کتیال کے "موت کے راہی"، شبنم قیوم کے "دیوی دیوتا"، "دُکھتی آنکھیں" اور "پانی کا دُھواں" برج پریمی کے "یادوں کی خوشبو" اور "سپنوں کی شام" افسانوں میں بیسویں صدی کے مشینی دَور کے انسان کا کرب ملتا ہے۔

جموّں وکشمیر میں اُردو افسانوی ادب کے لئے یہ دور نشاۃ ثانیہ سے کم نہیں۔ اس دَور میں جہاں نئے لکھنے والے سامنے آئے وہاں کہنہ مشق ادیب مثلاً ٹھاکر پونچھی، پریم ناتھ در، دیناناتھ رینہ، ماسٹر ساگر، کشمیری لال ذاکر اور موہن یاور بدستور لکھتے ہیں۔ اسی دَور میں متعدد اخبارات اور رسائل شائع ہونے لگے۔ ریڈیو اسٹیشنوں کا قیام عمل میں آیا۔ آزادی کے بعد عام تعلیم کی برکات سے ہر شخص کو ترقی کے یکساں مواقع بہم ہوئے۔ اسی طرح کلچرل اکادمی کا قیام بھی یہاں کی صحافت وثقافت کی تحریک کے لئے فالِ نیک ثابت ہوا جس سے ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور انھیں مالی معاونت دی جانے لگی۔ کتابیں چھپنے لگیں اور زبان وادب کو کافی وُسعت ملی۔

اس دَور میں جموّں وکشمیر کے نئے لکھنے والوں نے ایک طرف مُلک گیر پیمانے پر اُردو ادیبوں کے مسلک کی پیروی کی اور یہاں کے معاشی وسماجی پہلوؤں پر بھی نگاہ رکھی۔ دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر مُروّج رجحانات مثلاً مارکس کے معاشی اور فرائڈ کے جنسی خیالات کا اثر بھی قبول کیا اور اس طرح سے مارکسزم اور تحلیل نفسی کے ساتھ ساتھ وجودیت، اشاریت، اظہاریت، تاثریت، جمالیات، شعور کی رَو، جیسے جدید نظریات سے متاثر ہو کر افسانے تخلیق کرنے کی کوشش کی۔

اُردو افسانے کا دوسرا دَور لگ بھگ ۱۹۵۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۶۰ء میں ختم ہو جاتا

کتابیات

نوائے آزادی	عبدالرزاق قریشی	ادبی پبلشرس شعبۂ اشاعتِ اسلام بمبئی
جموں و کشمیر کا تمدنی احیائے نو	فرحت گیلانی	پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند
تاریخ ڈوگرہ دیس	نرسنگھ داس نرگس	مکتبۂ چاند جموں
دُکھیا دیس	״	״
پردیسی پریتم	״	״
جواہر لال نہرو اور کشمیر	نانک چند ناز	یونین پبلشرس پربھات نگر، جالندھر
توی اور جہلم	موہن یاور	ڈی، کے سہگل شاردا کارنر ریزیڈنسی روڈ جموں
رائٹرس سیمینار	نیلامبر دیو شرما، نریندر کھجوریہ	جموں و کشمیر کلچرل اکاڈمی
عمریں	او، پی شرما سارتھی	روشن راہی، جین بازار جموں
دو خط ایک کہانی	ایس، این ڈوگرہ	چاند پریس گمٹ بازار جموں
آخری سودا	وِجے سُوری	سُوری بک ڈپو، پکّہ ڈنگہ جموں
اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا	کشوری منچندہ	جموں پرنٹنگ پریس جموں
سڑک انصاف کرتی ہے	״	״
زمین پیاسی ہے	یش سروج	ادبی پبلی کیشنز جموں
بہتے چراغ	پریم ناتھ پردیسی	مکتبۂ لالہ رخ سرینگر
سیاہ تاج محل	موہن یاور	گلدیپ بک سنٹر پکّہ ڈنگہ جموں
اندھیرے اُجالے	پُشکر ناتھ	״
جانے وہ کیسے لوگ تھے!	مالک رام آنند	انٹرنیشنل اکیڈمی آف رائٹرس
موت کے راہی	برج کتیال	شانتی کتاب گھر بمبئی ۱۴

شرما کے "بنجر دھرتی پیاسے لوگ"۔ افسانوں میں نہ صرف یہ کہ سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی اُلجھنیں ہیں بلکہ حقیقت و رومان کا ایک دل نشین سنگم بھی ہے۔ ان کے افسانوں سے دُکھ، درد، غم، پریشانی، ناچتی کی لنخیاں، حال کی کش مکش اور مستقبل کی مایوسی جھلکتی ہے؛ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں حال کی تاریکیوں کو پھاندنے اور مستقبل کے اُجالوں کی نشان دہی بہت کم ہے۔

ادبی اُفق پر پھیلتے ہوئے جدید میلانات اور رُجحانات نے یہاں کے افسانہ نگاروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور انھوں نے ان سے متاثر ہو کر خوبصورت افسانے تخلیق کئے۔ ان میں کلدیپ رعنا کا "ایک خط، ایک گیت"، "زندگی"۔ ہری کرشن کول کا "کُتّے کی دُم"۔ راجیش گوہر کا "سہاگ بنا رہے"۔ گھنشیام سیٹھی کا "ایک شام"۔ اجیت کمار بخشی کا "اُس کا اور میرا سچ"۔ "شرمیلا"۔ ڈاکٹر ظہور الدین کا "نجات"۔ "دُرِ شہوار"۔ ساگر کاشمیری کا "زلزلہ"۔ ریاض پنجابی کا "لمحوں کی صلیب"۔ موتی لال کپور کا "برج کے باسی"۔ عمر مجید کا "پرچھائیاں"۔ نعیم اختر کا "بہار آئی چمن میں مگر خزاں کی طرح"۔ عبدالغنی شیخ (لداخی) کا "لو سرا اور آنسو"۔ "مسکراہٹ" شمس الدین شمیم کا "ویرانے اور اُنگلیاں"۔ حسن ساہو کا "پھولوں کا ماتم" اور جوتیشور پتھک کے کچھ افسانوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ادب اور فن کو جدیدیت کے ساتھ ہم آہنگ کیا اور فنِ افسانہ کے لئے نئی راہیں متعین کیں۔

ریاست میں اُردو افسانے کے مستقبل کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ایک نئی پود اُبھر رہی ہے۔ ان میں ایس، ایم قمر، راجہ نذر بونیاری، م۔م۔ صدیق، ایم نسائی، غمگین غلام نبی، بشیر دادا، وحشی سعید ساحل، عبدالرحمٰن بہزاد، مسعود ساموں، شیام سُندر آنند لہر اور ایوب شبنم وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ فن کار ریاست میں اردو افسانہ نگاری کے خوش آئند مستقبل کی علامت ہیں۔

تلاش

تیج بہادر

سورج طلوع ہو رہا تھا اور کرنیں چھوٹے سے درّے میں کھیل رہی تھیں۔ کرنیں پھیل رہی تھیں، اور مغرب کی طرف پیٹھ کئے پہاڑ بے نقاب ہو رہا تھا۔ گھنا جنگل، جو اب تک رات کی کالی چادر میں لپٹا پڑا تھا، واضح ہونے لگا۔ سیاہ لمبی لکیریں، سیاہ چھوٹی لکیریں، بدھلو، کیل اور دیودار کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ دھوپ پھیلتی گئی اور دھند کے برفیلے مرغولوں کو چھیڑنے لگی۔ دھند کا مہین آنچل درخت کی چوٹیوں میں پھنس سا گیا تھا۔

دھوپ تیز ہوتی گئی اور سائے واضح ہونے لگے۔ کہیں ہلکا ہرا رنگ، کہیں گہرا ہرا رنگ، دلوں میں ہریالی بھرنے کے لئے کافی تھا۔ ٹھنڈی ہوا بے قرار سی ہو گئی اور پیڑ پودے رات کی لمبی خاموشی سے اکتا کر سرسرانے لگے۔

دھوپ پہاڑ کے دامن تک پہنچ گئی۔ پہاڑ کے دامن میں بہتی چنچل ندی تک پہنچ گئی اور ندی

رسائل و جرائد

"شیرازہ ثقافت نمبر	سیکریٹری کلچرل اکاڈمی
شیرازہ" دوماہی جنوری ۱۹۶۴ء تا نومبر ۱۹۶۴ء	"
"شیرازہ" ستمبر ۱۹۶۲ء	"
"شیرازہ" زور نمبر ۱۹۶۳ء	"
"شیرازہ" جولائی ۱۹۶۳ء - نومبر ۱۹۶۳ء	"
ہمارا ادب ۱۹۵۹ء تا ۷۵ء	"

متفرقات

ویرانے اور انگلیاں	شمس الدین شمیم
زوجیلا کے آر پار	عبدالغنی شیخ لداخی
آئینے	رامانند ساگر
زعفران زار	آمر مالوہی

تیج بہادُر

سورج طلوع ہو رہا تھا اور کرنیں چھوٹے سے درّے میں کھیل رہی تھیں۔ کرنیں پھیل رہی تھیں، اور مغرب کی طرف پیٹھ کیے پہاڑ بے نقاب ہو رہا تھا۔ گھنا جنگل، جو اب تک رات کی کالی چادر میں لپٹا پڑا تھا، واضح ہونے لگا۔ سیاہ لمبی لکیریں، سیاہ چھوٹی لکیریں، بُدھلو، کپل اور دیودارؤں کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ دُھوپ پھیلتی گئی اور دُھند کے برفیلے مرغولوں کو چھیڑنے لگی۔ دُھند کا مہین آنچل درخت کی چوٹیوں میں پھنس سا گیا تھا۔

دُھوپ تیز ہوتی گئی اور سایے واضح ہونے لگے۔ کہیں ہلکا ہرا رنگ، کہیں گہرا ہرا رنگ، دلوں میں ہریالی بھرنے کے لئے کافی تھا۔ ٹھنڈی ہوا بے قرار سی ہو گئی اور پیڑ پودے رات کی لمبی خاموشی سے اُکتا کر سرسرانے لگے۔

دُھوپ پہاڑ کے دامن تک پہنچ گئی۔ پہاڑ کے دامن میں بہتی چنچل ندی تک پہنچ گئی اور ندّی

رسائل و جرائد

"شیرازہ" ثقافت نمبر	سیکرٹری کلچرل اکاڈمی
شیرازہ" دوماہی جنوری ۶۴ء تا نومبر ۱۹۶۴ء	"
"شیرازہ" ستمبر ۱۹۶۲ء	"
"شیرازہ" نومبر ۱۹۶۳ء	"
"شیرازہ" جولائی ۱۹۶۳ء - نومبر ۱۹۶۳ء	"
ہمارا ادب ۱۹۵۹ء تا ۷۵ء	"

متفرقات

ویرانے اور انگلیاں	شمس الدین شمیم
زوجیلا کے آرپار	عبدالغنی شیخ لداخی
آئینے	رامانند ساگر
زعفران زار	آمر مالوہی

بھینس کو تھپ تھپا کر وہ باڑے کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ اور بھیڑ بکریوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے لگا۔ بھیڑ بکریاں احتجاج کرنے پر مجبور ہو کر ممیانے لگیں۔ پر وہ اُن کی ناراضگی سے بے نیاز اُن کو اِدھر اُدھر دھکیلنے میں مصروف رہا۔ واقعی اُس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ ایک بھیڑ کم تھا، اور وہ بھی "کالیا"۔ جو سارے ریوڑ میں اپنے موٹے کالے سینگوں کی وجہ سے ایک دم پہچانا جاتا تھا۔ اُس نے سارے احاطے پر ایک اور نظر ڈالی۔ شاید کوٹھے کی دوسری طرف ہو۔ پر کوٹھے کی دوسری طرف نوکیلی چٹانوں میں بھی کالیا کا کوئی نشان نہ ملا۔

"سالا ... روز تنگ کرتا ہے۔ آج ملے تو پھر کس نکال دوں گا۔" مکھنا بڑبڑاتے ہوئے واپس لوٹ پڑا۔

صبح سویرے سورج نکلتے ہی مکھنا بھینس کو کھول دیتا تھا۔ لیکن آج تو اَن ہونی سی بات ہو رہی تھی۔ مکھنا بھینس کو کھولنے کی بجائے ندی کی اور بڑھ گیا۔ بھینس نے رسّی کو جھٹکا بھی دیا۔ ایک دوبار "اُماؤ" بھی کیا۔ پر مکھنا کوئی دھیان دیئے بغیر ندی میں بکھرے گول مٹول پتھروں کے سہارے ندی کو پھلانگ گیا۔ اور سامنے گھنے جنگل میں گُم ہو گیا۔

جنگل میں تاریکی تھی۔ کہیں کہیں سورج کی اِکی دُکی کرن پتّوں سے چھن چھن کر زمین پر اُجلے چمکیلے پھول بکھیر رہی تھی اور مکھنا ان پھولوں کو مسلتا روندھتا بڑھتا جا رہا تھا۔ بظاہر اُس کی نگاہیں زمین پر چپکی پڑی تھیں۔ لیکن آنکھ کے گوشوں سے اِرد گِرد کا سارا جنگل اُس پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ زمین پر ان گنت گڑھوں کے نشان، کہیں کہیں پھسلن کی ہلکی لکیر، اُسے جنگل کی خطرناک زندگی کا پتہ دے رہے تھے۔ اُس کے حواسِ خمسہ ہر آواز کو سُنتے، پرکھتے۔ لیکن جس نشان کی اُسے تلاش تھی وہ کہیں نہ تھا۔ کالیا کے کھُر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

بھیڑ کھو بھی جاتے ہیں۔ جنگلی جانوروں کے ہتھے بھی چڑھ جاتے ہیں۔ اور ہر سال مکھنا کے چند بھیڑ بھی جنگل کی نذر ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی پریشان ہونے کی

سے ذرا اُدھر، لکھنا کے کوٹھے پر چھا گئی۔ ایک کرن چمنی کی راہ سے ہوتی ہوئی لکھنا کے چہرے پر گرمی کا احساس پیدا کرنے لگی اور لکھنا جاگ پڑا۔ اُس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اندھیرے کوٹھے کا جائزہ لیا۔ کرن کی نحیف و کمزور روشنی میں وہ صرف ہلکے سایے سے دیکھ سکا۔ مٹی کے کچھ برتن، الگنی میں لٹکا دُودھ سے بھرا گھڑا، مکھن بنانے کی مدھانی اور ادھ جلی لکڑیوں کے بکھرے ٹکڑے بھی۔ ... ! چہرے پر جھنجھلاہٹ سی نمودار ہوئی جیسے وہ کچھ دیر اور سونا چاہتا ہو! کل بھی وہ رات گئے جنگل سے لوٹ آیا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں شمعی کی راہ تکتے تکتے۔ شمعی کا خیال آتے ہی اُس کو کچھ یاد آیا۔ ہاتھ کھُردرے اُون کی بھوری واسکٹ کا جیب ٹٹولنے لگے۔ اور واسکٹ کی جیب سے آتی کھنکھناہٹ کی آواز نے اُس کی جھنجھلاہٹ دُور کر دی۔ چہرے پر مُسکراہٹ کی دُھوپ پھیل گئی۔ جھٹکے سے بکری کی کھال کو دُور پھینک کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہڈیاں چٹخانے والی انگڑائی لی۔ پھرتی کی لہر اُس کے انگ انگ میں دوڑ گئی۔ اور وہ سرہانے ٹِکا کلہاڑا اُٹھا کر باہر نکل آیا۔

حسبِ معمول اُس کی نگاہیں دیوار سے بندھی بھینس پر آ جمی۔ کالی بھینس کی نیلی آنکھیں چم چم چمک رہی تھیں۔ اُس کو دیکھ کر کالی بھینس کی نیلی نگاہیں اور نیلی پڑ گئیں۔ وہ آگے بڑھا۔ بھینس کے گلے میں باہنیں ڈال دیں اور بھینس کے لمبے لمبے کانوں میں کچھ کھُسر پھُسر کرنے لگا۔ بھینس نے گردن موڑ کر غرور سے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرف دیکھا۔ بھیڑ بکریوں کا ریوڑ، باڑے میں جکڑا ہوا تھا۔ لکھنا کی جھپکتی آنکھیں ریوڑ کا جائزہ لینے لگیں۔ کچھ دِنوں سے اُسے روز بھیڑ بکریوں کو گننے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ سردیاں سر پر آ رہی تھیں۔ اور وہ سردیوں سے پہلے پہلے زیادہ سے زیادہ بھیڑ بکریاں فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اب اُس سے اس کوٹھے میں اکیلے نہیں رہا جاتا تھا۔ خود کھانا پکاتے پکاتے، دُودھ دوہتے دوہتے، مکھن بلوتے بلوتے وہ اب بالکل اُکتا گیا تھا۔

دفعتاً وہ ٹھٹھک گیا۔ اُس نے ریوڑ کا نئے سرے سے جائزہ لیا۔ ریوڑ میں کچھ کمی ضرور تھی!

بھینس کو تھپ تھپا کر وہ باڑے کے احاطے میں داخل ہوگیا۔ اور بھیڑ بکریوں کو ایک دوسرے سے

الگ کرنے لگا۔ بھیڑ بکریاں احتجاج کرنے پر مجبور ہو کر ممیانے لگیں۔ پر وہ اُن کی ناراضگی سے

بے نیاز اُن کو اِدھر اُدھر دھکیلنے میں مصروف رہا۔ واقعی اُس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ ایک

بھیڑ کم تھا، اور وہ بھی "کالیا"۔ جو سارے ریوڑ میں اپنے موٹے کالے سینگوں کی وجہ سے ایک دم

پہچانا جاتا تھا۔ اُس نے سارے احاطے پر ایک اور نظر ڈالی۔ شاید کوٹھے کی دوسری طرف ہو۔ پر

کوٹھے کی دوسری طرف نوکیلی چٹانوں میں بھی کالیا کا کوئی نشان نہ ملا۔

"سالا ... روز تنگ کرتا ہے۔ آج ملے تو بھرکس نکال دوں گا۔" مکھنا بڑبڑاتے

ہوئے واپس لوٹ پڑا۔

صُبح سویرے سُورج نکلتے ہی مکھنا بھینس کو کھول دیتا تھا۔ لیکن آج تو اَن ہونی سی

بات ہو رہی تھی۔ مکھنا بھینس کو کھولنے کی بجائے ندّی کی اور بڑھ گیا۔ بھینس نے رسّی کو جھٹکا

بھی دیا۔ ایک دو بار "اُماؤ" بھی کیا۔ پر مکھنا کوئی دھیان دیئے بغیر ندّی میں بکھرے گول

مٹول پتھروں کے سہارے ندّی کو پھلانگ گیا۔ اور سامنے گھنے جنگل میں گُم ہوگیا۔

جنگل میں تاریکی تھی۔ کہیں کہیں سُورج کی اِکی دُکی کرن پتّوں سے چھن چھن کر زمین

پر اُجلے چمکیلے پھُول بکھیر رہی تھی اور مکھنا ان پھُولوں کو مسلتا روندھتا بڑھتا جا رہا تھا،

بظاہر اُس کی نگاہیں زمین پر چپکی پڑی تھیں۔ لیکن آنکھ کے گوشوں سے اِرد گرد کا سارا

جنگل اُس پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ زمین پر اَن گنت گڑھوں کے نشان، کہیں

کہیں پھسلن کی ہلکی لکیر، اُسے جنگل کی خطرناک زندگی کا پتہ دے رہے تھے۔ اُس کے حواسِ

خمسہ ہر آواز کو سُنتے، پرکھتے۔ لیکن جس نشان کی اُسے تلاش تھی وہ کہیں نہ تھا۔ کالیا کے

کھُر کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

بھیڑ کھو بھی جاتے ہیں۔ جنگلی جانوروں کے ہتھے بھی چڑھ جاتے ہیں۔ اور ہر سال مکھنا کے

چند بھیڑ بھی جنگل کی نذر ہو جایا کرتی تھیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی پریشان ہونے کی

سے ذرا اُدھر، لکھنا کے کوٹھے پر چھا گئی۔ ایک کرن چمنی کی راہ سے ہوتی ہوئی لکھنا کے چہرے پر گرمی کا احساس پیدا کرنے لگی اور لکھنا جاگ پڑا۔ اُس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اندھیرے کوٹھے کا جائزہ لیا۔ کرن کی خفیف و کمزور روشنی میں وہ صرف ہلکے سایے سے دیکھ سکا۔ مٹی کے کچھ برتن، الگنی میں لٹکا دُودھ سے بھرا گھڑا، مکھن بنانے کی متھانی اور ادھ جلی لکڑیوں کے بکھرے ٹکڑے بھی۔ . . . ! چہرے پر جھنجھلاہٹ سی نمودار ہوئی جیسے وہ کچھ دیر اور سونا چاہتا ہو! کل بھی وہ رات گئے جنگل سے لوٹ آیا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں شمعی کی راہ تکتے تکتے۔ شمعی کا خیال آتے ہی اُس کو کچھ یاد آیا۔ ہاتھ کھردرے اُون کی بھوری واسکٹ کا جیب ٹٹولنے لگے۔ اور واسکٹ کی جیب سے آتی کھنکھناہٹ کی آواز نے اُس کی جھنجھلاہٹ دُور کردی۔ چہرے پر مُسکراہٹ کی دُھوپ پھیل گئی۔ جھٹکے سے بکری کی کھال کو دُور پھینک کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہڈیاں چٹخانے والی انگڑائی لی۔ پھرتی کی لہر اُس کے انگ انگ میں دوڑ گئی۔ اور وہ سرہانے ٹکا کلہاڑا اُٹھا کر باہر نکل آیا۔

حسبِ معمول اُس کی نگاہیں دیوار سے بندھی بھینس پر آجمی۔ کالی بھینس کی نیلی آنکھیں چم چم چمک رہی تھیں۔ اُس کو دیکھ کر کالی بھینس کی نیلی نگاہیں اور نیلی پڑ گئیں۔ وہ آگے بڑھا۔ بھینس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بھینس کے لمبے لمبے کانوں میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔ بھینس نے گردن موڑ کر غرور سے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرف دیکھا۔ بھیڑ بکریوں کا ریوڑ، باڑے میں جکڑا ہوا تھا۔ لکھنا کی جھپکتی آنکھیں ریوڑ کا جائزہ لینے لگیں۔ کچھ دِنوں سے اُسے روز بھیڑ بکریوں کو گِننے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ سردیاں سر پر آرہی تھیں۔ اور وہ سردیوں سے پہلے پہلے زیادہ سے زیادہ بھیڑ بکریاں فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اب اُس سے اس کوٹھے میں اکیلے نہیں رہا جاتا تھا۔ خود کھانا پکاتے پکاتے، دُودھ دوہتے دوہتے، مکھن بلوتے بلوتے وہ اب بالکل اُکتا گیا تھا۔

دفعتاً وہ ٹھٹھک گیا۔ اُس نے ریوڑ کا نئے سرے سے جائزہ لیا۔ ریوڑ میں کچھ کمی ضرور تھی!

لیکن کھلے جنگل میں رہنا خطرناک تھا۔ اس لئے طوہاً و کرہاً وہ رات کوٹھے پر بسر

کرتا۔ پر نیند سے جاگتے ہی وہ ریوڑ کو لے کر نیلی چٹان کی راہ لیتا تھا۔ جہاں وہ اپنی تنہائی کو

جنگل کی وسعتوں میں گم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ریوڑ گھاس چرتے چرتے ڈھلان کے اِدھر اُدھر

پھیل جاتا تھا۔ اور وہ نیلی چٹان کے سپاٹ سینے پر لیٹا اپنی نگاہیں نیچے بہت نیچے گھاٹی پر مرکوز

کرتا۔ پہاڑوں کے بیچ بہتی ندی کی دودھیا لکیر بے حس و حرکت نظر آتی۔ ندی کی گونج گرج نیلی

چٹان تک پہنچتے پہنچتے پُراسرار سرسراہٹ میں تبدیل ہو جاتی تھی اور اُسے محسوس ہوتا جیسے ان بے

ہنگم پہاڑوں اور جنگلوں کی رُوح اُسے لوری سُنا رہی ہو۔ وہ گھنٹوں درّے پر نظریں جمائے رہتا

گھاٹیوں اور ٹیلوں کو ٹٹولتا پھرتا۔ اندھیری دراڑوں اور روشن درازوں کو کھوجتا، پرکھتا۔ درّے

کے اُس طرف سامنے والے پہاڑ کی دُم تھی۔ دُم کے بعد جنگل، جنگل کے بعد پھر پہاڑ... پھر جنگل..

... اور یہ سارا سلسلہ اُفق کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا تھا۔ اُچھلتی کھیلتی ندی کے متوازی ایک

مُردہ سی پگڈنڈی تھی۔ دفعتاً پگڈنڈی پر کوئی اُبھرتا نقطہ اُس کے سُن ذہن کو جھنجھوڑ دیتا۔ وہ

نُقطے کو جانچتا پرکھتا۔ یہ ہلتا نقطہ آدمی بھی ہو سکتا تھا یا کوئی جنگلی جانور۔ ریچھ تو اس جنگل

میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ پر کہیں نقطہ ان دو میں سے کچھ نہ ہو بلکہ کوئی بھینس ہو،

اُس کی اُلجھن خواہ مخواہ بڑھ جاتی۔ وہ غور کرتا۔ بڑھتے نقطے کو جانچتا، پرکھتا، رائے بدلتا، حتےٰ

کہ نقطے کے خد و خال پہچان کی حدود میں آ کر واضح ہو جاتے تھے۔ اور جو کہیں اُس کا اندازہ صحیح

ثابت ہوتا تھا تو اُسے بے حد خوشی محسوس ہوتی تھی۔ جنگلوں کی رُوح شاید ان ہی چھوٹی چھوٹی

باتوں میں اُلجھی رہتی ہے!

نیلی چٹان کے پاس پہنچ کر اُس نے ایک دراڑ میں ہاتھ ڈال دیا۔ راکھ کو کُرید کر اُس نے بھُنے

بھُٹے نکال لئے۔ رات کو اُس نے یہ بھُٹے بھُون کے رکھ دیئے تھے۔ شمعی نے کہا تھا کہ وہ دُودھ لے کر

آئے گی اور دونوں بھُٹے اور دُودھ کھائیں گے۔ لیکن وہ کوئی بھُٹا نہ کھا سکا تھا۔ آنکھیں پتھرا گئی

جنگل کا قانون تھا توازن برقرار رکھنے کا۔ مکھنا کو جنگل پالتا تھا اور جنگل کے درندوں کو بھی جنگل پالتا تھا۔ لیکن کالیا کا کھو جانا مکھنا کے لئے چھوٹی بات نہ تھی۔ شاید کالیا کے جسم پر کالے گچھے دار بالوں کی چمک میں غیر معمولی کشش تھی! یا اُس کے ٹیڑھے موٹے سینگوں میں یہ راز پنہاں تھا۔ کالیا کا اکڑ اکڑ کے چلنا، اور بھیڑ بکریوں سے ٹکر لینا، جنگل کی چھپی قوتوں سے نہ گھبرانا، بُلانے پر بھی پاس نہ آنا ... ... شاید یہی وجہ تھی کہ مکھنا کو کالیا سے پیار کی حد تک اُنس تھا۔ کالیا کے جسم میں اُس کو اپنی خودسری پنہاں محسوس ہوتی۔ بار ہا مکھنا کو محسوس ہُوا تھا کہ اُس کی زندگی پہاڑ کے دامن میں بہتی چنچل ندی کے عین مُشابہ ہے۔ جس کا ایک کنارہ کالیا ہے اور دوسرا کنارہ شمعی۔ شمعی بوڑھی چمپئی کی یتیم پوتی تھی۔

سامنے نیلی چٹان، ڈھلان پر بے حجابانہ آدھا دھڑ نکالے سارے درّے پر چھا سی گئی تھی۔ نیلی چٹان بالکل نیلی نہ تھی۔ بھورے اور کالے رنگ کی کئی رگیں اُس پر ایسے پھیل گئی تھیں جیسے جنگل کی بُڑھیا پر وقت نے جھُریاں پھیلا دی ہوں۔ مکھنا کے قدم غیرارادی طور پر راستہ چھوڑ کر نیلی چٹان کی طرف بڑھے۔ نیلی چٹان کے ساتھ اُس کی کئی ایسی یادیں وابستہ تھیں جن سے گُریز کرنا ناممکن تھا۔ حتےٰ کہ وہ کالیا کی کھوج کو بھی کچھ دیر کے لئے ذہن سے مِٹانے پر مجبور تھا۔

بچپن، جوانی کی حدود کو چھو ہی رہا تھا کہ جنگل نے اُس کی ماں کو نِگل لیا۔ کیا معلوم کون گھاٹی اُس کو کھا گئی! باپ تو اُس کے پیدا ہوتے ہی جنگل کا ہو چُکا تھا۔ پر اُسے ماں کے کھونے کا اتنا دُکھ نہ ہوا تھا جتنا اپنی تنہائی پر۔ جنگل کے باسی مرنے سے نہیں گھبراتے۔ لیکن تنہا جنگل کی قوتوں سے برسرِپیکار ہونا، بھیانک خاموشی سے دوچار رہنا، بوکھلانے کے لئے کافی تھا۔ کوٹھے پر خاموشی کا طوفان سا پھوٹ پڑا تھا، ماں کے کھونے کے بعد، اب نہ کسی کونے سے ڈانٹ پھٹکار کی آواز آتی تھی نہ کوئی لاڈ پیار کی آواز۔ اُس کو کوٹھے میں وحشت سی ہو جاتی تھی۔ اُس کا بس چلتا تو راتوں کو بھی جنگل میں بسر کرتا۔ کم از کم درختوں کی سائیں سائیں، جنگلی جانوروں کی دھاڑ تو زندہ تھی جنگل میں ــــ

وہ مکھنا کے غصّے کو نظر انداز کر کے بول پڑی۔ "دودھ لے آئی ہوں۔ بھٹے کھالو۔"

دونوں بھٹے کھانے لگے۔ یکایک مکھنا کو کچھ یاد آیا۔ اُس نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مُٹھی میں کھنکھناتے بلور کے ٹکڑے نکال کر شمعی کے سامنے رکھ دیئے۔ نیلی چٹان کی نیلی سطح پر ستارے جگمگا اُٹھے۔ شمعی نے مارے خوشی کے اُس کی طرف مست نگاہوں سے دیکھا اور مکھنا سرشار ہوگیا۔ —— "کہاں سے ملے" شمعی نے سارے ٹکڑے سمیٹ کر نہ جانے لہنگے کی کن لہروں میں گم کر دیئے، جیسے بلور کے ٹکڑے نہ تھے۔ کنواری برف کے ٹکڑے تھے۔ جو شمعی کے دہکتے جسم کی حدت لگتے ہی اُڑ گئے —— "یہیں جنگل میں ملے ...... اور چاہیں تمہیں" مکھنا نے پُوچھا اور ہاتھ شمعی کی طرف بڑھانا چاہا۔ "ہاں ...... بہت سارے" شمعی مسکراتے ہوئے اُس سے دُور کھڑی ہوئی۔ مکھنا کچھ کچھ سا گیا اور شمعی مکھنا کی بے قراری دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اچھا ... میں اب چلوں؟" شمعی نے خالی گھڑا سر پر جماتے ہوئے پُوچھا۔

"تمہاری مرضی ... ." مکھنا نے اُداس لہجے میں کہا۔ "میرے ریوڑ کا بھی خیال رکھنا۔"

"کیوں ... کہیں جا رہے ہو کیا۔" شمعی نے پُوچھا ——

"کالیا کل رات سے غائب ہے۔ اُس کو ڈھونڈھ نکالنا ہے۔ پانی بھی پلا دینا۔ ریوڑ کو ...... بھولنا نہیں۔" —— اچھا بابا اچھا ... پانی بھی پلا دوں گی۔" اور شمعی مٹک مٹک کر جنگل میں غائب ہوگئی۔

شمعی کے جاتے ہی جنگل کی خاموشی اور گہری ہوگئی۔ ندی کی سرسراہٹ پھر سے اُبھر آئی۔ فضا بھائیں بھائیں کرنے لگی اور مکھنا کو محسوس ہوا کہ وہ اس مہیب جنگل میں اکیلا ہے ... بالکل اکیلا اور اکیلے ہی اُس نے جنگل کا سامنا کرنا ہے۔ جنگل کو پچھاڑنا ہے اور زندگی کے کچھ اور دن جنگل سے چھینے ہیں۔ وہ کئی خطرناک پہاڑ پھلانگ گیا۔ کئی خوفناک گھاٹیاں پار کر چکا۔ تھکن نے پیروں میں درد کی ٹیسوں کو رواں کر دیا۔ کندھے پر کلہاڑا رکھنے کی جگہ زخم سا اُبھر آیا تھا۔ کہیں سے پانی گرنے کا

تھیں شمعی کی راہ دیکھتے دیکھتے۔ یکایک وہ جھنجھلا اُٹھا۔ کل شمعی آگئی ہوتی تو شاید وہ رات گئے گھر نہ پہنچ جاتا۔ اور پھر شاید کالیا بھی اندھیرے میں بھٹک نہ جاتا۔ اُس کو چاہیئے۔ کچھ بھٹے کھا کر پیٹ میں دہکتی آگ کو سرد کر دے اور کالیا کی تلاش کرے۔ شمعی نے آنا ہوتا تو وہ کب کی آگئی ہوتی۔ اُس نے بھٹوں کی طرف دیکھا۔ نیلی چٹان کی سطح پر اُس نے بھٹوں کو جھاڑ کر قرینے سے رکھا۔ داہنے ہاتھ بڑا بھٹا۔ اُس کے ذرا اس طرف چھوٹا بھٹا۔ آخر میں وہ ذرا ننھا سا بھٹا۔ جس کے دانے باقی بھٹوں کے دانوں کی طرح انگاروں کے مانند دہک نہ رہے تھے۔

سُورج سامنے والی پہاڑ کی چوٹی سے دو ہاتھ اُوپر آگیا تھا۔ واقعی اب بھوک سہی نہیں جاتی تھی۔ کھالے ایک بھٹا تو کیا ہ...... لیکن اُس کے ہاتھ صرف بھٹوں سے کھیلتے رہے۔ شمعی کے بغیر بھٹے کھانے میں کوئی لطف نہ تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ جنگل کی عام آوازوں میں اُس نے نئی آواز کو پہچان لیا۔ اُس نے گردن موڑ کے دیکھا۔ اور وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ دُور، درختوں سے اُدھر، سُنہری ڈھلان پر شمعی، سر پر چھوٹا سا گھڑا سنبھالے اُس کی طرف آرہی تھی۔ مکی کی روٹی جیسے سُوندھے سُوندھے گال، مکھن جیسے ملائم ہاتھ پیر، بادام جیسی آنکھیں ...... بھوک مٹتی سی محسوس ہوئی

"یوں گھور گھور کے کیا دیکھ رہے ہو۔" ندی کی سرسراہٹ، ساز کی جھنکار میں گم سی ہوگئی اور وہ چونک پڑا۔ نہ معلوم شمعی کو دیکھ کر اُسے کیا ہو جاتا تھا۔ وہ سب کچھ بھول سا جاتا تھا۔

"کل کیوں نہیں آئی ...... ؟" اُس نے یوں ہی پوچھا۔ شمعی کو دیکھ کر غصّہ بھی کافور ہو گیا تھا۔

کل رات چاچا آگیا تھا۔ فرصت نہیں ملی آنے کو۔" شمعی نے گھڑا نیلی چٹان پر احتیاط سے رکھتے ہوئے کہا اور لکھنا پدھک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ شمعی کا چاچا شمعی کی شادی اپنے بیٹے سے کرنا چاہتا ہے۔ لکھنا نے سپاٹ لہجے میں اپنا فیصلہ سُنایا۔

کسی دن تمھارے چاچا کی لاش جنگل کے جانور کھا جائیں گے اور میرے کلہاڑے پر خون کا کوئی نشان نہ ملے گا۔" شمعی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ جنگل کی بیٹیاں خون خرابے سے نہیں ڈرا کرتیں۔،

کو محسوس کر کے بوکھلا بھی گیا۔ وہ غرّاتا ہوا ملھنا کی اور لپکا۔ ملھنا کو محسوس ہوا کہ جیسے کوئی کالی چٹان پہاڑ پر سے لڑھک کر اُس کی طرف گری جا رہی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے خوف کی لہر ملھنا کے وجود کو ڈبو گئی۔ جی چاہا ایک طرف ہٹ جائے۔ ریچھ راستہ پا کر شاید اُس پر حملہ کئے بغیر چلا جائے — پر مہلت نہ ملی ہٹنے کی۔ کوئی چارہ نہ تھا۔ چشم زدن میں اُس کے ہاتھ لہرائے۔ کلہاڑے کے پھل پر سورج کی کرنیں رقص سی کر گئیں اور دوسرے لمحے کالی چٹان اُس کے سامنے آ گئی۔ پلک جھپکتے ہی اُس نے کلہاڑے کے پھل کو کالی چٹان پر دے مارا۔ کالی چٹان اُس سے ٹکرا گئی۔ اُس کا توازن بگڑ گیا۔ اور وہ مٹی کے حقیر ڈھیلے کی طرح ڈھلان پر لُڑھکنے لگا۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُسے محسوس ہوا کہ ہوا میں کچھ تیزی آ گئی ہے۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی ہے اور اُس کا بدن سردی سے اکڑ گیا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اُٹھ بیٹھا۔ ٹخنوں پر زخم آ گئے تھے۔ کہنیاں بھی چھل گئی تھیں۔ اور سر میں درد کا طوفان اُمڈ رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں ذرا دور پڑے کالے بے حس ڈھیر پر مرکوز ہو گئیں۔ کالے ڈھیر میں سے کلہاڑے کا لٹھ درخت کی طرح اُگا پڑا تھا۔ مُردہ ریچھ کو دیکھ کر اُس کے ذہن میں کوئی خاص ردِّ عمل نہ ہوا۔ ایسے حادثات جنگل کا معمول تھا۔ اگر کچھ اہمیت تھی تو یہ تھی کہ ریچھ کی کھال اوڑھنے بچھونے کے کام آئے گی۔ وہ آگے بڑھا۔ کلہاڑے کو ریچھ کے کندھے سے بمشکل الگ کر دیا۔ کلہاڑا ٹھیک کندھے کی ہڈی کو توڑ کر سینے تک پیوست ہو گیا تھا۔ اُس کا وار اچھا تھا۔ وہ خوش ہو گیا۔ اُس نے ڈھلان پر اُگی گھاس کے گچھے کاٹ لئے اور دیکھتے دیکھتے ایک موٹی سی رسّی بٹی۔ رسّی کے ایک سرے سے اُس نے ریچھ کو کس کر باندھا۔ رسّی کے دوسرے سرے کو پاس کے درخت کی ٹہنی کے اوپر سے گذار کر اُس نے کھینچنا شروع کیا۔ ریچھ کافی بھاری تھا۔ بہ ہزار دقّت اُس نے مُردہ ریچھ کو ہوا میں معلّق کیا اور رسّی کا سرا تنے سے باندھ دیا۔ اب اُس کا شکار جنگلی جانوروں کی دست بُرد سے محفوظ تھا۔

شور اُسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جنگل سے آگاہ کر رہا تھا۔ جہاں ہر درخت کے پیچھے خوف چھپا رہتا ہے۔ ہر چٹان تلے ڈر تاک لگائے بیٹھا رہتا ہے اور ہر موڑ کے پیچھے موت مچلتی رہتی ہے۔ جہاں زندگی ہر لمحے تخریبی قوتوں سے برسرِ پیکار رہتی ہے۔ وہ جانتا تھا اُسے اِتنا دُور نہیں آنا چاہیے تھا۔ پر کالیا کو پائے بغیر واپس جانا اُس کی شکست تھی۔ اور ایک دفعہ شکست تسلیم کر کے وہ زندہ رہنے کا حق کھو دے گا۔ جنگل کے قانون اٹل تھے۔

سامنے جھاڑیاں گھنی ہو رہی تھیں۔ اتنی گھنی کہ اُس جیسے ڈبل ڈول رکھنے والے آدمی کے لئے گھُس جانا کٹھن تھا۔ اُس کی تیز نگاہیں گھنی جھاڑیوں میں کوئی کمزور جگہ ڈھونڈنے لگیں، جہاں سے وُہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ جھاڑیوں کی دونوں حدیں عمیق ڈھلانوں میں منتقل ہو گئی تھیں، جہاں آدمی تو آدمی جنگلی بکری کے پَیر بھی لڑکھڑا جاتے۔ یکایک کہیں سے جھاڑیوں کے چرمرانے کی آواز آئی۔ شاید کالیا تھا۔ اُس کا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ جی چاہا، دوڑ کے جائے۔ کالیا کو کھوج نکالے اور پکڑ کر خُوب پیٹے۔ پیٹتے پیٹتے تھک جائے اور تب کالیا کو گود میں بھر کر بھینچ لے ... ... بھینچ بھینچ کر پیار کرے۔ لیکن اُس کے قدم آگے نہیں بڑھے۔ جنگل میں دوست دُشمن کی پہچان یقینی نہیں ہوتی۔ ذرا سی لغزش مُہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے ریچھ ہو۔ جھاڑیوں میں لٹکتے لال لال دانے ریچھ کا من بھاتا کھاجا تھا۔ غیر ارادی طور پر اُس نے کلھاڑے کو کندھے سے اُتار کر ہاتھ میں ہتھیار کی طرح تھاما۔ ویسے ریچھ بھی ہو تو اُسے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جنگل کی زندگی بلا وجہ ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرتی۔ شاید یہی ایک عُنصر تھا جس سے جنگل کی خوفناک زندگی میں بھی سکون تھا۔

جھاڑیاں چھٹ گئیں اور لکھنا کے ذہن میں پلتے وسوسے مجسّم ریچھ بن کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ کانٹے دار جھاڑیوں نے ریچھ کی کھال کو کئی جگہ سے پھاڑ دیا ہوا تھا۔ تھوتھنی پر بھی زخم آ گئے تھے۔ یقیناً غصّے میں ہوگا۔ ریچھ نے بھی اُسے بھانپ لیا۔ شاید لکھنا کی آنکھوں میں انتشار

میرے دوست کی بیوی

انور شاہ

اور پھر ایسا ہوا، کل رات میں نے کافی مقدار میں نیند آور گولیاں کھالیں اور اپنے جسم سے باہر آگیا۔ اب صبح ہوئی ہے اور سورج کی نرم رُوپہلی کرنیں کمرے کی کھڑکی سے لگے ہوئے سلاخوں سے چھن چھن کر رندو کے نیم عریاں جسم کو بے تحاشا چوم رہی ہیں اور میں کھڑکی کے بالکل قریب لٹکا ہوا اپنے ذہن کی آنکھوں سے کمرے میں جھانک رہا ہوں، کچھ سوچ رہا ہوں۔ جانے کیا سوچ رہا ہوں۔ سارا محلہ ابھی ابھی سونا پڑا ہے۔ گلی میں ابھی کوئی بچہ نہیں آیا۔ ابھی کسی آنگن میں کسی بچے کی پتنگ لڑانے کی آواز بھی نہیں آرہی ہے۔ "کبڈی کبڈی" کا شور بھی سنائی نہیں دے رہا ہے۔ ہاں یاد آیا۔ میں کل رات کی بات سوچ رہا ہوں۔ کل رات اسی کمرے میں کیسی کہانی ترتیب پاگئی۔ میں ایک بار پھر اس کہانی کو دُہرانا چاہتا ہوں۔ کبھی کبھار ایسی کہانیاں بار بار دُہرانے سے عجیب لذت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن کمرے کا دروازہ بند ہے۔ اور

محنت سے وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ کہنیوں اور ٹخنوں پر درد بڑھ رہا تھا۔ دِل چاہا کہ کچھ دیر سستا لے۔ سایے بہت بڑھ آئے تھے اور نیچے گھاٹی دُھندلی ہونے لگی تھی۔ پر سستانے کے لئے وقت نہ تھا۔ کائنات بہت لمبی تھی اور زندگی بہت کم۔ اُس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔ خون آلود کلہاڑے کو بچی کھچی گھاس سے پُونچھ کر صاف کر دیا اور کندھے پر لٹکا لیا۔ ایک آخری نظر ہوا میں مُعلّق ریچھ پر ڈال دی، اور لوئی کو گردن کے گرد سنبھال کر وہ گھاٹی چڑھنے لگا۔ ابھی اُس کو کالا کی تلاش تھی۔

○

دیکھتے تشنگی کی دُھوپ بکھر جاتی ہے۔ جسموں کی چاندنی پگھل جاتی ہے اور یہ کمرہ ایک پیاسا
صحرا ہے۔ جیل خانہ ہے۔ یہاں میں نے اندو کو قید کر رکھا ہے اور خود سلاخوں کے سامنے لٹک
رہا ہوں۔ قدموں کی چاپ، اور تیز ہو رہی ہے لیکن ناول کا ہیرو جیل میں بند پڑا ہے۔ "کبڈی،
کبڈی، کبڈی!" ——— گلی میں بچے جمع ہو گئے ہیں۔ اور اب گلی کھیل کا میدان بن چکی
ہے۔ یہ دُنیا بھی کھیل کا ایک وسیع میدان ہے اور ہم سب کبڈی کے کھلاڑی ہیں، ایک سے
دوسرے کو نیچا دکھانے اور ہرانے میں مصروف، اور پھر آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ ہماری نبض
ڈوبتی ہے۔ سانس ٹوٹتی ہے اور بس۔ بچوں کے کھیل میں ہیرا پھیری ہو گئی ہے۔ وہ سب
میری جانب دیکھ رہے ہیں۔ انھیں میرے فیصلہ کا انتظار ہے۔ بچے، یہ نادان اور معصوم
بچے۔ جانے ان کے من میں یہ بات کیسے آ گئی ہے کہ میں جو فیصلہ دوں گا وہ حق و صداقت پر
مبنی ہوگا۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ اس دُنیا میں سچائی کا کوئی وجود نہیں۔ سچ کوئی نہیں بول سکتا،
اپنے جرم کا اقرار کوئی نہیں کرتا۔ زہر کا پیالہ کون پیتا ہے؟ مجھ میں بھی سچ کہنے کی ہمت نہیں،
ہمت ہوتی تو میں نے کل رات ہی منوہر کو کہہ دیا ہوتا کہ اُس کی بیوی رندو میرے پاس ہے!
میرے کمرے میں ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں۔ ہم دونوں پیاسے
ہیں۔ سچا تو وہ ناول نگار ہے جس نے اپنے ہیرو کو سزا دلوائی۔ اس کو جیل بھجوا دیا۔ دُھوپ ان
سلاخوں کو چھوتی ہوئی اب سارے کمرے میں پھیل رہی ہے۔ لیکن میں اُس غبار کا کیا کروں جو میرے
ذہن پر مسلط ہے، اُس دُھند کا کیا کروں جو میری آنکھوں کے سامنے بتدریج پھیلتی جا رہی ہے،
یہ میں کیا سوچ رہا ہوں، کیوں سوچ رہا ہوں؟ ان سلاخوں سے چھن چھن کرتی ہوئی روشنی اندر
آ رہی ہے۔ ہوا کے تیز جھونکے سرسراتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ میں مڑ مڑ کر دیکھتا ہوں، کمرے کی
جانب۔ کمرے کے ننگے فرش پر دو سایے دو جسموں میں بدل جاتے ہیں؛ دو سانچوں میں ڈھل
جاتے ہیں۔ میں ان کے قریب آتا ہوں۔ ان کو گھور گھور کر دیکھنے لگتا ہوں۔ پہچاننے کی کوشش کرتا
ہوں۔ یہ ناول کے ہیرو اور ہیروئن کے جسم ہیں۔ نہیں! یہ ان کے جسم نہیں ہیں۔ یہ دونوں نیم

کمرے سے باہر برآمدے میں قدموں کی چاپ صاف سُنائی دے رہی ہے۔ عجیب سی چاپ ہے یہ۔ جیسے کوئی انسان اپنا جسم گھسیٹ رہا ہو۔ اس چاپ کی آواز سے بچنے کے لئے بھی میں کمرے کے اندر جانا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ سلاخیں میرا راستہ روکے ہوئی ہیں۔ رات میں دیر تک جاگتا رہا۔ اب نیند آرہی ہے۔ سونا چاہتا ہوں۔ کل کی سوچیں پھر لاشعور میں پھیل رہی ہیں۔ کل بھی رِند میرے ساتھ تھی۔ اسی کمرے میں، اور جب وہ سوگئی تو میں نے ناول پڑھا۔ بڑا ہی دلچسپ ناول تھا، مگر بے حد کنزرویٹیو ورشل۔ اور اب ناول کے سارے کردار۔ سارے واقعات سِلولائیڈ پر اُبھرنے والی تصاویر کی طرح میری نظروں کے سامنے آرہے ہیں۔ میں اب بھی اپنے ذہن کے سِلولائیڈ پر ناول کے ہیرو کی تصویر دیکھ رہا ہوں جس کے ہاتھ آہنی زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں اور جسے پولیس گھسیٹ کر لے جارہی ہے۔ جیل کی طرف۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کرنے کے لئے میرے دل میں نفرت کا ایک شدید جذبہ اُبھرتا ہے۔ ناول نگار کے لئے۔ کتاب کے مُصنّف کے لئے قلم اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اُسے جیل کی سزا سے بچا سکتا تھا۔ پر ایسا نہ ہُوا۔ ناول کے ہیرو کو سزا ہوگئی، اُسے جیل لے گئے۔ اس کا دوش صرف اتنا تھا کہ وہ اپنے ایک عزیز دوست کی بیوی سے پیار کرتا تھا۔ اس سے چھُپ چھُپ کر مِلتا تھا۔ پہل تو اس کے دوست کی بیوی نے ہی کی تھی۔ انسان ہے۔ پھسل گیا۔ جانے یہ رسم کہاں سے چلی ہے کہ آج بھی انسان پتھروں سے نئے بُت، نئی صورتیں، نئی مُورتیاں یُوں بناتا ہے جیسے کسی دَور میں ایسا بُت نہ بنایا گیا ہو۔ ناول کے ہیرو کے عزیز دوست نے بھی اپنی بیوی کی ایک ایسی ہی مُورت تراشی تھی۔ پھر اس کی پُوجا کی۔ اس سے پیار کیا۔ ہیرو نے بھی اس کی ایک مُورت تراشی۔ اُسے رُوپ دیا۔ نام دیا اور پھر جیل چلا گیا۔ قدموں کی چاپ اور قریب آرہی ہے۔ لیکن کمرے کا دروازہ بند ہے۔ اور وہ اندر نہیں آسکتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہاں اس کی بیوی نیم عُریاں انداز میں لیٹی ہوئی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہاں اِس لمحے احساس تپ رہا ہے۔ حُسن بہک رہا ہے۔ دھڑکنیں سُلگ رہی ہیں، اور سانسوں سے آگ برس رہی ہے۔ کیسے کیسے لمحے آتے ہیں زندگی میں! بس دیکھتے

والے کی جانب دیکھ رہا ہے۔ یہ بچہ میرا جانا پہچانا ہے۔ یہ آندو کا بچہ ہے۔ خالی جیب لئے۔
اس کی ماں میرے کمرے میں ہے اور اُس کا باپ میرے کمرے سے باہر دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔،
دروازہ کھولنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ خوانچہ والا جا چکا ہے۔ راجماش کی سوندھی سوندھی
خوشبو ختم ہوگئی ہے۔ لیکن وہ معصوم بچہ اب بھی سرِ راہ کھڑا آسمانوں میں دیکھ رہا ہے۔ ناسمجھ
ہے۔ اسے کیا معلوم، آسمانوں کا خدا کب کا سو گیا ہے اور دھرتی کا انسان کتنا بے خوف ہے!
خودغرض ہے، کمینہ ہے۔ اس ناول کا ہیرو بھی کمینہ تھا۔ اپنے دوست کی بیوی کو لے اُڑا، عزیز
دوست کی بیوی پر بھی نظر رکھی۔ اچھا ہوا، اسے سزا مل گئی۔ وہ جیل میں ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔،
نیند آور گولیوں کا نشہ آہستہ آہستہ اُتر رہا ہے۔ میں آہستہ آہستہ اپنے جسم میں داخل ہو رہا ہوں،
زمین کا غبار دُھل رہا ہے۔ میں آندو کے قریب آ رہا ہوں۔ جھکی جھکی تھکی تھکی سی ہے۔ لیکن وہ
جسم مطمئن اور آسودہ لگتا ہے کہ یہ تھوڑی سی تھکن، یہ تھوڑی سی اُلجھن، اسی اطمینان اور
آسودگی کی دلیل ہے۔ آندو کے اور قریب آ رہا ہوں۔ اس کی بہکی بہکی سانسیں سکون پانے
لگی ہیں۔ اس کے ہانپتے ہوئے جسم کے ایک ایک انگ کی تھرک لمحہ بہ لمحہ بکھر رہی ہے۔ یہ میں کیا
دیکھ رہا ہوں۔ یہ سب کیا سوچ رہا ہوں۔ کمرہ کھٹکھٹانے کی آواز بند ہوگئی ہے۔ قدموں کی
چاپ سنائی نہیں دیتی ہے۔ منوہر شاید چلا گیا ہے۔ وہ معصوم معصوم بچہ بھی نا اُمید ہو کر
آسمانوں کے خدا کی تلاش میں چلا گیا ہے۔ اب میں چاہوں تو کل رات کی کہانی کو ایک بار پھر دُہرا
سکتا ہوں۔ میرے شریر میں ایک عجیب سی لذت جاگ رہی ہے۔ کل میں نے اسی لمحے نیند آور گولیاں
کھالی تھیں۔ جب آندو کے شفق آلود ماتھے کے گرم گرم پسینے کے قطرے اس کی لمس پا کر پھولوں
کی طرح مہکنے لگے تھے۔ اب کچھ اور ہی بات ہے۔ اب آندو پر پھر ایک نشہ سا چھانے لگا ہے!
اس کی لانبی لانبی پلکیں جھکنے لگی ہیں۔ وہ پھر ایک خواب آلود سی حالت میں ایک بدمست ہرنی
کی طرح ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ اور قریب آنے کے لئے مجھے اپنی پلکوں کی جنبش
سے اشارے کر رہی ہے۔ میں ایک بار پھر اپنے شریر کی قوت کو آندو کے شریر میں پیوست کر رہا

عُریاں جسم فرش کی سطح پر اور بھی پھسل جاتے ہیں۔ حُسن بہکنے لگا ہے۔ دھڑکنیں سُلگنے لگی ہیں۔ سانسوں کی آگ برسنے لگی ہے۔ ایک جسم میں پہچانتا ہوں۔ یہ کھردرا جسم میرا ہے اور تشنگی کی دُھوپ میں تپتا ہوا یہ دوسرا جسم میرے عزیز دوست منوہر کی بیوی کا ہے۔ یہ گورا شریر پھُول سے نازک ہے، چاند سے حسین ہے۔ لیکن میرا جسم برف کا ڈھیر ہے۔ میں اپنے شریر کی ساری گرمی کھو چُکا ہوں۔ میرے جسم اور شریر کی ساری گرمی آندو کے جسم میں منجمد ہو گئی ہے اسی لئے تو اس کی آنکھوں سے شعلے لپکتے ہیں۔ اس کی سانسوں سے آگ برستی ہے۔ کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ منوہر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ منوہر ہے۔ وہ ایک بار پھر دوستی کی نبض ٹٹولنے میرے کمرے تک آگیا ہے۔ لیکن وہ کیا جانے کہ دوستی کی نبض تو کل رات کو ہی ڈُوب چُکی ہے۔ دوستی کی نبض تو اُسی دِن ڈُوبی تھی۔ جب انسان پھسل گیا تھا۔ جب میں پھسل گیا تھا۔ جب انسان نے اپنے تراشے ہوئے بُت توڑ ڈالے تھے۔ جب ناول کا ہیرو پھسل گیا تھا۔ جب میں پھسل گیا تھا۔ آندو پھسل گئی تھی۔ پھسلن مُشترکہ ہے۔ آندو خُود ہی میرے پاس آتی رہی اور کل رات دو بچوں کی ماں، ایک بار پھر نوخیز کلی بنی۔ کبڈّی کا کھیل بند ہو چکا ہے۔ سارے بچّے اب خوانچے والے کے قریب جمع ہو گئے ہیں۔ "گرم لے لو۔ تازہ لے لو۔" محلّے کا سوناپن جاگ پڑا ہے۔ زندگی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ مکانوں کی کھڑکیوں سے عجیب عجیب سے چہرے دِکھائی دے رہے ہیں! کچھ چہروں پر صُبح کی تازگی ہے۔ اور کچھ چہرے ادھ کھلے ہیں! زنگ آلود اور کچھ مُرجھائے ہوئے چہرے ہیں۔ بچوں کی جیبوں سے پیسے نکل رہے ہیں۔ کچھ بچّے نااُمید نظروں سے خوانچے والے کو دیکھ رہے ہیں اور راجاش سے اُٹھتی ہوئی سوندھی سوندھی خوشبو سُونگھ رہے ہیں۔ خوانچے والے کے ہاتھوں میں ترازو ہے۔ انصاف کا ترازو اور انصاف کہیں بھی نہیں ہے — انصاف کسی کے ساتھ نہیں ہوا۔ میرے ساتھ اور نہ ہی منوہر کے ساتھ۔ آندو کے ساتھ اور نہ ہی آندو کے بچوں کے ساتھ۔ سارے بچّے جا چُکے ہیں۔ صرف ایک بچّہ حسرت بھری نظروں سے خوانچے

اپنا ایک سفر

او، پی، شرما سارتھی

میں باہر نکل کر ـــــ بھیگے ہوئے ہاتھ کا چھجّہ ایک آنکھ پر باندھ کر فلک کی جانب دیکھتا ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے پورا سورج گرمی اور طاقت کو لئے میری آنکھ میں گھس جاتا ہے۔ میں چل پڑتا ہوں۔ تمام جسم پر لُو کی پرتیں چڑھنے لگتی ہیں۔ کچھ دُور چلنے پر زبان تالو چاٹنے لگتی ہے۔ اس چلچلاتی غال جلاتی ہوئی دھوپ میں، میں اس آدمی، اس سنکی آدمی کو ملنے کے لئے نکلا ہوں جس نے ایک دِن، جب سورج اونچے پہاڑ کی پچھلی طرف لڑھک کر خودکشی کر رہا تھا۔ دیکھتے ہوئے کہا تھا ـــــ اب اس بستی میں اس ماحول میں سانس لینا محال ہو گیا ہے۔ میں اب کچھ دُور چلا جاؤں گا۔ اور تنِ تنہا رہ کر خود کو محسوس کروں گا۔ خود کو زندہ محسوس کرنے کی سعی کروں گا۔

بستی اور ماحول سے جُدا رہ کر تم خود کو زندہ محسوس کر سکو گے؟" میں نے حیرانگی سے

ہوں۔ سارا محلّہ جاگ پڑا ہے۔ دھوپ نے سارے محلّے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ کتنی تیز دھوپ ہے! میں اس تیز دھوپ میں بھی آہنی سلاخوں کے بالکل قریب لٹکا ہوا ہوں۔ اب گلی میں کافی لوگ جمع ہوگئے ہیں۔ ان لوگوں میں میرا عزیز دوست منوہر بھی ہے۔ اس کی گود میں اس کا معصوم بچّہ ہے۔ جو خلاؤں میں اب بھی کچھ تلاش کر رہا ہے۔ ان سب کو جیسے کسی کی تلاش ہے، کسی کا انتظار ہے۔ ہاں پولیس آ رہی ہے۔ کچھ کھسر پھسر ہو رہی ہے۔ اب سارے لوگ پولیس کو لے کر اوپر آ رہے ہیں۔ منوہر سب سے آگے آگے ہے۔ دروازہ توڑا جا چکا ہے۔ میرے دل اور ذہن کے درمیان تصادم ہے۔ دل کی آنکھیں تر ہیں۔ ذہن منتشر ہے اور اس منتشر ذہن کے سلولائیڈ پر ناول کے ہیرو کی تصویر ایک بار پھر ابھر رہی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں وزنی زنجیریں ہیں۔ دروازہ توڑا جا چکا ہے۔ پولیس اندر آ چکی ہے۔ آنندو نے اپنا جسم سمیٹ لیا ہے، اب پولیس میری طرف دیکھ رہی ہے اور میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا رہا ہوں!

دھوپ میں پلا ہوں۔ جو بات آج تک نہیں ہوئی، اس کا ذکر تم سے کبھی نہیں میں نے کیا۔

شور و غل اور ہنگاموں سے میں کچھ دور نکل آیا ہوں۔ اور ٹھیک اسی سڑک پر چل رہا ہوں جو اس شخص کے نئے ویران ٹھکانے تک جا پہنچتی ہے۔ اب بھی اِکّا دُکّا گزرتے آدمی نے دھوپ کا تپتا ہوا لباس پہنا ہوا ہے۔ دھوپ ٹھہرتی نہیں، چلتی جاتی ہے، آدمی بھی چلتا ہے۔ آدمی رُک جاتا ہے۔ "دھوپ نہیں رُکتی۔ وہ دوسرے چلتے ہوئے آدمی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔" یہ خیال آتے ہی میرے قدموں میں تیزی آنے لگتی ہے۔ میں جلدی جلدی چلنے لگتا ہوں۔

گرمی سے دور تک کے ماحول کی سانس گھٹی ہوئی ہے۔ دھوپ ہے کہ چھوٹے چھوٹے تیز نشتر وجود کے ہر حصے کو کاٹتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ میں ذرا رُک کر اپنے وجود کو غور سے دیکھتا ہوں۔ اور یقین کرتا ہوں کہ خون کی ایک بھی بوند پھوٹ کر نہیں بہی ہے۔ ماحول کی گرمی اور دھوپ نشتر بن کر کاٹتی ہے، لہو نہیں نکلتا۔ انسان تبھی جیتا ہے!

میں اپنے خیال سے لرز جاتا ہوں۔ لہو اگر وجود میں ہو تو بہتا ہے۔ بہنا چاہیئے، چاہے آنکھوں کے راستے۔ چاہے اُسے کوئی مشین چاٹ جائے! چمنی کے راستے، چاہے دھواں بن کر اُڑ جائے۔ بجری کے ساتھ مل کر، چاہے تارکول کی مانند سڑک پر بچھ جائے!

میں نرم نرم قدموں سے چلنے لگتا ہوں، تاکہ میرے پاؤں سڑک میں دھنس نہ جائیں! کہیں پھنس نہ جائیں! کیونکہ مجھے ابھی چلنا ہے۔ اس شخص سے ملنا ہے اور دریافت کرنا ہے کہ اس نے خود کو پالیا ہے کہ نہیں؟ اگر پالیا ہے تو وہ خود کو زندہ محسوس کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے یا نہیں؟

دائیں بائیں، سڑک سے کچھ دور درخت کھڑے ہیں جن کو خزاں نگل چکی ہے۔ جو دور جاتی ہوئی سڑک کی ویرانگی اور خاموشی کو بڑھا رہے ہیں۔

چند قدم آگے، بہت بڑے خزاں آلود درخت کے نیچے سڑک بل کھا کر مڑتی ہے۔

پوچھا تھا۔

"یہاں بستی میں رہ کر کبھی کبھی ویرانگی کا احساس شدّت سے ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی کانوں کے راستے آوازیں باطن میں اُترتی رہتی ہیں۔ سڑک پر چلنے کی آوازیں، دھکنے کی آوازیں۔۔۔ بند ہونے کی، اور کھلنے کی آوازیں، چڑھنے کی آوازیں، اُتر آنے کی آوازیں، گرنے کی آوازیں گر کر ٹوٹنے کی آوازیں۔ تم یہ سمجھ لو کہ ہر آواز ایک حادثہ بننے اور مجھے ہلا کر رکھ دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ پھر اس ہنگامے میں خود کو زندہ کیسے محسوس کیا جا سکتا ہے؟

"یہ آدمی ہر بار دیکھنے پر مشکل سے مشکل ترین محسوس ہوا ہے۔" سوچ کر میں نے پوچھا۔۔۔ "میں نے طے کیا کہ ویران جگہ رہ کر تمھیں زندہ رہنے کا احساس ہو بھی گیا تو اس کے بعد کیا کروگے؟"

اس آدمی نے قہقہہ بلند کیا، لیکن کھوکھلا سا، بناوٹی۔ قہقہے کا بھی ایک تسلسل ہوتا ہے، جس میں آدمی کی کسی سوچ اور کسی ردِّ عمل کا پوشیدہ دخل ہوتا ہے۔

"پھر میں تمھارے بارے میں سوچ سکوں گا۔ تحقیق کی شروعات کر سکوں گا۔ پھر وہ میری پیشانی، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں، باہر کو آئے ہوئے جبڑوں اور زردی مائل پچکے ہوئے گالوں کو باری باری غور سے دیکھنے لگا۔

"میرے بارے میں کیا تحقیق کروگے؟ میں نے پھر حیران کُن لہجے میں پوچھا۔

"دراصل، تم نہیں جانتے ہوں گے، تمھارا وجود میرے لئے کتنی بڑی پہیلی ہے۔ کتنا بڑا مایا جال ہے، جسے میں سمجھنا چاہتا ہوں۔ تمھارے وجود کو میں تہہ در تہہ اُکھاڑنا چاہتا ہوں اور اصلی رُوپ تمھارا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

خود کے بعد مجھے میرے اصلی رُوپ میں دیکھنے کا وہ شخص خواہش مند کیوں ہے؟ سوچنے لگا۔۔۔۔

اس نے اور بھی بہت سی باتیں کہیں، لیکن سمجھنے کی بجائے صبر کا پلّو ہاتھ سے چھوٹتا گیا۔ مجھے غصّہ آنے لگا۔ میں نے صرف اتنا کہہ کر اس کو الوداع کہہ دی کہ میں ہمیشہ تمھیں اپنے اصلی

ہے۔ صدیوں سے بھاگ رہا ہے۔ شاید اس دن سے سورج اپنا پیچھا کرتا آرہا ہے جس

دن سے آدمی کو خود پر سے یقین اُٹھا اور اس نے اپنا پیچھا شروع کیا۔

سورج اب فلک پر تنی ہوئی سرخی مائل، پر میلی چادر کے سہارے، نیچے اُتر رہا ہے۔

اب میں جلد ہی اس شخص کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اس سے ملوں گا۔

خاموشی کی فضا میں لپٹے ہوئے چند گھروندوں کے قریب اس شخص کا گھر ہے جو میرے

سامنے آگیا ہے۔ اب میں چند قدم آگے بڑھوں گا۔ اور دستک دوں گا۔ پھر وہ شخص میرے

سامنے کھڑا ہوگا۔ لیکن وہ مسکرا کر مجھے خوش آمدید نہیں کہے گا۔ میں اس کی فطرت سے واقف

ہوں۔ وہ کبھی کسی کا سواگت نہیں کرتا۔ ملنے کے نام پر مل لیتا ہے اور بات کرنے کے نام

پر بات کر لیتا ہے!

میں دستک دیتا ہوں۔ چند لمحوں میں دروازہ کھلتا ہے۔ مایوسی کی گرد میں لپا پُتا چہرہ

سامنے ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو قہقہہ لگا سکتا ہے۔ لیکن مسکرا نہیں سکتا!

اس کا مجھے دیکھ کر اندر پلٹ جانا میرے لئے دعوت ہے۔ میں بالشت بھر کے کٹے بازو

کی شکل کے صحن میں چل کر کمرے میں پہنچتا ہوں۔ اکیلے پن کی بُو تو آتی ہے؛ ساتھ ہی بیٹھ کر

اپنے پن کا احساس بھی آہستہ سے میرے اندر اُبھرنے لگتا ہے۔

"تو تم پہنچ گئے؟" وہ دھیمی آواز میں پوچھتا ہے۔ "کیسے پہنچ گئے؟"

جواب میں، میں کچھ کہنے کو نہیں ہوتا۔ میں اُسے اپنی خاموشی ہی میں ایک جواب کا احساس

دلانا چاہتا ہوں۔ وہ جواب کچھ یوں ہے ــــ "اگر کوئی سڑک اس کمرے تک نہ پہنچتی

تو میں کیسے آسکتا تھا!"

"ہاں۔ جانتا ہوں۔ جہاں تک سڑک جا سکتی ہے آدمی وہیں تک تو پہنچ سکتا ہے

اس سے آگے نہیں۔" خود ہی وہ کہہ دیتا ہے۔

"تمہیں یہاں رہتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ اب واپس چلے چلو!"

مجھے وہاں سے گزرنا ہے۔ لیکن یہیں سے میں خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ چیلوں کا جھنڈ درخت پر تسلط جمائے بیٹھا ہے۔ میری آنکھوں میں، میرے کمرے کے سامنے بنا مزار گھومتا ہے۔ اس پر ایک آدھ چیل ہر شام آ کر منڈلانے لگتی ہے۔ چیخ و پکار کرتی ہے۔ میں تب، بھی ہراساں ہو جایا کرتا ہوں۔ سوچا کرتا ہوں، اگر یہ مزار بستی سے دور کہیں ہٹ کر بنا ہوتا یہ چیلیں اس کو اکھاڑ ڈالتیں!

اب، اس لمحہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ اور آگے سڑک ویران ہے۔ خزاں آلود بھیانک درخت پر چیلوں کا جھنڈ بیٹھا ہے۔ چیلوں کو مردے کا لحاظ نہیں تو چلتے پھرتے کا کب ہے!

میں رکتا نہیں ہوں۔ درخت کے قریب پہنچ جاتا ہوں۔ تنا بہت گھیرے میں ہے۔ اس کی کھال پھٹ کر ادھر لگی ہے۔ میرے درخت کے نیچے سے گذرتے ہوئے شور برپا ہوتا ہے۔ قدم تیز کر لیتا ہوں۔ کچھ دور پہنچ کر مڑ کر دیکھتا ہوں۔ چیلیں دائروں میں اڑ رہی ہیں —— بھیانک، بہت سی سیاہ چیلیں۔

ذہن میں بھی کچھ چیلیں ابھر کر دائروں میں اڑنے لگتی ہیں۔ ان چیلوں کی صرف آنکھیں ہیں۔ نہ خون خوار پنجے ہیں اور نہ ہی دو دھاری چونچیں۔ اڑ سکتی ہیں۔ مجھے انتظار کرنا پڑتا ہے کہ کب کوئی چیل جھپٹے۔ اور میرے وجود کو نہ سہی، اس کا کوئی حصہ نوچ کے لے جائے! لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ شاید میں مزار ہی ہوں جس پر پتھر دھر دیئے گئے ہوں۔ لیکن تابوت خالی ہے۔ کس پر ضرورتوں کو چیلیں نوچیں اور جھپٹیں؟

گرمی اور تکان سے میرا منہ سرخ ہو گیا ہے۔ مجھے دیکھ کر سورج نے بھی اپنا سا منہ سرخ کر لیا ہے۔

میں نے اپنے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنا منہ سرخ کیا ہے۔ یہی کہانی اس تھکے ماندے اور ہارے ہوئے سورج کی دکھائی دیتی ہے۔ یہ بھی خود کے پیچھے بھاگتا ہے۔ ہر روز بھاگتا

ڈال دیتا ہے۔ "اب جاؤ!" وہ تحکمانہ لہجے میں کہتا ہے۔

"میں تم سے بہت سی باتیں کرنے آیا تھا۔" میں جلدی جلدی کہتا ہوں۔

"باتیں نہیں - میں جانتا ہوں۔ تم سوال کرنے آئے تھے۔ لیکن اب وقت نہیں ہے۔ تم جاؤ۔" میں تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ اس کے خشک مزاج کو تو جانتا ہوں۔ وہ مجھ سے اس حد تک عجیب برتاؤ کرے گا، اُمید نہیں تھی!

اب میں بھاگنے کے انداز میں چلنے لگتا ہوں۔ مجھے لمبی مسافت طے کرنی ہے۔ میرا ذہن زہر اُگل رہا ہے۔ رگ رگ میں اس شخص کے لئے نفرت سرایت کر رہی ہے۔ میں یہی سوچتا ہوا بھاگ رہا ہوں کہ میں اس شخص کو بدنام کر دوں گا۔ اس کے تمام چہرے اُتار کر اُسے ننگا کر دوں گا، تاکہ تمام بستی والوں کو معلوم ہو جائے کہ کچھ عرصہ پہلے جو شخص خود کو ڈھونڈنے کے لئے بیاباں میں چلا گیا تھا، وہ اب پاگل ہو چکا ہے۔ اس کا ذہنی توازن ہل گیا ہے۔ وہ آدمی کو آدمی نہیں پہچانتا۔ وہ آدمی اور آدمیت کی قدروں کو بھول چکا ہے۔ اب وہ بستی کے لوگوں میں رہنے کے قابل نہیں رہ گیا ہے۔

رات سڑکوں پر، گھروں پر، لوگوں پر اور کمروں پر اُتر آئی ہے اور اب صحنوں میں آ کر بیٹھ چکی ہے۔

میں اپنے کھونٹے پیٹ والے کمرے میں پہنچتا ہوں۔ روشنی کرتا ہوں۔ لباس بدلنے کے لئے کھونٹی کی جانب بڑھتا ہوں۔ دم بخود رہ جاتا ہوں۔ وہ شخص کھڑا ہے۔ خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتا ہے۔ پوچھتا ہے:۔

"حیران کن نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"تم یہاں؟ کب آئے؟ کیسے آئے؟" میرے منہ سے نکلتا ہے۔

"تمہارے ساتھ ساتھ تو آیا ہوں۔" وہ کہتا ہے۔

"میرے ساتھ؟ میں تو اکیلا لوٹا ہوں!"

میں سوچی ہوئی تجویز اس کے سامنے رکھ کر اس کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہو کر بجھ جاتی ہے ـــــــــ

"واپس چلوں؟" اسی گھٹن میں؟ اس زہریلی فضا میں؟ جہاں آدمی دماغ کو بھول کر مشینوں سے سوچتا ہے اور کام لیتا ہے۔ جہاں مشینیں ہی مشینیں ہیں ـــ، جو دھواں اُگلتی ہیں۔ وہ دھواں خون میں تحلیل ہوتا رہتا ہے۔ وہ خون پھر آدمی کے لئے زندگی اور موت کی درمیانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہاں؟

اس شخص کی سانس پھُول جاتی ہے۔ اس کے ہونٹ پھڑپھڑاتے رہتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے، میں بہرہ ہو گیا ہوں۔ وہ لگاتار بولتا جا رہا ہے۔ میری ہی قوّتِ سماعت ختم ہو گئی ہے ـــــــ

"تم کہو، جو کچھ کہنا چاہتے ہو اور واپس لوٹ جاؤ۔ وہ کچھ کچھ پریشان کُن لہجے میں کہتا ہے۔ "میں بھی پریشان ہو جاتا ہوں!"

"لوٹ جاؤں؟ تمھارا مطلب کیا ہے؟" بلند آواز میں، میں پُوچھتا ہوں۔

"مطلب! مجھے تم سے بدبُو آرہی ہے۔ وہ شخص اپنی ناک کو دو انگلیوں میں مسل کر کہتا ہے: "میں جانتا ہوں کہ اس شخص کو خود سے بھی بدبُو آتی رہتی ہے۔ لیکن اُسے وہ برداشت کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔

"تم اپنی بدبُو کی مانند میرے وجود سے پھوٹتی ہوئی بدبُو کو برداشت کر لوگے۔ لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔" میں کہتا ہوں۔

وہ شخص اُٹھ کر ٹوٹی کھڑکی میں سے باہر جھانکتا ہے۔ پھر باہر دیکھتے ہی ہوئے زور سے چلاتا ہے۔ اگر تمھیں یہاں آنا ہو تو جلدی چلے آیا کرو۔ اب رات کی تاریکی اُترنے والی ہے۔ جلد ہی یہاں سے چلتے بنو!"

میں اُٹھتا نہیں ہوں۔ وہ مجھے دھکیل کر اُٹھا دیتا ہے۔ بازو سے پکڑ کر سڑک پر آ کر

خوابوں کے دریچے

ڈاکٹر برج پریمی

دسمبر کی ایسی ہی کالی اور بھیانک رات میری یادوں کے اُفق پر اُبھر آتی ہے۔ رُوح کو منجمد کرنے والی سائیں سائیں کرتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں اب بھی میرے روم روم کو جھنجھوڑ دیتی ہیں، اور جیوتی کا جوالا مکھی کی طرح تپتا ہوا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے جم جاتا ہے۔ اور میرے من میں اُتھل پتھل مچ جاتی ہے۔

دس سال پہلے جیوتی نے جب اس گھر کے آنگن میں قدم رکھا تھا تو الھڑ گیتوں کے درمیان پرتھوی کی ماں نے اس کی آرتی اُتاری تھی۔ "وِیوگ" کے رنگوں بھرے منڈل کی ریکھاؤں پر اُس کی حسین آنکھوں میں اپنی مرحوم بیٹی شیلا کا عکس دیکھ لیا تھا۔ وہی رنگ، رُوپ، وہی گہری سیاہ آنکھیں، وہی حیا کا نور —— بوڑھی ساس کے گھاؤ کھل گئے تھے۔ لیکن پھر پلکوں کی ہلکی نمی کو اُس نے ممتا کی خوشبو میں ملا کر اپنے زخموں کی ٹیسوں پر مرہم کر دیا تھا۔ اور اُسی

وہ پھر قہقہہ لگاتا ہے۔

"تمہارا قصور نہیں ہے۔ اندھیرا قصوروار ہے۔ تاریکی ہو تو آدمی ساتھی ہوتے ہوئے بھی اپنے کو اکیلا سمجھ لیتا ہے۔ اندھیرا زیادہ تھا۔ تم مجھے دیکھ نہیں سکے!"

"تم نے راستے بھر بات بھی نہیں کی؟" میں پوچھتا ہوں۔

"بات؟ تم بھاگتے ہوئے مجھے گالیاں دیتے رہے۔ میری بات سننے کی تمھیں فرصت کہاں تھی؟" "اچھا۔ اب بیٹھو۔" میں کہتا ہوں۔ وہ بیٹھ جاتا ہے۔

"اب ہم باتیں کریں گے۔" میں جب کہتا ہوں تو وہ اثبات میں سر ہلا دیتا ہے۔

پھر وہ شخص دفعتاً اُٹھ کر دیوار سے لگے ہوئے آئینے کو اُتارنے لگتا ہے۔ میں چلّاتا ہوں، ـــــ "توڑو گے آئینے کو؟"

"نہیں تمھارے سامنے رکھ دوں گا۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہتا ہے۔

"تم احمق ہو گئے ہو۔" میں دو قدم چل کر روز اسے دیکھتا ہوں۔"

"لیکن تمھارے دیکھنے سے میری مشکل آسان نہیں ہوتی" کہہ کر آئینے کو وہ میرے سامنے ٹیک دیتا ہے اور بلند آواز میں کہتا ہے:

"تم اب مجھ پر سوالات کی بارش کرو گے۔ پوچھو گے خود کو ڈھونڈ لیا؟ میری تلاش کر لی؟ کیا ملا؟ بستی میں کیوں نہیں آنا چاہتے ہو؟ وہ ننگا درخت وہاں کیوں ہے؟ اُس پر چیلیں کیوں بیٹھی تھیں وغیرہ ـــ تو دوست ـــ میں بہت تھک چکا ہوں۔ چھاتی میں دم نہیں ہے کہ جواب دے سکوں! تم سوال پوچھتے جاؤ۔ یہ آئینہ، اُمید ہے تمھیں جواب دیتا جائے گا۔"

وہ ایک طرف ہٹ جاتا ہے۔ میں یکے بعد دیگر سوال پوچھ کر آئینے کو گھورنے لگتا ہوں۔ وہ شخص کھوکھلے قہقہے ساتھ ساتھ لگاتا جاتا ہے۔

سارے ناٹک میں جیوتی ایک خاموش تماشائی بن کر رہ گئی۔ بے حِس!

اس کی کویتا میں چھپی ہوئی اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ اس سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ نہ فریاد، نہ بغاوت اور نہ ہی اپنی بات منوانے کے لئے کوئی ستیہ گرہ۔ جیسے کہ ایک رات لگن منڈپ پر پوتر اگنی کے سامنے وہ پرتھوی کی جائداد بن گئی۔ پرکاش کے ساتھ اُس کے تعلقات کیا تھے اور کیا نہیں تھے ——— یہ سب قِصّۂ پارینہ بن گیا۔ اب اس کی آنکھوں میں کاجل کی سُرمئی لکیروں کو کاٹتی ہوئی آنسوؤں کی لکیر تھی۔ یہ پرائشچت کے آنسو تھے یا محبوب سے ہمیشہ کی جُدائی کے آنسو ——— کون جانے؟

پرتھوی نے ایک دیوار بن کر دو جذبوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا!

پرتھوی ایک سیدھا سادہ نوجوان تھا۔ اُسے نہ شاعری سے دلچسپی تھی اور نہ کلا کی نزاکتوں کا احساس۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عورت کے تصوّر سے اُس کے من میں کھلبلی پیدا نہ ہوتی ہو! شادی سے پہلے اُس نے بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح بہت سے خواب بُن لئے تھے۔ بے سر و پا خواب! جیوتی کے جغرافیہ سے ناآشنا وہ کشمیر سے باہر مُلازمت کے سلسلے میں رہائش پذیر تھا۔ اور اپنے خوابوں کی حقیقت پانے کے لئے صرف چند ایّام کے لئے گھر چلا آیا تھا۔ یہاں جیوتی کے جسم کی لذّت پا کر اُس کے جذبات آسودہ ہو چکے تھے۔ چھٹیاں ختم ہوتے ہی جیوتی کو ماں کی تحویل میں چھوڑ کر وہ واپس چلا گیا۔ اُس کا دِل بھاری تھا اور اُس کی آنکھوں کے سامنے مُرادوں کی رات کا خُمار تھا۔

وقت کی ناؤ آہستہ آہستہ بہتی گئی۔ پرتھوی اضطراب اور بے قراری کو گلے سے لگائے سِسک رہا تھا۔ بعض اوقات اُسے تنہائی کا شدید احساس ہوتا۔ اور وہ بے بس ہو کر ہانپنے لگتا۔ لیکن تب جیوتی کے پیار میں ڈوبے ہوئے مُعطّر خطوط اُس کو حوصلہ بخش دیتے۔ اُسے لگتا جیسے جیوتی ابھی ابھی اُس کی باہوں کے حلقے سے نکل کر اُس کے لئے چائے بنانے گئی ہو۔ اور

قیامت کی رات کو پرتھوی ــــ جیوتی کی جیوت، اس کے جھنڈ ہار جیسے صندلی ہاتھ، اُس کا دمکتا ہوا چہرہ، اُس کی جوانی کی مدھ شالہ دیکھ کر دیوانہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

پرتھوی کی دیوانگی کا ردِّ عمل جیوتی پر کیا ہوا تھا، یہ بتانا مشکل ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ پرتھوی کی بے قرار باہوں نے جیوتی کے کسمساتے ہوئے بدن کے تار چھیڑ دیئے تھے۔ اُس کا انگ انگ حیا کے خول سے باہر آتا گیا۔ اُس کی خود سپردگی کا عالم پرتھوی کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ اور وہ یہ سمجھ بیٹھا کہ زندگی پوسٹل کلرکی کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ لیکن یہ تجربہ جلد ہی ایک حماقت ثابت ہوا۔ جیوتی، اُس کی رفیقۂ حیات، لکھے پڑھے گھرانے کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کا دادا اپنے زمانے کا مشہور شاعر واقع ہوا تھا۔ دادا کی آغوش میں جیوتی کا اپنا شعور نکھرا تھا۔ اور وہ بھگتی کے رس میں ڈوبے ہوئے شعر کہنے لگی تھی۔ لیکن اس شاعری کا رُخ اُس وقت دھیمے دھیمے بدل گیا جب پرکاش نام کے ایک کوی نے اس کے من کو موہ لیا۔ پرکاش کی شاعری زمانے کی آوازِ بازگشت تھی۔ اس میں ایک بے نام سی کسک، ایک عجیب بے قراری ملتی تھی۔ جیوتی غیر محسوس طریقے سے اس آواز کی طرف بہتی گئی۔ پرکاش نے جیوتی کو متاثر کیا۔ اور جیوتی نے پرکاش کو۔ اخباروں اور رسالوں میں دونوں کی چھپنے والی تخلیقات نے دھیرے دھیرے، ایک گمبھیر صورت اختیار کرلی۔ پرکاش کی شاعری کا جلال اور جیوتی کی نظموں کا جمال ایک نئی منزل کی نشان دہی کرنے لگا۔ جلال اور جمال کی ان پرچھائیوں نے دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا۔ عہد و پیمان ہوئے۔ اور وہ سب کچھ ہوا، جیسے دھڑکتے ہوئے دِل لے کر دو جوانیاں ملتی ہیں۔ لیکن ہونی نے اَن ہونی کر دی۔ پیار و محبت کے یہ راز سینوں سے نکل کر دوسروں تک پہنچے۔ بزرگوں نے دانتوں تلے اُنگلیاں دبا دیں۔ جیوتی کے خاندان نے جیوتی کے پیار کو خاندان کی مریادا پر قربان چڑھا دیا۔ جیوتی کے جذبات پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ پرکاش نے جیوتی کو حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ مگر تقدیر کی اندھی لکیر نے خوابوں کے دریچے بند کر دیئے۔ پرکاش، جیوتی کا ہاتھ نہ پا کر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولنے لگا۔ اس

سارے بندھ ٹوٹ گئے۔

جنگ ختم ہونے کے بعد جب حالات اعتدال پر آئے تو پرتھوی کو دفتری مصروفیات سے نجات ملی۔ لیکن اس وقت تک دو سال اور بیت چکے تھے۔ سہاگ رات کے عطر بیز لمحات کو وقت کی دھول نے برہم کر دیا تھا۔ لیکن پرتھوی ــــ جنم جنم کا پیاسا ــــ اُس کے وجود میں وہی بے قراری، وہی بے پناہ پیار، وہی پیاسی نگاہیں تھیں۔ اور جیوتی، اُس کی محبت کے سرچشمے سوکھ گئے تھے۔ مے چھلکاتی ہوئی مدھو بالا۔ خالی مینا لئے کھڑی تھی، بے حس، گونگی، زندہ لاش! پرتھوی اپنے سینے میں طوفان لے آیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اَن گنت سپنے تھے۔ اُس نے جب جیوتی کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا تو اُسے احساس ہوا کہ جیوتی زندہ لاش ہے۔ ٹھنڈا گوشت! اُس کے سپنے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ جیوتی کے پاس اب نہ مسکان تھی۔ نہ گالوں کے امری سیب اور نہ برہ کی رات کی طرح سیاہ کاجل بھری آنکھیں۔ وہاں دل کو اکھرنے والی اماوس کی سنسان راتوں کا سنّاٹا تھا۔ پرتھوی کے کانوں نے شکوک کے آوازیں سُنیں۔ اُس کی ناک نے سڑی ہوئی مچھلی کو سونگھ لیا۔ اور اُسے پہلی بار احساس ہوا کہ جیوتی کسی اور کی ہے۔ شکوک نے ضرب اور تقسیم کے فارمولے سے رشتوں کی نزاکتوں کو بھانپ لیا۔ جیوتی نے پرکاش کو رشتے کے بھائی کی حیثیت سے متعارف کرا لیا تھا۔

رشتے کا بھائی اب بیساکھی کے سہارے کبھی کبھی جیوتی کے ہاں چلا آتا۔ پرتھوی نے جیوتی کے بے رنگ خطوط کے ڈانڈے پرکاش کی بیساکھی کے ساتھ ملا دیئے ــــ خالی جگہیں خود بخود پُر ہو گئیں۔

پرتھوی کا سارا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا!

پرتھوی شاعر تھا نہ افسانہ نگار۔ لیکن جیوتی اُس کے لئے ایک آئیڈیل تھی۔ اپنے آئیڈیل کو مٹتے دیکھ کر اُس کے تصوّرات کا شیش محل ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اُس نے پوسٹل کلرکی سے مستعفی ہو کر یہیں پر دوسری ملازمت اختیار کر لی۔ اور پھر برسوں پہلے لکھی ہوئی شراب میں

ایک بار پھر اُس کا سارا جسم ایک عجیب حدّت سے تپ جاتا اور ——— اور ———

لیکن پھر جیوتی کے خطوط سے پیار کی خوشبو کم ہونے لگی۔ پھر خطوط بھی کم ہونے لگے ———

اور پھر جیوتی کی موہنی تصویر بھی بے رنگ ہونے لگی۔ پرتھوی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ پرتھوی کے طویل خطوط، پیار کی خوشبو اور بوسوں کی مٹھاس اور اندیشوں کے سایے لیے چلے آتے۔ مگر نہ کسی نے خوشبو محسوس کی نہ مٹھاس کو چکھا اور نہ ہی سایوں کو کسی نے ایک نظر دیکھا۔ پرتھوی کٹ کے رہ گیا۔ یہ سب اچانک کیا ہو گیا تھا؟ پرتھوی کے لیئے ایک سوالیہ نشان تھا۔ وہ خود حالات کا جائزہ لینا چاہ رہا تھا۔ لیکن جنگ شروع ہو چکی تھی۔ تمام قسم کی چھٹیاں منسوخ ہو چکی تھیں۔ اور پرتھوی اور جیوتی کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

جیوتی ——— جیوتی کا اندر پھر زندہ ہو گیا تھا۔ وہ اندر، جس پر اُس نے خاندان کی مریادا کی خاطر باہر کا غازہ تھوپ دیا تھا۔ اور روایتی قدروں کا غلاف اوڑھ لیا تھا۔ اپنے اندر کی آواز اور خواہش کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اور باہر کا جسم، اپنی تمام جنسی کشش کے سمیت پرتھوی کے سپرد کر دیا تھا۔ وہی اندر ایک بار پھر بیدار ہو چکا تھا۔ چند ماہ پہلے اُسے ایک اذیت ناک خط ملا تھا۔ کسی سہیلی کی معرفت پرکاش کا خط۔ پرکاش نے جیوتی کی شادی کے بعد خود بھی ڈیرہ دون جا کر شادی رچالی تھی۔ ایک چھوٹا سا گھر بسا لیا تھا۔ اُسے ایک اچھی مُلازمت ملی تھی۔ جیوتی اب اُس کے لئے محض ایک چھلاوہ تھی ——— ایک جھوٹ! لیکن تقدیر کے اندھے ہاتھوں نے اُسے ایک اور ڈگر پر پھینک دیا۔ ایک رات کسی دوست کے گھر سے اپنی بیوی سمیت واپس آ رہا تھا کہ اُس کا سکوٹر ایک گاڑی کی زد میں آ گیا۔ اس حادثے میں بیوی شدید مجروح ہوئی اور آخر ہسپتال میں جان بحق ہو گئی۔ خود پرکاش کی ایک ٹانگ ناکارہ ہو گئی۔ چند ماہ ہسپتال میں رہنے کے بعد وہ اپنے وطن واپس لوٹ آیا ——— جہاں جیوتی رہتی تھی ——— چھلاوہ! لیکن جب جیوتی کو یہ دل دوز خبر ملی تو دُنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی ——— پرکاش کی حالت اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اُس کا پرابشچیت تار تار ہوا۔ اور ضبط کے

سواگت کرتی۔ وہ جیوتی کی طرف جام بڑھا دیتی۔ اور جب جیوتی انکار کرتی تو وہ اُس کی بوٹی بوٹی کاٹ لیتا۔ مار مار کر اُس کے بے رنگ چہرے کو لال کر دیتا۔ بالوں سے گھسیٹ کر لہولہان کرتا۔ قہقہے مار کر چلّاتا اور چلّا کر رونے لگتا۔ یہ اُس کی دیوانگی تھی، انتقام کا شدید جذبہ تھا، یا محض اُس کی سادیت پسندی تھی ——— کون جانے؟ اور آخر ایک دن جیوتی نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ اور پرتھوی کا ساتھ دینے لگی۔ یہ اُس کی تپسیا کی ایک نئی منزل تھی!

پرتھوی ایک بار پھر شکست کھا چکا تھا!

جیوتی اب ایک خزاں زدہ چنار تھی۔ جس کے پتّے سرسراتے ہوئے گر چکے ہوں۔ اُس کی کتابِ زندگی کی پہلے حصّے پر موٹے حروف میں پرکاش لکھا ہوا تھا۔ پرکاش کی کٹی ہوئی ٹانگ اُس کی رُوح کا سب سے بڑا گھاؤ تھا۔

دوسرے حصّے کے آغاز میں پرتھوی لکھا ہوا تھا۔ جس کی تپسیا اُس نے دیوداسیوں کی طرح کی تھی۔ جس سے اُسے بے پناہ ہمدردی تھی اور جس کے لئے اُس نے زندگی میں کئی ویرانیاں مول لی تھیں۔

آخری حصّے پر جیوتی کا اپنا نام تھا ——— پرکاش کی جیوتی۔ پرتھوی کی جیوتی! کوکھ جلی، بانجھ جیوتی ——— صرف جیوتی!

اور پھر ——— پرتھوی کا کمرہ مے کدہ بن گیا۔ پرتھوی کی "بے خودی" کے لئے شراب کے تقاضے بڑھتے گئے۔ گھر میں نحوست نے ڈیرہ جما لیا۔ مکان گروی میں چلا گیا۔ گھر کا سامان بکنے لگا۔ پرتھوی نے شوقِ مے نوشی کو پورا کرنے کے لئے کون سی کسر باقی رکھ چھوڑی ——— عیاش، ہوس پرست، اور سیاہ کار اُس کے دوست بن گئے ——— پرتھوی نے جیوتی کو اُن کے سپرد کرنا چاہا۔ شرابِ کی ایک نشیلی شام کے لئے دیوداسی کو

میں پناہ لی۔ بے پناہ شراب۔ "ایک گونہ بے خودی" کی تلاش! ماں نے اُسے روکنے کی
کوشش کی۔ لیکن بے سود۔ جیوتی سے اُسے نفرت ہوگئی اور وہ سارے تعلقات جو ایک
بیوی اور شوہر میں ہوا کرتے ہیں، منقطع ہوگئے۔ جیوتی اس بھری دُنیا میں بے بس ہو کے
رہ گئی۔ پرکاش حالات کے تھپیڑوں کی مار کھا کر اپنے بھائی کے پاس کلکتے چلا گیا۔ جیوتی کو
ہوش آیا تو جہلم میں کافی پانی بہہ چلا تھا۔ اُس کے پاس اب بھاگیہ کی ٹیڑھی ریکھائیں تھیں،
غیر متوازی ریکھائیں، جو ہمیشہ کسی نقطے پر ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔ اُس نے ایک دیوداسی
کی طرح پرتھوی کی پوجا کر کے اُس کے من کو موہ لینا چاہا۔ لیکن پرتھوی پتھر کی مورتی میں ڈھل
چکا تھا۔ بے نیاز، کٹھور اور بے جان!

وقت سسکیاں لیتا ہوا آہستہ خرامی سے بہتا گیا۔ جیسے صدیاں بیت گئی ہوں!
جیوتی اور پرتھوی کی زندگی کسی سمجھوتے کے بغیر گذرتی گئی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے دونوں
میں کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس بیچ پرتھوی کئی بار سخت بیمار ہوا۔ جیوتی نے پرتھوی کی صحت
یابی کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ دن اور رات ایک کر دیئے۔ اور اپنے زیور بیچ کر اس کا علاج
کروایا۔ پرتھوی کی صحت سنبھلی۔ مگر اُس کے دل میں اٹکی ہوئی پھانس نہ نکل سکی۔ روز
روز کے جھگڑوں کی ستائی ہوئی بوڑھی ماں حسرتوں کے مزار سینے میں چھپائے پرلوک سدھاری
اپنی زندگی میں دادی نہ بن کر اُس نے عافیت اسی میں جان لی کہ رام نام جپتے ہوئے آنکھیں
موندی جائیں! اُسے دُکھ تھا کہ پرتھوی نے نہ صرف یہ کہ جیوتی پر ظلم کیا ہے بلکہ خود اپنے
آپ کو بھی قتل کئے جا رہا ہے۔ لیکن پرتھوی رندِ بلانوش بن چکا تھا۔ ماں کی موت سے
اُس کا ذہنی توازن اور بھی بگڑ گیا ——— اُس نے بے تحاشا پینا شروع کر دیا۔ شام ڈھلتے
ہی پرتھوی کے کمرے کی کھڑکی کھل جاتی اور ساغر و مینا کا دور شروع ہو جاتا۔ پرتھوی کبھی
کبھی جلتی ہوئی آنکھوں سے جیوتی کی طرف دیکھتا۔ اُس کی آنکھوں میں شیطانی قہقہے
تھرک اُٹھتے۔ وہ بانہیں پھیلائے جیوتی کی طرف بڑھتا۔ جیوتی بال بکھرائے اُس کا

ڈی لائٹ تھیٹر سے گھر تک

عبد الغنی شیخ

ایک ہفتہ کے بعد جب مطلع صاف ہونے پر ہوائی جہاز آیا تو ڈی لائٹ تھیٹر میں نئی فلم آئی۔ لیہہ قصبہ میں نئی فلم پہنچنے کی خبر آناً فاناً پھیل گئی۔ مجھے میرے چھ سالہ بچّہ نے یہ خبر ہی نہیں لائی بلکہ میرے شانوں سے جھولتا ہوا فلم دِکھلانے کے لئے ماں کی فرمائش بھی لائی۔ لیہہ میں یہ اکلوتا سینما ہال ہے جسے چند سال پہلے ایک مقامی آدمی نے قائم کیا ہے۔ اس دوران میں آٹھ دس ہزار نفوس کی آبادی کے اس قصبے میں بفضلِ فلم ان گنت فلمطلے، درجن بھر ماہرینِ فلمیات، اور چار پانچ جیب کترے اور اُچکّے معرضِ وجود میں آئے ہیں۔

میں اپنے بچّے کے ساتھ فلم دیکھ رہا تھا۔ میری بغل میں بچّے کی ماں گود میں بچّے کو لئے بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ لگی سیٹ پر چچی زلیخا اپنی سات سالہ بچی نیلو کو لئے فلم دیکھ رہی تھی۔ سکرین پر فلم اداکار پران نمودار ہوا۔ میرا بچّہ ماں سے مخاطب ہو کر بولا:۔

بلیدان چڑھانا چاہا۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے جیوتی کی عصمت دری سے لذت لینا چاہی
اور دسمبر کی اسی کالی اور بھیانک رات کو پرتھوی کے کمرے کی کھڑکیاں پھر اسی طرح کھلی
تھیں۔ اُس کے خوابوں کے دریچوں کی طرح ———— خوابوں کے یہ دریچے جیوتی کے من
میں بھی کھُل کر بند ہو گئے تھے ———— لیکن آج وہ کسی کو بُلا رہی تھی!

کس کو ؟

پرکاش کو ———— تاکہ وہ کرشن بن کر دروپدی کی لاج بچائے یا پھر کسی غیر مرئی
طاقت کو؟ ———— یا پھر اپنے آتم بل کو ———— ؟ وہی سیاہ دراز بال، وہی
انگڑائیاں لیتا ہوا کافر شباب، وہی مست آنکھوں کے جام ———— اور جب پرتھوی
کے چند عیّاش ساتھی، نشے میں دُھت، جیوتی کے جسم کو ہانپتے ہوئے نوچنے لگے تو ————
جیوتی کا جسم ٹھنڈا تھا، دسمبر کی اسی کالی رات کی طرح یخ بستہ!

"نہیں!"

"کیا پلاان سے ڈرو گے؟"

"نہیں!"

"ہونھ!"

اگر پلاان چھلی لے کر آئے تب بھی نہیں ڈرو گے؟"

"تب بھی نہیں ڈروں گا!"

بچّے کی پتلی حیرت سے پھیل گئی اور کچھ توقف کے بعد بولا:

"اگر پلاان چھلی لے کر آئے گا تو لیہہ کے شالے لوگ نہیں ڈریں گے؟ "نہیں ڈریں گے؟"

بچہ یک لخت ہوشیار ہوا' اور پوچھا:

"ابّا! کیا تم دالا سنگھ سے بھی نہیں ڈرتے؟"

"میں دارا سنگھ سے بھی نہیں ڈرتا!"

"ہونھ!" بچّے کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ طنز آمیز مسکراہٹ آئی۔

"کیوں ہنستے ہو؟" میں نے پوچھا۔

بچّے نے اپنی چھنگلی دکھلاتے ہوئے کہا۔ "دالا سنگھ تمھیں یوں کچل دے گا۔ یوں۔"

نیم تاریک ہال میں، میں نے دیکھا کہ بچہ اپنی چھنگلی کو ہتھیلی پر گھما رہا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ بولا: "ابّا! کیا غنشوم دالا سنگھ بھی طاقت ول ہے؟

کیا محمد علی کلے سے بھی طاقت ول ہے؟"

مجھے بچّے کے سوالات کا کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

"کیسر سے بھی طاقت ول ہے؟"

کیسر لداخ کا روایتی ہیرو اور ایک مشہور اور طویل داستان کا مرکزی کردار ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ بڑی چٹان گھومنے لگی جو دور سے ایک دیو ہیکل مخلوق کے ہاتھ کی طرح

"اب سٹوری میں مزا آئے گا!"

"ہونھ!" ماں نے کوئی دھیان نہیں دیا۔

فلم کی سٹوری جیسی بھی تھی، چھ سالہ بچے کی زبان سے "سٹوری" کا لفظ سن کر مجھے لطف آیا۔

"امی!" بچے نے ماں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو، امی پلان (پران) آیا ہے۔"

"کون پلان؟" ماں نے سادگی سے پوچھا۔

"ہونھ!" پلان کو تم نہیں جانتی؟" بچے کے لہجہ میں حیرت تھی۔ "تم دیکھو گی امی۔ اب پلان اور ہیلو میں خوب لڑائی ہوگی۔"

ادھر بچہ یہ کہتا ہے، ادھر پردہ سکرین پر گھونسہ بازی، دھینگا مشتی اور چھرا زنی شروع ہوتی ہے۔

بچہ اداکاروں کے غلط ملط نام لینے لگا۔

"وہ ممتاش ہے۔ راجندل کمال ہے۔ جانی واکل ہے ... ..."

ماں اوں آں کر رہی تھی اور بچہ تتلی زبان میں اناپ شناپ فلم کی کہانی سنا رہا تھا۔

"اب چپ بھی رہو!" ایک بار ماں نے تنک کر کہا۔

ایک اڑن کھٹولہ ہیروئن کو لئے سپید بادلوں کی طرف اڑنے لگا۔

"وہ دیکھو اڑن کھٹولہ!" ماں نے بچے کو چپ کراتے ہوئے کہا۔

بچہ اڑن کھٹولے سے متعلق ماں سے سوالوں کی بوچھاڑ کرنے لگا۔

ماں نے تنک کر ڈپٹ پلائی اور بچہ خاموش ہوا۔ ماں سے اکتا کر اب وہ میری گود میں آیا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بت بنا فلم دیکھتا رہا۔ پھر اچانک مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ابا! کیا تم شیخ مختاں سے ڈرو گے (ڈر گے)؟"

پر ایک سخت گھونسہ رسید کیا ہو۔ لیکن چند لمحوں کے بعد وہ سنبھل گیا اور تیزی سے عقاب کی طرح جھپٹا۔ ڈیشوں! ڈشّم! ڈیشوں! ڈشّم!

نیلو کے چہرے کے اِرد گرد مُکّوں کی ہوائی بارش ہونے لگی۔ میری بیوی نے مجھے اور میں نے بیوی کی طرف غصّے سے دیکھا۔

"میں آپ سے کہتی تھی کہ اس کو ساتھ نہ لاؤ۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

گھر کے آنگن میں نیلو نے تاؤ میں آکر ڈشّم کہتے ہوئے سچ مچ کا ایک گھونسہ بچّے کے مُنہ پر جڑ دیا۔

بچّے کی آنکھوں میں آنسو آئے اور اس کا گول مٹول چہرہ سرخ ٹماٹر کی طرح تمتما اُٹھا۔ نیلو میرے سامنے بھاگ آئی۔ بچّہ، جو چچی زلیخا کے ہاتھوں کی گرفت میں کسمسا رہا تھا، یک لخت چھوٹ گیا۔ نیلو مجھ سے چمٹ گئی لیکن بچّہ نیلو اور میری طرف آنے کے بجائے کچن میں گھس گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھاجی ترکاری کاٹنے کی چھری تھی۔

"میں نیلو کو جھُلّی مالوں گا!"

بچّے نے چھری ہوا میں لہرائی۔

O

نظر آتی ہے اور کیسر کا ہاتھ کہلاتی ہے۔

ننّھے کا دھیان فلم سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے ننّھے سے کہا: "اگر تم چُپ چاپ فلم دیکھو گے تو میں تمھیں کل کیسر کا ہاتھ دِکھلانے لے چلوں گا!"

بچّہ خاموش ہُوا۔

پھر سکرین پر ایک ننّھی اداکارہ ناچنے لگی۔ بچّہ چِلاّ اُٹھا:

"ابّا! وہ للکی (لڑکی) کون ہے؟"

"سُنیتا!"

"شُنیتا؟"

"ہاں!"

اُس دِن بھی وہ للکی تھی، جب جب ... ... ننّھے کے دانت کھٹکھٹانے لگے۔ ہلان کو میلو (ہیرو) نے وہ مارا، وہ مارا۔" یہ کہتے ہوئے ننّھے نے میری ناک کو نشانہ بنایا اور میں تلملا کر اپنی ناک کے بانسے کو سہلانے لگا۔ سامنے نشست پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے ہماری طرف غصّے کی نظروں سے دیکھا۔

فلم دیکھ کر جب ہم سینما ہال سے باہر نکلے تو ننّھے نے چِلاّ کر کہا: "نیلو! میں تم سے شادی نہیں کلوں گا!"

"ارے کیوں؟" خالہ پُوچھنے لگی۔

"میں شُنیتا سے شادی کلوں گا!"

"میں تم سے شادی نہیں کلوں گی؟" نیلو غصّے سے چِلاّئی۔

"ڈِیشوں" کہتا ہوا ننّھے نے نیلو کے مُنہ کے سامنے اپنا ننھّا مُکّا زور سے لہرایا۔ نیلو ماں سے چمٹ گئی۔ بچّہ دوبارہ "ڈیشوں ڈیشوں" کرنے لگا۔ نیلو نے بھی "ڈیشوں" کہہ کر ننّھے کے سینے پر اپنا ہوائی مُکّا لہرایا۔ ننّھے نے ایک لمبی آہ بھری اور یُوں لڑکھڑایا، گویا کسی نے اس کے مُنہ

اندر دل اور جگر نکالنا چاہتا ہوں۔ ضرورت پڑی تو اُس کا سر پھوڑ کر اس کا بھیجا بھی نکال دوں گا ——، میں اپنا بھی دل و جگر نکالوں گا اور اُس شخص کے دل و جگر کے ساتھ اُس کا موازنہ کروں گا جس شخص کے پاس خودکشی کرنے کا پختہ ارادہ ہے۔ جو کسی بھی وقت اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے اس ارادے پر عملی جامہ پہنا سکتا ہے!

جب سے میں نے ہوش سنبھالا، میں نے کتنی بار خودکشی کرنے کا ارادہ کیا مگر میری بزدلی میرے اس ارادے میں اکثر رکاوٹ بن جاتی تھی۔ ہر بار خودکشی کے ارادے کو ٹال کر میں سوچنے لگتا، وہ کون لوگ ہیں جو اس ارادے پر عمل کرتے ہیں۔ ان کا دل و جگر کتنا سخت ہے جو اپنے آپ کو دریا میں ڈبو دیتے ہیں۔ پہاڑ کی اونچائی پر سے چھلانگ لگا دیتے ہیں، ریل کی پٹڑی پر سو کر اپنے آپ کو کٹوا دیتے ہیں، زہر کھا لیتے ہیں یا اپنے آپ کو گولی سے اُڑا دیتے ہیں۔ اور اُس زندگی کا خاتمہ کرتے ہیں جو زندگی ... ، زندگی تو میرے لئے بھی ایک وبال ہے ایک مصیبت ہے۔ پھر میں خودکشی کیوں نہیں کر لیتا، میں اس ارادے کو پایۂ تکمیل تک کیوں نہیں پہنچا سکتا، مجھے اس جہنم میں جینے کے لئے کون مجبور کر رہا ہے۔ وہ کون سی شکتی ہے جو مجھے مرنے نہیں دیتی؟

بلوارڈ روڈ کے راشن گھاٹ پر راشن لانے کے لئے جب میں گھر سے نکلا تو راستے بھر چلتے ہوئے میں نے کتنی بار اُس جیب پر ہاتھ پھیر دیا جس میں اُدھار کے روپے رکھے ہوئے تھے۔ راشن کے لئے مجھے اکثر روپے قرض پر لانے پڑتے تھے۔ قلیل تنخواہ کی وجہ سے گھر کا گزارہ ... ، قرض کے بڑھتے بوجھ نے مجھے لاغر کر دیا۔ ضروریاتِ زندگی پورا کرنے اور قرض سے چھٹکارا پانے کی فکر سے میرا ذہن اکثر پریشان رہنے لگا۔ غم، پریشانی اور مصیبت میرا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ اور ان ہی فکروں میں گھل کر میں راشن لانے جا رہا تھا کہ میرے سامنے رشید کی آسمانی رنگ کی کار گزر گئی۔

رشید میرا کلاس فیلو تھا۔ ہم دسویں جماعت تک ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ مجھے یاد ہے

چھٹکارا

شبنم قیوم

اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا میں بلوارڈ کی طرف جا رہا تھا۔ آسمانی رنگ کی کار پر نظر پڑتے ہی میرے وجود میں ایک جھٹکا سا لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کار بڑی تیزی سے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کار کو رشید خود ہی چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ سیٹ پر اس کے دونوں بچے وردیوں میں ملبوس تھے۔ معمول کی طرح رشید انھیں کانوینٹ چھوڑنے جا رہا تھا۔ اور میں ..... میں اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنے آپ کا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے اندر حسد تلاطم پیدا کر رہا تھا۔

میں نے اس حسد کو اپنے سینے میں آرام سے بیٹھنے کو کہا اور خود میں ..... یکایک مجھے اُس شخص کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوگئی جس کے پاس خودکشی کرنے کا پختہ ارادہ ہے۔
دراصل مجھے اس شخص کی کوئی ضرورت نہیں، البتہ میں اس کا پیٹ چاک کر کے اس کے

سامنے سے گزرا۔ اور میرے لئے حسد، رشک اور نہ جانے کیا کیا چھوڑ کر چلا گیا۔

میں نے بائیں جانب دیکھا۔ رشید اور اس کی کار کا بڑی سڑک پر کوئی نشان باقی نہیں رہ گیا تھا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، گویا یہ کار میرے ارمانوں کا دھواں اڑا کر ابھی ابھی لوٹ کر آئے گی ——— میں اس سڑک پر کھڑے کھڑے اپنے اور رشید کے ماضی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا ——— نہ جانے کیا ہ؟

مجھے لمحہ بہ لمحہ اپنے وجود سے نفرت ہو رہی تھی، جو وجود سوائے قرض کے زندگی میں کچھ بھی حاصل نہیں کر سکا۔ یکایک میرا ایمان متزلزل ہونے لگا۔ کاش! رشید کی طرح میں نے بھی چرس کا کاروبار کیا ہوتا۔ کاش! میں نے بھی ... ... مگر اب کیا ہو سکتا ہے!

سوائے خودکشی کے اب اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میرے اندر کے حسد اور رشک نے میرے اس ارادے کو پختہ کرنے کا کام کیا۔ اب کی بار میں مصمّم ارادہ کر کے آگے بڑھا اور ایک جست لگا کر کنارے آ گیا۔ میں نے ایک بھرپور نظر سے جھیل کو دیکھا۔ جس میں ہاؤس بوٹ قطار سے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھڑے تھے۔ ان ہاؤس بوٹوں میں سیّاح بیٹھے میرے اس کشمیر کی خوب صورتی کا لطف اٹھا رہے تھے جس کشمیر کا ایک ایک انگ مجھے بدصورت اور گھناؤنا نظر آ رہا تھا۔ جھیل میں ٹیکسی شکارے تھرک رہے تھے اور اس میں بیٹھے ہوئے لوگ اس جھیل کا نظارہ دیکھ رہے تھے جس جھیل میں ڈوبنے کے لئے میں اپنے آپ کو بالکل تیار کر کے بیٹھا تھا۔ میں مکمّل ارادہ کر کے وہ جگہ ڈھونڈ نکال رہا تھا جہاں پر میں چھلانگ لگا کر اس زندگی کا خاتمہ کروں جس زندگی نے مجھے پل بھر کے لئے بھی سکون نہیں دیا۔

خودکشی کرنے سے پہلے، سب سے پہلے میں سوچنے لگا۔ اگر اس وقت کوئی بھکاری یہاں سے گزرتا تو میں راشن کے یہ سارے روپے اس کے حوالے کر دیتا، ورنہ پانی میں یہ روپے اسی طرح ضائع ہو جائیں گے جس طرح میرا وجود ضائع ہو جائے گا۔ حالانکہ میرا وجود تو بالکل ناکارہ ہے۔ اس کے مقابلے میں میرے پاس جو یہ روپے ہیں، بہت قیمتی ہیں!

دسویں میں مسلسل تین سال تک فیل ہوجانے کے بعد اس نے پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ میں پہلے ہی سال سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ ایف، اے کرنے کے بعد میں کلرک بن گیا اور رشید . . . . . ، رشید کو لکھنے پڑھنے کے ساتھ خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسکول میں یہ اکثر غائب رہتا تھا۔ اس کے کپڑے اکثر میلے کچیلے ہوتے تھے۔ غریب والدین کا بیٹا اکثر کتابوں، کاپیوں کے لئے ترستا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ کو اس کے لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ مگر رشید ان کے ارمانوں کے ساتھ کھیل کر دربدر پھرا کرتا تھا۔ اسکول میں اس کے دل نہ لگنے کی ایک وجہ اس کی غربت بھی تھی۔ غربت کی وجہ سے رشید اکثر کلاس میں کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکوں کی ہنسی مذاق کا نشانہ بنتا تھا۔ مجھے یاد ہے، کلاس میں ایک لڑکا میں تھا جو اس کا حوصلہ بڑھاتا تھا۔ ہر وار کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کی ہمت بڑھاتا تھا۔ نہ صرف کلاس میں اسے میں اپنے پاس بٹھاتا تھا بلکہ اس کے لئے قلم کاغذ وغیرہ فراہم کرتا تھا۔ پانچویں سے لے کر دسویں جماعت تک، میں نے اسے اپنی کئی کتابیں پڑھنے کو دی تھیں۔

رشید کے ساتھ اگر مجھے ہمدردی تھی تو محض اس وجہ سے کہ وہ غریب اور مفلس ماں باپ کا بیٹا تھا۔ حالاں کہ رشید جیسا احسان فراموش میں نے آج تک کوئی نہیں دیکھا۔ اس کی سیمابی طبیعت تخریبی ذہنیت دیکھ کر میں اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا تھا۔ لیکن چند روز کے بعد اس کا احساس کمتری دیکھ کر مجھے اپنی حرکت پر خود ہی ندامت ہونے لگتی تھی۔

میٹرک میں مسلسل فیل ہوجانے کے بعد جب اس نے پڑھائی چھوڑ دی تو اسے گگری بل روڈ پر ایک فرم میں معمولی نوکری مل گئی ؛ جو اس نے غنیمت جان کر قبول کرلی۔ اس نوکری کے دوران اسے کشمیر سے باہر جانے کا موقع ملا ——— ، رشید مالک کا مال لے کر باہر جاتا تھا اور وہاں سے روپے لے کر واپس آتا تھا۔ اس آؤ جاؤ نے اسے ایک تجربہ کار مرد بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا علیحدہ بزنس شروع کیا۔ دس بارہ سال کے اس بزنس میں نہ صرف اس نے اپنے لئے ایک نئی کوٹھی بنوائی بلکہ ایک قیمتی کار بھی خریدلی۔ آج دوبارہ وہ اسی کار میں میرے

نہ تا ؤ، بڑی تیزی سے سڑک پار کر رہا تھا کہ یکایک میں ... ... میں آسمانی رنگ کی ایک تیز رفتار کار کے نیچے آکر کچل کر دم توڑنے لگا!

خودکشی کے لئے بالکل تیار ہو کر میں نے آنکھیں بند کرلیں کہ یکایک مجھے خیال آیا ـــــ

"میری بیوی بچے کیا کریں گے ـــــ؟"

بیوی بچوں کی یاد آتے ہی میرے وجود میں زلزلہ سا آگیا۔ اور میں ... میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ دل ڈوبنے لگا اور آنکھیں ... میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرا یہ پختہ ارادہ متزلزل سا ہو گیا۔

مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کی حالت کا ایک دُھندلا سا عکس میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے لگا اور میں اپنے آپ کے قاتل کے ساتھ ساتھ بیوی بچوں کی حالت کا ذمہ دار بن کر اپنی ہی نظروں میں قابلِ نفرت اور ملامت بننے لگا۔

میرے بغیر میری بیوی اور بچوں کی مجبوریاں میرے اس ارادے میں ضرور رکاوٹ بننے لگیں۔ میں تھوڑی دیر کے لئے سوچنے لگا۔

'میری بیوی، جس نے کبھی بھی کسی کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ بھوکی ہے، میرے بعد بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر نہ جائے۔ میرے بچے میرے بعد بھیک مانگنے پر مجبور نہ ہو جائیں ـــ، لہٰذا مجھے اس حالت پر ہی قناعت کرنا چاہیئے۔ مجھے خدا پر بھروسہ کر کے آگے بڑھنا چاہیئے، مجھے زیادہ محنت کرنی چاہیئے۔ کبھی نہ کبھی ہمارے یہ بُرے دن دُور ہو جائیں گے۔ گھٹا ہمیشہ نہیں رہتی، مجھے عزم، ہمت اور حوصلہ سے آگے بڑھ کر غربت اور ناداری کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے۔ خودکشی بزدلی ہے۔ مجھے ایسی بزدلی کا خیال بھی ذہن میں نہیں لانا چاہیئے!"

اتنا کچھ سوچ کر میں واپس مڑ گیا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ میرے چلنے کا انداز اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اب میں غربت اور مفلسی کو بھگاتے ہی دم لوں گا۔ میں ایک نئے ولولے، نئے عزم اور ہمت کے ساتھ خوشحال مستقبل کی طرف اس انداز سے بڑھ رہا تھا کہ زمین پر میرے پاؤں پڑتے ہی نہیں تھے۔ میں اس وقت خوشی اور مسرت سے اس طرح سڑک پار کر رہا تھا، گویا میں نے کوئی عظیم معرکہ سر کر لیا تھا۔ میں آؤ دیکھا

بمبئی دیکھنے کا شوق ہے۔ میں تمھارا یہ شوق پورا کروں گا۔ خوش قسمتی سے میں آج کل زیادہ مصروف بھی نہیں ہوں ــــ اسلم اور فریدہ کی بھی چھٹیاں ہیں۔ لہٰذا تمھیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلم اور فریدہ نے ایک ماہ کے لئے تمھارا پروگرام پہلے ہی تیار کر رکھا ہے۔ اب کسی اچھے لڑکے کی طرح سو جاؤ۔ صبح تمھیں اسلم باندرہ لے جائے گا۔"

پہلے ہی دن شام کا کھانا کھانے کے بعد جب عزیز بھائی یوسف کا سر تھپتھپا کر باہر چلے گئے تھے تو یوسف کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اور اُسے اپنے باپ پر بے حد غصّہ آیا تھا۔ اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ ابھی، اسی وقت یہاں سے کہیں اور چلا جائے! اُس کی اٹیچی میں وہ پانچ سو روپے بھی تھے جن کا علم نہ اُس کے باپ کو تھا اور نہ عزیز بھائی کو۔ یہ پانچ سو روپے اُس کی ماں نے اُسے الگ طور سے دیئے تھے۔ لیکن وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ پچھلے تین برس سے وہ منت سماجت کرتا چلا آرہا تھا کہ اُسے بمبئی گھومنے کے لئے بھیج دیا جائے اور اُس کا باپ بڑی مشکل سے راضی ہوا تھا۔ لیکن اس شرط پر کہ اُسے بمبئی میں عزیز بھائی کے ہاں رہنا ہوگا اور عزیز بھائی کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ کرنا ہوگا۔ اُس کے باپ نے عزیز بھائی کے نام کم از کم دو درجن نجی خط لکھے تھے۔ اور ہر خط میں انھیں تاکید کی تھی کہ یوسف کو اکیلا کہیں بھی نہ بھیجا جائے۔

اور یوسف گذشتہ پندرہ روز سے برابر سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح عزیز بھائی کو چکمہ دے سکتا ہے۔ آج اُسے اُمید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آرہی تھی۔ عزیز بھائی کی سب سے چھوٹی لڑکی کی سالگرہ تھی۔ گھر میں خوب چہل پہل تھی۔ شام کو قوالی کا پروگرام تھا۔

رات کے ٹھیک بارہ بجے، جب عزیز بھائی اور اُن کے مہمان، قوالوں کے ساتھ جھوم رہے تھے، وہ چپکے سے باہر نکل آیا۔

رات جوان تھی۔ اُس نے بمبئی کی راتوں کے بارے میں جو سُنا تھا، اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ محمد علی روڈ جگمگا رہی تھی۔ بھنڈی بازار سے ہوتا ہوا جب وہ تاج سینما کے سامنے

یہ شام بھی کہاں ہوئی

عمر مجید

جس خاص مقصد کے لئے یوسف بمبئی آیا ہوا تھا وہ عزیز بھائی دروازے والا کی تکلیف دہ مہمان نوازی کی وجہ سے اب تک التوا میں پڑا ہوا تھا۔ بمبئی میں آج اُس کا پندرھواں دن تھا اور ان پچھلے پندرہ دن میں اُسے ایک بار بھی ایسا موقعہ نہ مِلا تھا جب وہ عزیز بھائی کے مکان کے دروازے سے اکیلا باہر نکل سکا ہو۔

"بمبئی بہت خراب جگہ ہے میاں۔ یہاں کی سڑکیں جس قدر صاف اور کشادہ ہیں، لوگوں کے دل اتنے ہی گندے اور چھوٹے ہیں۔"

"چاچا ——— میں بھی کوئی چھوٹا بچہ تھوڑا ہی ہوں ——— میں نے بہت دُنیا دیکھی ہے۔"

"ہاں۔ ہاں، اس میں کیا شک ہے۔ لیکن یہ مت بھولو کہ زندگی میں پہلی مرتبہ کشمیر کے باہر کا آسمان دیکھ رہے ہو۔ تمہارے کشمیر اور ہماری بمبئی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تمھیں

پندرہ برس کے بعد وہ بمبئی کے تاج سینما کے سامنے کھڑا بمبئی کے ہزاروں آدمیوں کو اپنے سامنے سے گذرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ روشنیاں اور تیز ہو رہی تھیں اور اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی میلے میں اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ہو ———

اُس روز وہ بابا رکشی کے میلے سے واپس گھر لوٹ رہا تھا۔ اپنے باپ کے مضبوط کندھے پر بیٹھ کر دس ہزار فٹ کی بلندی سے اُسے ساری دُنیا نظر آ رہی تھی۔ اُس کا باپ بار بار اُس کی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا — نہ صرف اُس کا باپ بلکہ دیودار کے ایک بہت اُونچے پیڑ کے سایے تلے بیٹھا ہوا وہ انگریزی ٹوپی والا بھی اُس کی ماں کی طرف کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یُوسف کو اُس کی ٹوپی سے زیادہ وہ کھلونا اچھا لگا تھا جو ٹوپی والا بار بار اپنی آنکھ سے لگا رہا تھا۔

"اے بابو... تصویر مت اُتارو۔"

"ہم — بمبئی کے ایک بہت بڑے میگزین کا فوٹوگرافر ہے۔ تمھاری بیوی کا فوٹو میگزین میں چھپے گا۔ کشمیر کا حُسن اکھا دُنیا کا لوگ دیکھے گا۔ اور تمھاری بیوی کو پانچ رُوپے کا ایک نوٹ ابھی ابھی ملے گا — " بزنس اِز بزنس —!"

یہ پانچ رُوپے کے نوٹ نہ جانے کیوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تصویر اُتارنے والا پانچ پانچ کے دو نوٹ دینے کے لئے تیار ہوا تھا۔ یُوسف کی ماں کی صرف ایک تصویر کے لئے۔

"ہرگز نہیں — میری بیوی کا فوٹو کسی کتاب میں نہیں چھپے گا۔ تم ایک لاکھ رُوپے ہی کیوں نہ دو — اور اگر تم نے فوٹو لیا تو ایک ٹکّے سے تمھیں بمبئی پہنچا دوں گا۔ یُوسف کی ماں ... بُرقعہ پہن لو... ..."

"نیچے — وادی کے بیچوں بیچ جہلم اطمینان سے بہہ رہا تھا۔

"ابّا — تم نے اُس بمبئی والے کو ماں کا فوٹو کیوں نہیں اُتارنے دیا؟"

پانچ ہزار فٹ نیچے آ کر جب یُوسف نے اپنے باپ سے یہ سوال پوچھا تھا تو اُس کے باپ نے

پہنچا تو اُسے اپنے دِل کی دھڑکنیں صاف سُنائی دیں ـــــ چند قدم کے فاصلے پر اُس کی

منزل تھی ـــــ صرف چند قدم کے فاصلے پر۔ لیکن یہ چند قدم اُسے زندگی کے سب سے بھاری قدم

لگ رہے تھے۔ روشنیاں ہی روشنیاں ـــــ روشنیوں کے اس سمندر میں وہ کھو سا گیا ـــــ

بظاہر وہ تاج سینما کے بڑے بڑے اشتہار دیکھ رہا تھا لیکن اُس کا ذہن جہلم کے کنارے

اُگے ہوئے سفیدوں کی چھاؤں میں بھٹک رہا تھا......

"میں بمبئی کا رہنے والا ہوں ـــــ تمھارے کشمیر میں گھومنے آیا ہوں۔" اُس آدمی کے

چہرے پر ایک کمینی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک سفیدے کے سایے میں کھڑا تھا۔ اور

حریص نگاہوں سے اُن عورتوں کو دیکھ رہا تھا جو قریب کے کھیتوں میں نرائی کر رہی تھیں،

اُن میں یوسف کی ماں بھی تھی ـــــ پانچ رُوپے کا ایک چمکیلا نوٹ یوسف کی طرف بڑھاتے

ہوئے اُس نے کہا تھا۔

"جاؤ ـــــ اُس عورت کو دے دو جس نے نیلا پھرن پہن رکھا ہے ـــــ!

"وہ میری ماں ہے۔"

"اچھا ـــــ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ دیکھو تمھاری ماں کا پھرن کتنا پُرانا اور گندہ

ہے۔ پانچ رُوپے میں وہ اپنے لئے ایک نیا پھرن بنوا سکتی ہے۔ اور پھر میں تمھیں الگ سے

ایک روپیہ دوں گا ـــــ چاندی کا ... ..."

یکایک جہلم جاگ پڑا تھا۔

یوسف کے باپ نے اس بمبئی والے کا گریبان پکڑ لیا تھا ـــــ "لفنگے، لچے، بدمعاش۔

یقیناً اس بچے کی ماں کے پاس صرف ایک ہی پھرن ہے۔ لیکن اس گندے پُرانے پھرن کے

نیچے اُس نے عزت اور غیرت کا ایک ایسا پھرن پہن رکھا ہے جو بہت قیمتی ہے۔"

اور جب وہ سیاح یوسف کے باپ کے ہاتھوں پٹ کر توبہ توبہ کرتا ہوا بھاگ رہا تھا،

تو یوسف کے ننھے ذہن میں بمبئی کے اس آدمی کے خلاف نفرت کا لاوا اُبلنے لگا تھا۔ اور آج

نگار نے لکھا تھا۔ ناول پڑھ کر وہ اور بھی دِل برداشتہ ہوا تھا۔ اپنے اُردو کے پروفیسر سے اس ناول کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے اُسے معلوم ہوا تھا کہ کشمیر سے متعلق جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے اُس میں حقیقت کم اور مبالغہ آرائی زیادہ ہوتی ہے۔

"یُوسف بیٹے۔ یہ لوگ پیسے کے لئے ہمارے کشمیر کو بیچتے ہیں۔ یہ لوگ بمبئی کے عالی شان ایئر کنڈیشنڈ فلیٹوں میں بیٹھ کر ہمارے کشمیر کے متعلق اور لکھ بھی کیا سکتے ہیں۔ وہی عشقیہ داستانیں۔ ان کی نظر میں کشمیر کی ہر عورت کی قیمت، پانچ رُوپے ہے۔ انھیں یہاں کی بھوک، بیماری، جہالت اور ناداری کیسے نظر آسکتی ہے۔"

ایک تیز رفتار گاڑی کے تیز ہارن نے اُسے چونکا دیا۔ تاج سینما کا آخری شو ختم ہو رہا تھا اُس نے اپنی جیب ٹٹولی ... ...

"پانچ سو رُوپے ... ... میں بمبئی کی کم از کم ڈھائی ہزار عورتیں خرید سکتا ہوں ... ... وہ آگ، جو میرے دِل کے کسی کونے میں، رُوح کے کسی حصّے میں لگی ہوئی ہے، کچھ تو کم ہو سکتی ہے"

اُس کے نتھنے پھولنے لگے ... وہ آگے بڑھا ...

سالونی سی اُس عورت نے بے حد مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کے سینے کی لکیر تو واضح طور نظر آرہی تھی۔

"کیا تم بمبئی کی رہنے والی ہے؟"

وہ بڑی بے حیائی سے ہنس پڑی اور پھر بولی:

"بابو — اکھا بمبئی میں اپن بمبئی کا خالی عورت ہے۔"

"اس بازار میں بمبئی کی اور کتنی عورتیں ہیں؟"

"بابو ... سب بمبئی کی عورتیں ہیں۔ اس بازار میں جو بھی عورت آتی ہے وہ بمبئی والی ہو جاتی ہے —"

عین اسی لمحے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

اُسے اپنے کندھے سے اُتارتے ہوئے کہا تھا :-

"بیٹے ہم شریف آدمی ہیں۔"

"ابّا شریف آدمی کیا ہوتا ہے ؟"

"شریف آدمی۔ شریف آدمی ہوتا ہے۔ تصویریں لینے والا آدمی شریف آدمی نہ تھا۔"

"شریف آدمی۔ یُوسف نے اُس وقت اپنے ذہن پر بہت زور دیا تھا لیکن وہ نہ سمجھ سکا تھا کہ شریف آدمی کیا ہوتا ہے ــــــ اور آج بمبئی کے تاج سینما کے سامنے کھڑا وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ خود ایک شریف آدمی ہے۔ لیکن پچھلے پندرہ برس سے شرافت اور کمینہ پن کی تجربہ گاہوں میں اُس نے جب بھی اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی تھی تو اُسے اپنے اندر ہر جگہ آگ ہی آگ نظر آئی تھی ــــــ نفرت کی آگ ــــــ اپنے شہر کی کسی سڑک پر جب بھی وہ کسی بمبئی والے سیّاح کو دیکھتا تو یہ آگ اور تیز ہو جاتی ــــــ

کالج کے پہلے سال میں اُسے معلوم ہوا کہ نہ صرف بمبئی کے مرد بلکہ بمبئی کی عورتیں بھی خراب ہوتی ہیں۔ بمبئی کی عورتیں پانچ رُوپے کے ایک نوٹ میں رات بھر کے لئے خریدی جا سکتی ہیں۔ وہ لمبے لمبے بُرقعے نہیں پہنتیں۔ وہ بڑی خوشی سے اپنی تصویریں میگزینوں میں چھپواتی ہیں۔ فوٹو کھنچواتے وقت وہ جس قدر کم لباس میں ہوں، انھیں اسی قدر زیادہ پیسہ ملتا ہے ــــــ !

چند قدم ــــــ صرف چند قدم ــــــ چند قدم کے فاصلے پر اُس کی منزل تھی ــــــ راستہ صاف تھا۔ روشنیاں تیز تھیں۔ اس قدر تیز کہ سامنے والی کتابوں کی دُکان میں لٹکے ہوئے رسالوں کے نام بخوبی پڑھے جا سکتے تھے۔ کتابیں اُس کی سب سے بڑی کمزوری تھیں ــــــ اُس دُکان میں تو سب کچھ نظر آ رہا تھا ــــــ مذہب، سیاست، تاریخ، سیکس، نفسیات، فلم، ادب ... وہ دوبارہ کھو گیا۔ اپنے کالج کی لائبریری کے پُرسکون ماحول میں وہ اسی طرح کھو جایا کرتا تھا۔

اُس ناول کا نام ــــــ "کشمیر کی کلی" تھا۔ وہ بمبئی کے ایک مشہور و معروف ناول

عمارت

شمس الدین شمیم

وہ خوب صورت عمارت بڑی مشکل سے میرے ہاتھ آئی تھی۔

جسے حاصل کرنے سے پہلے میں نے کئی بار سوچا تھا کہ یہ خوب صورت عمارت حاصل کر کے مجھے کچھ نہ ملے گا بلکہ مفت میں رسوائی ہوگی۔ مجھ پر انگلیاں اٹھیں گی اور میں ہر لمحے پسینے سے شرابور تاریک گلیوں سے چوری چھپے اس عمارت میں آتا جاتا رہوں گا۔ میں بے حد پریشان تھا! میرے بہت سے دوستوں نے عمارت کا قصہ سن کر مجھے پیچھے ہٹنے کے لئے کہا۔ میں نے نہیں مانا۔ جس کی وجہ سے وہ اس عمارت کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھ کر تھوکنے لگے!

"طاہر! یہ عمارت باہر سے جتنی سندر لگتی ہے، اندر سے اتنی ہی کالی ہے!"

"طاہر بھیا! ہٹو پیچھے۔ یہ عمارت سوکر میاں کے قبضے میں کافی مدت تک رہی، پھر اس کے ہاتھ سے بھی نکل گئی۔"

"جلدی کرو — بابو۔ ہم تین عورتوں کے پاس ایک ہی کمرہ ہے۔ بمبئی میں عورت جتنی سستی ہے، رہنے کے لئے جگہ اتنی ہی مہنگی ہے۔"

"کیا وہ دونوں تمہاری طرح بمبئی کی عورتیں ہیں؟"

"ہاں، کیوں؟"

"بلالو انھیں بھی اندر — میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

وہ کچھ سوچتے ہوئی اُٹھی اور دروازہ کھولا۔

مدھو، رضیہ، اندر آؤ۔ اس سالے کا مغز پھر گیا ہے۔"

اُن دونوں کا رنگ گورا تھا۔ بے حد گورا۔ یوسف نے پانچ پانچ روپے کے دو نوٹ اُن کی طرف بڑھائے۔

وہ دونوں کھِل کھِلا کر ہنس پڑیں۔ پھر اُن میں سے ایک نے دوسری سے کچھ کہا۔ اور کمرے میں موجود صرف یوسف اس بات کو سمجھ سکا — اور اُس کا سانس اُوپر کا اُوپر ہی رہ گیا — بھلا وہ صرف پندرہ روز میں اپنی مادری زبان کو کیسے بھول سکتا تھا — !!

اُنگلیاں دانتوں تلے دب رہی تھیں اور میرا تن و توش پسینے کے سمندر میں ڈوب گیا

تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا اور دھیرے دھیرے عمارت کے برآمدے

کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اگرچہ میرے پاؤں ڈگمگا رہے تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ عمارت کی بجھی

بجھی آنکھیں میری طرف دیکھ دیکھ کر سہارے کی بھیک مانگ رہی ہیں! میرے دل میں درد کا

دریا بہنے لگا۔ مجھے اُس کی بجھی بجھی آنکھوں نے سیسہ کی طرح پگھلا دیا۔ میں عمارت میں داخل

ہوا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ عمارت کو آج پہلی بار اپنے وجود کا اور اپنی رونق کا احساس ہو رہا ہے

جیسے ویرانیاں اُس کے لئے بہاروں میں بدل رہی ہیں، سناٹے اور وحشت کی تاریکیاں روشنیوں

میں بدل رہی ہیں۔ پھر جب میں عمارت کے ایک دریچے میں بیٹھ گیا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ عمارت

اپنے آپ کو جگمگاتا محل سمجھنے لگی ہے۔ میں خوش تھا اور اس طرح حال ماضی کے دائرے میں

گھستا گیا کہ ایک دن جب میں لان میں عمارت کے برابر کھلی دھوپ میں بیٹھ گیا تو سینکڑوں اُنگلیاں

پھر اُٹھیں اور کئی چہرے نفرت کی آگ میں جل کر دوسری طرف مڑ گئے۔ پہلے میں گھبرا گیا۔ لیکن

پھر بھی میں اُن کی اور اس لئے دوڑا کہ وہ اُنگلیاں اور چہرے مجھ سے ضرور سوال کریں گے کہ

اندر کی عمارت کیسی ہے؟ کیا تمھیں یہ وحشت ناک عمارت پسند آئی؟ تم کیسے زندہ بچے؟

یہ عمارت تو سینکڑوں کو کھا گئی ہے؟ لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ میں اُن کے پیچھے دوڑتا گیا اور

وہ چہرے اور اُنگلیاں مجھ سے دُور بھاگتے گئے۔ میں کوشش کے باوجود بہت پیچھے رہ گیا۔ اُنھوں

نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ آخر میں بے ہنگم سانسوں کو درست کرتے ہوئے عمارت میں واپس داخل

ہوا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے اس عمارت کی اور عمارت کو میری ضرورت

ہے۔ باقی سب کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ میں نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ اپنے آپ پر فخر سا محسوس

کرنے لگا اور بے خوف عمارت کی ہر منزل، ہر کوٹھری اور ہر دریچے میں اُٹھتا بیٹھتا رہا۔ عمارت

اب میری ملکیت بن چکی تھی۔ لیکن ابھی بھی اگر کوئی مجھے عمارت کے سایے میں لان میں بیٹھے

ہوئے دیکھتا تو اُس کا چہرہ لٹک جاتا تھا۔ اُس کی اُنگلی میری اور عمارت کی طرف اُٹھتی تھی اور

"دوست! تم اُس عمارت کی رات کی چمک دمک، سج دھج اور رنگ۔ روپ کی طرف جاتے ہو۔ دن میں کبھی اس کی طرف بھرپور نگاہ کی ہے۔"

لیکن میں نے یہ ساری باتیں اَن سُنی کر دیں۔ دوست ناراض ہوئے، میں انھیں سمجھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ دراصل میں اُس عمارت کو بہت زیادہ خوب صورت بنانے اور اسے دھوپ کی روپہلی کرن میں نہلانے کا ایک دیرینہ خواب پورا کرنا چاہتا تھا۔ اُس عمارت کا ایک ایک دریچہ میرے ذہن کے کینوس پر نرگس کے پھولوں کی طرح رقص کر رہا تھا اور میں اُس عمارت کے لان کو، اُس کے ایک ایک دریچے کو، کواڑ کو دُلہن کی طرح سجانا چاہتا تھا۔ اُس عمارت کی نزاکت اور خوب صورتی نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔ میں اگر کچھ سوچتا بھی تھا، تو وہ یہ کہ بس عمارت میرے ہاتھ لگ جائے! اس جذبے کے تحت میرے قدم کئی بار عمارت کی جانب بڑھنے لگے تھے۔ میں نے سینے پر پتھر بھی رکھا۔ لیکن پھر بھی لان تک نہ پہنچ سکا تھا۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو چکا تھا۔ جوں ہی میں عمارت کی تعریف کرنے لگتا تو سینکڑوں اُنگلیاں اُٹھتی تھیں۔ میں پسینے سے شرابور ہو کر چپ چاپ واپس چلا جاتا تھا۔ لیکن ذہن میں خوب صورت عمارت کا تصوّر بار بار اُبھرتا تھا۔

"ہا ہا ہا—— ڈر گیا۔ سینکڑوں اُنگلیاں جو دیکھیں۔"

یہ سُن کر مجھے اکثر اپنی ہار کا احساس ہوتا اور میں سرپٹ بھاگنے لگتا تھا۔ لیکن جب بہت دُور نکل کر نگاہ اُٹھاتا تھا تو میں اپنے آپ کو پھر اسی عمارت کے قریب پاتا۔ میری حالت عجیب سی ہو جاتی تھی اور میں سوچنے لگتا تھا، آخر کیا بات ہے کہ یہ عمارت مجھے اپنی طرف مسلسل کھینچ رہی ہے اور جب میں نزدیک پہنچتا ہوں تو میرے پاؤں کیوں ڈگمگا جاتے ہیں؟ لیکن ایسا زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ ایک دن کسی غیر مرئی قوّت نے مجھے سینکڑوں اُنگلیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے عمارت کے لان میں دھکیل دیا اور میں ڈرتے ڈرتے عمارت کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اُنگلیاں اُٹھ رہی تھیں اور سب چہروں پر نفرت کے بادل چھا گئے تھے۔ کچھ

سے میرا باہر آنا ناممکن ہوا۔ کیونکہ باہر نہ آنے میں میرے شعور کا بھی بڑا دخل تھا۔ اور پھر جب کافی وقت "مٹھی سے نکل گیا" میں نے دیکھا کہ اس عمارت کے لان میں ایک خوب صورت پھول کھلا ہے، میں بہت خوش ہوا۔ پھول کو چوما۔ اُسے چومتا رہا ـــــ اور میں اس بے پناہ خوشی میں پاگل سا ہونے لگا ـــ میں ہنستا رہا۔ ہنستا رہا۔ یہاں تک کہ میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے اور میرا سر بھاری ہو گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ جب میں کچھ سنبھل گیا تو اچانک میرے ذہن کے دریچوں میں بھیانک قہقہہ پھر سے دستک دینے لگا۔ اور دھیرے دھیرے میرے ذہن پر پہلی عمارت کا تصور چھا جانے لگا۔ دل میں چپکے چپکے سے پہلی عمارت کی یادوں کا "دیا" جلنے لگا۔ میں ٹالتا رہا۔ لیکن دوا دارو نہ ہوا۔ اور ایک دن جب یادوں کے دیئے کی لو تیز ہو گئی تو میں آنکھ بچا کر پہلی عمارت کی جانب چل پڑا۔ دل میں خوف اور وسوسے اُبھر رہے تھے، ڈوب رہے تھے۔ لیکن میں آگے بڑھتا رہا اور کافی سفر کے بعد میں جوں ہی پہلی عمارت کے لان میں داخل ہوا، تو میں حیران رہ گیا۔ لان میں کوئی نہیں تھا۔ ہاں ایک صاف و شفاف چشمہ نظر آ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر میری اندر کی طرف دھنسی اور بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ میں لاٹھی ٹیکتے ہوئے چشمے کے قریب گیا۔ اُسے بڑے پیار سے دیکھا۔ اُس کے شفاف پانی کو تھپتھپایا۔ وہ شرمایا اور مجھ بڈھے کو دیکھ کر پسینے پسینے ہو کر ہنسنے لگا۔ میں کھو سا گیا اور دوسری عمارت کے لان کا پھول رہ رہ کر یاد آنے لگا۔ میں اسی میں مست تھا کہ میری اٹھتی نظر عمارت کی طرف اُٹھی۔ وہ سُنسان لگ رہی تھی۔ اُس کی مانگ سُونی سُونی سی تھی۔ اُس کی چھت کو برف باری نے ویرانیوں کا مزار بنا دیا تھا۔ میں خوف کھا گیا اور ہانپتے کانپتے اُس کے نزدیک پہنچا۔ اور اُسے دیکھتا رہا۔ اُس عمارت کے ویران اور خستہ حال دریچوں کی طرف دیکھ کر میرے سینے میں ماضی کا ایک طوفان اُبھرا جو چند لمحوں کے بعد حال کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

"کیوں آئے ہو میرے زخموں پر نمک چھڑکنے؟" عمارت مجھ سے کہہ رہی ہے۔

"کہ۔ کہ ... کچھ نہیں ـــ کچھ نہیں، یادوں کا دیا جلانے دل لگے کس تاریک گوشے میں

اس حالت میں، میں عمارت کی طرف دیکھ کر مسکراتا اور جواب میں عمارت ایسے مسکراتی کہ میرے دل میں پھول ہی پھول کھل اُٹھتے۔ میں اپنے آپ پر پھر فخر محسوس کرنے لگتا کہ میں نے ایک خطرناک جنگ جیتی ہے۔ اس طرح میں دیر تک عمارت کے سایے میں بیٹھے اُس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتا۔ وہ میری دل نواز نظر سے شرما جاتی اور میں خوشی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا!

لیکن ایک شام کو ایسا ہوا کہ عمارت کے لان میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک سایے کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ یہ کس کا سایہ تھا؟ سایہ کیوں بھاگا؟ کیا یہ مجھے قتل کرنے آیا تھا؟ ہو سکتا ہے یہ عمارت اُسی کی ملکیت ہو۔ میں خواہ مخواہ مالک بن بیٹھا ہوں۔ لیکن یہ سب سوال میرے ذہن کے دریچوں میں ہی رہ گئے۔ جب عمارت نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ میرا سارا غصّہ کافور ہوا۔ لیکن پھر ایسا اکثر ہونے لگا۔ میں کبھی لمبے سایے کو، کبھی چھوٹے سایے کو، کبھی موٹے اور کبھی پتلے سایوں کو بھاگتے ہوئے دیکھنے لگا۔ میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ میں خوف وہراس کے جال میں پھنس گیا۔ میری حالت پاگلوں جیسی ہونے لگی۔ اور ایک دن جب میں نے عمارت کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھا تو عمارت سے ایک بھیانک اور خوفناک قہقہہ بلند ہوا۔ میں لرز اُٹھا۔ عمارت کی دیواریں کانپنے لگیں۔ میں کانپ کر بھاگ گیا۔ میں بھاگتا گیا، دُور، بہت دُور — پھر بھی عمارت کا بھیانک قہقہہ برابر میرا تعاقب کر رہا تھا۔ میرے سینے میں کوئی چیز ٹوٹ گئی اور میں کئی برس تک پہاڑوں اور جنگلوں میں سکون کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ لیکن عمارت کا بھیانک قہقہہ برابر گونج رہا تھا، جس کی وجہ سے مجھے کہیں بھی سکون نہ ملا۔ پھر میں میدانوں کی طرف بھاگا۔ جہاں ہر طرف شور ہی شور تھا۔ اور اُس شور میں بڑی مشکل سے بھیانک قہقہہ ڈوب گیا اور میں دھیرے دھیرے سکون سا محسوس کرنے لگا۔ مجھ پر اب نہ کوئی انگلی اُٹھاتا تھا اور نہ کوئی اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیتا تھا۔ میری طرف کوئی بھی شکایت بھری نظروں سے نہیں دیکھتا تھا۔ اسی خوشی اور سکون کے ملے جُلے ماحول میں ایک دن میں ایک دوسری عمارت میں گھس گیا جہاں

"نہیں — نہیں — ایسا قطعی نہیں ہو سکتا۔ کیا ایک اندھا اپنی لاٹھی دوسرے کو دے سکتا ہے؟" یہ جواب سُن کر میں ہکّا بکّا سا رہ گیا۔ مجبُور ہو کر کچھ دیر کے بعد میں بوجھل قدموں واپس چلا آیا۔ لیکن کچھ مُدّت کے بعد جب میرے ذہن کے کینوس پر پھر سے چشمے کا تصوّر اُبھرنے لگا تو مجھے اپنے کِھلے ہوئے پھُول کا احساس ستانے لگا۔ میں پھر قسمت آزمائی کے لئے پہلی عمارت کے لان کے قریب، چوری چھُپے پہنچ گیا۔ وہاں جُوں ہی میں نے چشمے کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے ایک سایے کو اس چشمے میں نہانے کے بعد واپس آتے ہوئے دیکھا اور دوسرا سایہ نہانے میں مشغول تھا۔

جل اُٹھاہے!

اُس دیئے کو بجھا کر چلے جاؤ یہاں سے ـــ" عمارت کے ہونٹ پھر مکھلے۔ میں سٹپٹا کر کہنے لگا ـــ "کہ ـــ کیا یہاں یادوں کے دیئے ایک آدھ بار بھی نہیں جل اُٹھتے ـــ ؟"

"ہاں ـــ لیکن ـــ لیکن جلنے والے دیوں کو یہاں نہ صرف بجھایا جاتا ہے بلکہ اُٹھا کر توڑ دیا جاتا ہے، پھینک دیا جاتا ہے تا کہ حسرتوں کے مزار کا وجود تک بھی باقی نہ رہے ـــ"

"ٹھیک ہے ـــ لیکن کیا میں ایک سوال پوچھ سکتا ہوں!" میں نے عمارت سے کہا۔

"دِل کا بوجھ ضرور ہلکا کر سکتے ہو ـــ!"

"جب میں پہلی بار اس لان میں داخل ہوا تھا تو اس سیمیں چشمے کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ کب پھوٹا؟" یہ سُن کر عمارت پہلے رُک گئی اور پھر کہنے لگی۔

"تمھارے آنے سے پہلے!" میں نے اسے چھپا کے رکھا تھا تا کہ جب ویرانیوں کے سایے مجھ پر وار کرنے لگیں تو میری ویرانیوں کو یہی چشمہ اپنی شادابیوں میں چھپا دے گا۔"

"لیکن مجھے کیوں نہیں بتایا؟" میں نے پھر لاٹھی کے سہارے ٹہل لگاتے ہوئے سوال کیا۔

"ہر بات کہی نہیں جاتی۔ یہ چشمہ اُس وقت پھوٹنے لگا تھا جس وقت میری تیسری منزل تیار ہو چکی تھی اور ایک سایہ رات کے اندھیرے میں مجھے کچھ دے کر، اور مجھ سے کچھ چھین کر بھاگ گیا تھا۔ یہ چشمہ اُسی کا ہے جو چشمہ اب میرا سہارا بن چکا ہے!"

عمارت کی دیواروں سے نکلی ہوئی آواز بھاری ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے چشمے کی طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے عمارت سے کہا ـــ

"کیا ہرج ہے کہ اگر میں تمھارے لان کا یہ چشمہ اپنی نئی عمارت کے لان تک لے جاؤں کیونکہ اُس لان میں ایک خوب صورت پھول کھلا ہے جو اس وقت اپنے جوبن پر ہے۔ میں اس کے لئے اس چشمے کو وہاں تک لے جانا چاہتا ہوں تا کہ میرا وہ پھول اور کھل اُٹھے۔ میرے ذہن کو قرار ملے۔ اور اس شفاف چشمے کا پانی بھی ضائع ہونے سے بچ جائے!"

بھی تم اپنی آنکھوں پر الہام کی پٹی باندھنا چاہتے ہو۔ جس کو کہ ملکۂ ساحران کب کی بحیرۂ اسود کی گہرائیوں میں دفن کر چکی ہے اور اس پر یہ دعویٰ کہ ملکۂ ساحران کی پیدا کردہ روشنی چاہِ ظلمات کے اندھیرے کا ایک اور پرتو ہے۔ تمھیں جس چیز کی تلاش ہے وہ تمھیں کہیں نہ ملے گی۔ کیوں بھولتے ہو کہ ملکہ نے کس طرح اپنی ساحرانہ عیاری و مکارانہ دلبری سے تمام بڑے بڑے ساحروں کو ختم کیا۔ کتنوں نے اُس کی مسکراہٹ پر شمشیرِ آب دار سے اپنا گلا کاٹا، کتنے خجل ہو کر چلّو بھر پانی میں ڈوب مرے۔ کتنوں کی شجاعت و دلیری نقشِ دیوار بن کر رہ گئی اور کتنوں کی آوازیں سازِ شکستہ کی صداؤں کے مانند صحرائے دہشت میں کھو کر رہ گئیں!"

یہ سن کر میرا سارا بدن کھوکھلا بن جاتا ہے اور میں پت جھڑ میں جھڑے ایک خشک پتے کی مانند فضا میں اُڑنے لگتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ لوحِ محفوظ نہ سہی، کم از کم زنبیل ہی ملے تاکہ میں خود پوشیدہ رہ سکوں اور عمرو عیار سے کہہ سکوں کہ وہ میرا وجود ڈھونڈے جو صحرائے بلاخیز میں نہ جانے کس دربند میں اسیر ہے کہ ناگاہ دیوِ ہزارہ ہزار دست مجھے اپنے پنجے میں اُٹھا کر چیر پھاڑ دیتا ہے اور میرے جسم کے حصّے اس دھرتی کے اندھیرے غاروں، تنگ گھاٹیوں، اُبلتی خلیجوں اور منجمد کھائیوں میں پھینک کر ایک فلک شگاف قہقہہ بلند کرتا ہے ——"میں طلسمات کے سب سے بڑے دشمن کو نیست و نابود کر چکا ہوں۔ اب ملکۂ ساحران اپنے گلے سے موتیوں کی مالا اُتار کر مجھے انعام دے گی اور کیا عجب کہ قاف کے کسی طبقے کی مملکت بھی عنایت کرے —!"

اسی وقت فہم و ادراک سے پرے آکاش کی وسعتوں سے قوسِ قزح کے رنگوں کا ایک ہالہ نمودار ہو جاتا ہے۔ ہر طرف گلابی گھٹائیں چھانے لگتی ہیں اور حمالۂ گیسو گشا اپنے ہاتھوں میں اندر دھنش تھام کر اپنی زلفوں کو لہراتی ہے اور میرے بدن کے بن بن حصّے بن بن مقامات سے اُڑ کر اس کی زلفوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ان حصّوں

احساس کا کرب

امرتا لٹوبھی

اس جھونپڑی کا یہ کمرہ، ٹوٹی پھوٹی اور بے ڈول دیواروں پر سالہا سال پہلے کے بوسیدہ اور دیمک لگے کیلنڈر۔ اس طاق پر وہ مہکتی ہوئی کسی کی تصویرِ عنبر افشاں۔ ہر طرف مکڑیوں کے جالے، جیسے کہ آئینۂ طلسماتِ سامری لٹکے ہوئے ہوں اور میں! میں اوراق کا کفن اوڑھے کتابوں کی قبر میں اسیرانِ برفانی ہواؤں سے ٹھٹھرتا ہوا اس قفسِ گرہ گیر میں مقید پنچھی کو آزاد کرنے کی سعیٔ لاحاصل کر رہا ہوں۔ لیکن یہ چھل پائیاں بن سنور کر مہکتی اور چہکتی میرا تعاقب نہیں چھوڑتی۔ جب کبھی تھک کر گر جاتا ہوں تو ایک ساحرِ فلک پیما اپنے شیرِ صحرائی پر سوار، اپنے توے سے زیادہ سیاہ بدن سے شعلے اگلتے ہوئے میرے جنوں کو یہ کہہ کر اپنی ٹھوکروں پر اچھالتا ہے،
—— "اے کہ تو نسلِ آدم کا، سوختہ سے بھی بدتر ہے! پکار اپنے خدائے نادیدہ کو! —— مجھ سے اب تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا ہے۔ خداوندانِ سامری و جمشید کے معجزات بار بار دیکھ کر

کی تصویر پھر شلف پر رکھ دی ہے۔" اور چائے کی پیالی مجھے دینے سے پہلے تصویر کھڑکی سے باہر پھینکتی ہے۔ لیکن کرچیاں بکھرنے کے باوجود تصویر اپنی جگہ پر آجاتی ہے۔ میں حمالہ کی طرف دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ شبنم انگاروں کی مہمان بن سکتی ہے، راکھ کی نہیں۔ حمالہ اپنی زُلف پھر مہکاتی ہے اور راکھ کے نیچے دبی موہوم سی چنگاری جوالا بن کے قاف کے پردوں کو روشن کرتی ہے۔ اور میں چاہِ ظلمات میں غوطے کھاتے ہوئے آبِ حیات کی جستجو کرتا ہوں۔ لیکن اب مجھے کسی سفید ریش و سبز پوش پر کوئی بھروسہ نہیں۔ یہ بھی چھلیل پائیوں کا ایک رُوپ، ایک ادا ہے۔۔۔!

کالی کی کھڑگ سے خُون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ نہ جانے یہ کس کا لہو ہے جس سے سرسوتی کے سروور میں کنول کھلے ہیں۔ لیکن اب ان کنولوں میں کوئی بُو نہیں اور یہ لہو میں ہی تحلیل ہوتے ہیں۔ نسلِ آدم احمریں قلزم سے اُبھر اُبھر کر ڈوبتی ہے اور ڈوب ڈوب کر اُبھرتی ہے مگر لوحِ محفوظ کا نشان نہیں ملتا۔ میں چیخ اُٹھتا ہوں۔ لوگو۔۔۔! اے لوگو!! مجھے اوراق کا کفن اور کتابوں کی قبر نہیں چاہیئے۔ مجھے اس دفترِ مہمل سے نجات دو۔۔۔ مجھے آگ چاہیئے۔ آگ جو ان برفانی وادیوں کو گلابی رنگ عطا کرے اور میں حیات بھرا ایک کھلا سانس لے سکوں۔۔۔!"

لیکن صحرائے بلاخیز میں سحرِ سامری کی بدولت ایک تند و تیز آندھی چلتی ہے اور میں ریت کے ذرّات میں دب کر رہ جاتا ہوں۔ معاً ایک پُرانے کیلنڈر پر شِو کی ایک میلی کچیلی تصویر میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس شکستہ کمرے میں تانڈو ناچ شروع ہو جاتا ہے۔۔۔ تانڈو ناچ۔۔۔! رقصِ ابد۔۔۔! رقصِ ازل۔۔۔!! شکستہ دیواریں مُنہدم ہو جاتی ہیں اور طبقاتِ قاف میں زلزلہ پیدا ہو جاتا ہے! طلسمات ٹُوٹ جاتے ہیں اور ہر طرف غوغائے آزادی پیدا ہو جاتا ہے!! صدیوں کے غلام قفس توڑ کر نکلتے ہیں اور ایک روشنی کے ہالے میں تحلیل ہو کر سراپا روشنی بن جاتے ہیں!! میں آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو قوسِ قزح کی بہاروں میں صرف حمالہ گیسو کُشا اپنے بالوں کو بکھرائے محوِ رقص نظر آتی ہے۔

کو اپنی عنبر افشاں مسکراہٹ سے جوڑتی ہے اور اُس کی آنکھوں سے آکاش گنگا کا ایک قطرہ نکل کر ان ٹوٹے پھوٹے جوڑے ہوئے حصّوں میں پھر حرارتِ حیات دوڑاتا ہے اور اپنا ہلکا پن محسوس کر کے میں چیخ اُٹھتا ہوں ——— "اے حمالہ! تم کتنی سنگ دل ہو، کیوں بار بار یہ بے وجود، وجود تعمیر کر کے مجھے اس صحرائے بلاخیز میں اُلجھا دیتی ہو۔ ہزارہ ہزار دست یار بار مجھ پر رحم کرتا ہے لیکن تم بار بار اس نیل گگن کی چھاؤں سے نکل کر مجھے پھر قتل ہونے کے لیے تیار کرتی ہو۔ آخر اس لاش کو میں اس طلسماتِ سامری میں لیے ہوئے کہاں کہاں دربدر پھروں ———!"

حمالہ مسکرا دیتی ہے اور ایک لمحے ——— فقط ایک لمحے کے لیے ——— میرا ہاتھ چھوڑ دیتی ہے۔ دُور صحرائے بلاخیز کے کسی زنداں میں، میں ایک چھناکہ ہوجاتا ہے اور گرد و غبار کی ایک موٹی سی چادر ہر طرف چھا جاتی ہے۔ حمالہ اپنی زُلفوں کو پھر لہراتی ہے اور دھول سے میرا شکستہ و ہراساں وجود ظاہر ہو کر مجھ میں سما جاتا ہے اور حمالہ اپنے گیسوؤں کو لہرا کر غائب ہوجاتی ہے!

میں اپنی قبر میں اپنے حواس اکٹھے کر کے باہر دیکھتا ہوں۔ ہر طرف منجمد برف پوش چاندنی میں نادیدہ عجیب و غریب سایوں کا رقص جاری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کتّوں اور گیدڑوں نے غوغائے رست خیز برپا کر دیا ہے۔ میں سہم کر اپنے کفن کے اوراق اُلٹتا ہوں لیکن لفظ منجمد اور عنوانات ساکن ہیں۔ بوسیدہ کیلنڈر سے سرسوتی کی تصویر میری طرف جھانکتی ہے اور معاً یہ کالی کی شبیہہ اختیار کرتی ہے۔ میں کالی کے تصور میں اُلجھ کر رہ جاتا ہوں اور طبقاتِ قاف کی تسخیر کے لیے پھر سے آمادہ ہوجاتا ہوں۔ گرتے، پڑتے، اُلجھتے، بکھرتے اور سمٹتے ہوئے کئی دربند طے کرتا ہوں۔ لیکن جب ذرا دم لینے کے لیے رُکتا ہوں، تو اپنے آپ کو اسی تنگ و تاریک قبر میں پاتا ہوں۔ میری بیوی چائے کی پیالی لیے ہوئے داخل ہوجاتی ہے اور کہتی ہے :— "ارے۔ اس کل موہی

میں ایلیا سے خوب باتیں، کرنا چاہتا ہوں۔ مگر آج وہ باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھی!
اُس نے سگریٹ سُلگایا اور پاؤں پسار کر صوفے پر دراز ہو گئی۔
میں کسی گاہک کو نپٹانے کے لئے کاؤنٹر پر چلا آیا۔
کلب میں ہر طرف گہما گہمی تھی۔ ایک طرف رمی کے پوائنٹ پر جھگڑا چل رہا تھا۔
اور دوسری میز پر روڈیشیا کی سمتھ حکومت کے خلاف زوردار بحث چل رہی تھی۔
اور گوشے کی ایک میز پر بیٹھی ایلیا برانڈی پی رہی تھی!
سرور میں آتے ہی اُس کے رُخسار تمتمانے لگے تھے۔
ایلیا، سکاٹ لینڈ کی رہنے والی تھی اور دہلی میں ایک فرم کی مُلازم تھی۔ وہ ہر برس ونٹر سپورٹس کے لئے گلمرگ آیا کرتی تھی۔
گذشتہ تین برس سے اُس کا یہ ہی معمول تھا۔
جیوک بکس میں نیا گیت چلنے لگا۔ اور میں لپک کر ایلیا کی طرف بڑھا۔
وہ قدرے زیادہ اُداس تھی۔
اُداسی اُس کی زندگی کا حاصل تھا۔ مگر آج معمول سے قدرے زیادہ اُداس ہو رہی تھی۔
ان اُداس لمحوں میں، میں نے اکثر ایلیا کا ساتھ دیا تھا۔ اُس کے مُلک کے لوک گیت اس کی مدھر آواز میں سُنے تھے اور اُس کو گھنٹوں زندگی کو نئی ڈگر پر چلانے کا درس دیا تھا۔
اور جب کبھی ایلیا بہت زیادہ بہک جاتی تو میں نے اُسے جون کی قسم دی تھی۔ میں نے جون فلپس کو تین برس قبل دیکھا تھا۔ اُس وقت گلمرگ کلب میں میری پوسٹنگ نئی نئی ہوئی تھی۔

مجھے ان دونوں کی جوڑی بہت پیاری لگی تھی اور شام کو سکائنگ سے تھک کر جب دونوں کلب میں بیٹھ کر باتیں کرتے، مجھے عجیب سی گُدگُدی ہونے لگتی۔
مائیکل، سویڈن کی ایک ہوائی کمپنی میں پائلٹ تھا۔ دونوں کا رومان دہلی میں پروان چڑھا

اُداس لمحوں کا سفر

جیوتیشور پتھک

ایلیا نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔

باہر روئی کے گالوں کی طرح برف کا انبار لگا تھا اور کلب کے اندر کی فضا ریگستان کی طرح تپتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے شکست خوردہ سی سرد آہ بھری اور صوفے میں دُبک کر بیٹھ گئی۔

جیوک بکس پر کسی نئی فلم کا نغمہ چل رہا تھا۔

ایلیا نے برانڈی گلاس میں انڈیلی اور غٹاغٹ نگل جانے کے بعد سکون کا سانس لیا۔

جیسے اس نے دُنیا بھر کی تلخیوں کو لمحہ بھر کے لئے اپنے اندر سمو لیا ہو!

"ایلیا! آج تم اکیلی پی رہی ہو۔"

"ہاں!" اُس نے اِثبات میں سر ہلا دیا۔

یک لخت میرے خیالوں کا تانتا ٹوٹ جاتا ہے۔

آیلیا اپنے بیٹلر سے زور زور سے چلا رہی تھی۔

غلام احمد گنائی بٹلر نے میرے کان میں سرگوشی کی ـــــ

صاحب! آج بہت پی لی ہے۔ شاید بہک گئی ہے!

"وہاٹ کین آئی سَرو یُو میڈم؟" What Can I serve you madam?

"ہیڈ یُو گان ٹُو ہیل!" Had you gone to hell! آیلیا نے مجھے

دیکھ کر چلا کر کہا۔

ایکس کیوز می میڈم! Excuse me Madam!

میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد آیلیا نے کھانے کا آرڈر دیا۔ اور میں نے ذاتی نگرانی میں آرڈر کی تکمیل کروائی اور

خود سگریٹ جلا کر اپنے کاؤنٹر پر واپس آگیا۔

ایک بار سری نگر پہنچا۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ حمیدہ کی شادی طے ہو چکی ہے اور اس نے

یونیورسٹی میں پڑھنے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے۔

حمیدہ کے میری زندگی سے اچانک نکل جانے پر مجھے صدمہ تو ضرور ہوا، مگر میں فوراً اس غم کو

پی کر رہ گیا۔ یہ سوچ کر میری طرح حمیدہ بھی وقت اور حالات سے مجبور ہو گئی۔ اور اس

پریشانی کے عالم میں، میں نے حمیدہ سے ملنے کا خیال ترک کیا۔ بعد ازاں چھ ماہ تک میں

سری نگر نہیں گیا بلکہ اپنی ماں کو بھی گلمرگ میں لے آیا۔ اور پھر جب یہاں پر سردی شدت

اختیار کرنے لگی تو اُسے واپس بھیج دیا۔ ماں نے میرے چہرے سے میری پریشانی کا اندازہ کر لیا

تھا۔ اور بار بار مجھے شادی کرنے پر زور دے رہی تھی۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں جو

زخم لگا ہے، وہ کسی بھی طور پر مجھے چین نہیں لینے دے گا۔ بابا رشی کی زیارت میں ماں میرے

لئے منت مانگ چکی تھی۔ ایک مجبور ماں اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔ کوئی بھی ماں اپنے

اور اس نے ایلیا کو خوابوں کی بلندیوں میں اُڑانے کے وعدے کیے۔ دونوں کرسمس منانے گلمرگ آیا کرتے تھے۔ دِن بھر برف کی سفید چادر پر سکیٹنگ کیا کرتے اور جب تھک جاتے تو باہوں میں باہیں ڈال کر ماضی، حال اور مستقبل کے خوابوں میں کھو جاتے!

اُن دِنوں حمیدہ کے ساتھ میرا رومان بھی زوروں پر تھا۔

میں بھی فرصت کے لمحات بلیوارڈ روڈ پر ٹہلتے ہوئے گزار دیا کرتا تھا۔

وہ اپنی مترنّم آواز میں مہجور کے گیت سُناتی۔

حبّہ خاتون کی شاعری سے بھی اچھّا خاصا لگاؤ تھا۔

یہ دونوں اپنی ناؤ جھیلِ ڈل کی لہروں کے سہارے چھوڑ دیا کرتے۔

حمیدہ، ہاروَن کے قریب ایک گاؤں میں رہا کرتی تھی اور میری، اس کی پہلی مُلاقات یُونیورسٹی کی لائبریری میں ہوئی۔ اُسے فلسفے کی کتابوں کا شوق تھا اور میں رومانی شاعری پر جان دیا کرتا تھا۔ اُن ہی دِنوں میں مہجور اور شیلی کی شاعری کے تقابلی جائزے پر ایک تھیسس لکھنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

اور وہ ایم اے اُردو کے پہلے سال میں مطالعہ کر رہی تھی۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا: عجیب لڑکی ہے۔ ادب کی طالب علم ہو کر فلسفے کی موٹی موٹی کتابوں سے لگاؤ ہے۔ رفتہ رفتہ ہماری قربت بڑھ گئی۔

ہمارے رومان پرور گیت فضا میں گونجنے لگے۔

اور دونوں ایک ساتھ جینے اور ایک ساتھ مرنے کے وعدے کرنے لگے۔

انھیں دِنوں مجھے گلمرگ کلب میں مُلازمت مِل گئی اور میں تھیسس لکھنے کے پروگرام کو ادھورا چھوڑ کر یہاں آگیا۔ کبھی کبھار حمیدہ آکر مجھے مِل جایا کرتی یا کبھی میں ایک دو روز کی رخصت پر سری نگر چلا جایا کرتا۔ اور اس کی نیلی جھیل کی گہرائیوں میں جھانک کر مستقبل کے جھروکوں میں کھو جایا کرتا۔

میں، حمیدہ، آمنہ اور حمیدہ کا خاوند۔

الگ الگ دائرے تھے۔ الگ فریم۔ الگ الگ تصویریں!

یہ تمام کردار ایک مدار پر گھوم رہے تھے۔ مگر دونوں میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا فقدان تھا۔ کئی مرتبہ میں نے چاہا کہ اس تمام چکرویوا کو توڑ ڈالوں اور بڑھ کر حمیدہ کو اپنالوں مگر میرے دل کی بزدلی نے مجھے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔

اب آمنہ میری زندگی سے خارج ہو چکی ہے۔ اس نے مجھ سے طلاق حاصل کر لی ہے اور میں زندگی کی تلخیوں کو شراب میں گھول کر پی جانے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ کیونکہ ماں بھی موت کے اندھیروں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک دن اچانک میں اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس اخبار کی ایک خبر کی طرف متوجہ ہوا:

سری نگر۔ (نامہ نگار):۔ گذشتہ روز فلڈ چینل کے قریب دریائے جہلم میں ایک لاش برآمد ہوئی ہے۔ متوفیہ حمیدہ شہر کے بڑے تاجر عبدالسلام کی اہلیہ تھیں۔ پولیس نے لاش برآمد کر کے پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دی ہے۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے:

بیٹے کے چہرے پر اُداسی کے بادل نہیں دیکھ سکتی!

میں کبھی کبھار سب سے رُخصت لے کر سری نگر میں اپنی ماں سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔

آیلیا کی شادی ہو گئی اور وہ زندگی کے دھندلکوں میں کھو کر رہ گئی۔

ماں کی مجبوری اور ضعیف العمری نے آخر مجھے شادی کرنے پر مجبور کر دیا۔

مگر ازدواجی زندگی بھی مجھے راس نہ آئی۔ میں اپنی مجبوریوں اور آمنہ کے سنکی پن کی وجہ سے زندگی کے ساتھ ایڈجسٹ نہ کر سکا۔

میں ۔ حمیدہ اور آمنہ

ایک مُشت، تین زاویے، تین نکتے ۔ اپنے اپنے غموں میں سُلگتے جا رہے تھے۔

میری زندگی ایک سراب بن چکی تھی۔ مگر ماں کی ضعیف العمری کے پیشِ نظر ایک سعادت مند بیٹے کی طرح میں یہ زہر نگلتا جا رہا تھا۔

آمنہ اور میں!

اپنے اپنے فریم میں جکڑی الگ الگ تصویریں تھیں۔

ایک روز میں اور آمنہ سرکلر روڈ پر ٹہل رہے تھے کہ اچانک حمیدہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ میرے سانسوں کی حرکت تیز ہو گئی اور دماغ پر ہتھوڑے چلنے لگے۔ مشکل سے میں آنکھیں اُٹھا کر حمیدہ کی طرف دیکھ سکا۔ اس کے رُخسار سُرخ ہو چکے تھے۔

آمنہ ہم دونوں کی ذہنی کیفیت سے واقف ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے ٹپک رہے تھے۔ مگر اس نے اپنی کیفیت چھپانے کی کوشش کرتے ایک جھپکی سی لی اور کہا:

ہیلو ۔۔۔ یہ آپ کے بارے میں پہلے ہی سب کچھ سُنا چکے تھے۔

۔۔۔ حمیدہ نے جواباً مسکرانے کی کوشش کی اور زبان سے کچھ کہنے سے قاصر رہی۔

آمنہ کچھ بہانہ کر کے ہم دونوں کو تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ میں اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھا مگر تذبذب کے عالم میں کچھ نہ کہہ سکا۔

آکر کھڑا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے کہ برف گر رہی ہے ——!" پھر اُس نے پردہ سرکا کر کھڑکی کھولی اور باہر جھانکنے لگا۔

یہ جنوری کی ایک سرد ترین رات تھی —— سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کمرے میں چلّہ کلان کی کیفیت کا احساس دِلانے لگا۔

"کھڑکی بند کردو یار ———!" میں نے اپنے آپ کو کمبل میں سُکیڑتے ہوئے سُلطان کو ناراضگی اور تحکّم کے لہجے میں کہا

"تمھیں ٹھنڈ لگتی ہے؟ کہا تو تھا کہ چھوٹی سی پی لو —— لیکن میں تمھیں پینے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔ تم صُوفی ہو۔ کمینے ——"

اُس نے کھڑکی بند کردی ———

"میں سمجھا تھا شاید باہر برف گر رہی ہے۔ لیکن باہر چاروں طرف اُجلی اُجلی دُودھیا چاندنی سڑکوں، چھتوں اور پیڑوں پر پھیلی ہوئی ہے۔"

"جب وہ مجھے روشنی والے نکڑ پر ملی تھی، اُن دنوں نکڑ کی ٹیوب لائٹ کسی شریر لڑکے نے کنکر مار کر توڑ ڈالی تھی۔ اور اُس کے لئے اُس نکڑ کے بغیر کوئی پناہ گاہ نہیں تھی! جب وہ مجھے ملی، وہ برہنہ تھی۔ چاند نے اُس کے سیاہ فام شریر کو ننگا کر دیا تھا۔ اور وہ سمٹی سمٹائی مارے لجا کے اپنے لمبے لمبے سیاہ گیسوؤں سے اپنے جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کرتے کرتے اس تاریک اور سُنسان گلی میں آچھپی تھی جہاں میں رہتا ہوں ——!"

سُلطان نے گلاس خالی کیا اور سگریٹ سُلگانے لگا۔

"... رُکو —— میں تمھارے لئے کافی بنا کر لاتا ہوں —— تم بور ہونے کے علاوہ سردی سے کانپ رہے ہو ——"

اس سے پہلے کہ میں "نہیں ... " یا اسی قسم کا کوئی اور تکلفاتی کلمہ ادا کر سکتا، وہ چلا گیا تھا

———— ✻ ————

کئی تنکے کئی سورج

راجہ تلک ربو نیاری

"پہلے دِن وہ مجھے اُس نکڑ پر مِلی تھی جہاں روشنی رہتی ہے۔
اُس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور اُس کے خشک اور پژمُردہ لبوں پر آ پھیلی لیکن بے جان سی
مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔"

سُلطان نے گِلاس میں شراب اُنڈیلتے ہوئے مجھے اِطلاع دی۔

"وہ اکیلی تھی!" اُس نے گِلاس لبوں تک لے جانے سے پہلے کہا:

"چاند بھی تو اکیلا ہے۔

سُورج بھی ——!!

اور خُدا بھی۔۔۔ ۔۔۔ کیوں؟"

وہ مجھے گھُورنے لگا۔ میں نے اِثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور کھڑکی کے قریب

پاس صرف ایک کمرہ ہے جس میں مٹی کا ایک پرانا اور میلا کچیلا سا دیا جلتا رہتا ہے۔ اگر تم میرے کمرے میں آؤگی تو دیئے کی روشنی میں اپنا جسم . . . . . .

میں ذرا سا ٹھٹھکا . . . . اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں میری باتیں کوئی سُنتا تو نہیں . . . . ان دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں ــــــ

میرے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے اُبھر آئے تھے۔ معلوم نہیں اُس کے چہرے پر بھی . . . تمھارے لئے بہتر ہے کہ تم ان ہی اندھیرے گلی کوچوں میں کہیں چھپ کر بیٹھے رہو ــــــ اور جب صبح ہو جائے تو . . . . . . تو . . . . . . اس کے آگے میں نہیں جانتا تھا کہ اُسے کیا مشورہ دوں ــــــ اچانک جھنڈا سنگھ ڈرائیور نے کھڑکی کھولی . . . . . . کمرے کے اندر کی روشنی گلی میں پڑی۔ اور اتنے میں وہ غائب ہو چکی تھی۔ جھنڈا سنگھ نے دائیں ہاتھ سے ناک صاف کیا اور آسمان کی طرف دیکھا جس پر کالے کالے بادل منڈلا رہے تھے۔ اُس نے بادلوں کو ماں بہن کی گالی دیتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔ میں اس درمیان اپنے مکان نما کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔

میں نے سُلطان کو مشورہ دیا کہ وہ پہلے اپنی سانسوں کو قابو میں کرے اور پھر آگے جو کہنا چاہتا ہو، سُنا ڈالے ــــــ

"اب سونا چاہیئے ــــــ میرے دیئے میں نہ کل تیل تھا نہ آج ہے۔ کل جب دیّا گل ہو گیا تو میں نے سونے کی کوشش کی۔ لیکن بے کار . . . . . . تم پوچھو گے کیوں؟ دراصل بات ہی کچھ ایسی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے گلی کے سب لڑکے سخت صدمے میں مبتلا ہیں؛ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی مشترکہ محبوبہ کوزی کو کوئی اور پہلوان لے اُڑا ہے . . . . . . خیر پولیس نے کیس رجسٹر کر لیا ہے ــــــ دیکھا جائے گا ــــــ ایک یہ ہنگامہ ــــــ اور اُدھر جہاں ڈرائیوروں کی کالونی ہے۔ آئے دن ہنگامہ ہوتا رہتا ہے۔ کم بخت دارو پی کر خوب دھنگا کرتے ہیں ــــــ مگر تمھیں کیا ــــــ ان سب باتوں سے۔

تم نے سُنا ہے تین چیزیں بہت مشہور ہیں ــــــ صبح بنارس، شام اودھ یعنی کہ

"شہر کی رات ہے، میں ناشاد اور ناکارہ پھروں!
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں۔ اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں؟
گانا ختم ہوا۔ سلطان نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر کو بند کر دیا ــــ اور میری طرف دیکھنے لگا
... "کیا ہو گیا ــــ؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔
"ابھی سننا ــــ" اس نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی ــــ اور واپس آکر ٹیپ ریکارڈر کو پھر آن کر دیا۔
پھر یہی گانا ــــ اس نے اپنے لبوں پر اس طرح سے انگلی رکھی جیسے وہ مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کر رہا ہو۔
چند لمحوں کے بعد گلی سے کسی کے رونے اور سسکنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔
میں حیران و پریشان سا کبھی سلطان کی طرف دیکھتا، کبھی کھڑکی سے باہر تاریک خلائیں۔
"اے وحشتِ دل کیا کروں ــــ" گانا ختم ہوا ــ سسکیاں بھی تاریکی اور سکوت میں ڈوب گئیں ــــ
"یہ شمس ہے ــــ بے چارے کو سب پاگل کہتے ہیں۔"
"تو کیا ــــ وہ ہے ــــ؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں ... وہ شبانہ سے بے حد محبّت کرتا ہے جیسے چاند سے چکور ... اس کی کالی کلوٹی محبوبہ اسے کبھی نہیں مل سکتی۔ وہ ندی کے دو کنارے ہیں ... خیر چھوڑو ــــ ہاں تو میں نے بات کہاں چھوڑی تھی۔
ٹھیک یاد آیا ــــ
"... جب وہ مجھے ملی تو میں اسے فاحشہ سمجھ بیٹھا۔ جو کسی نئے چکلے یا نئے گاہک کی تلاش میں اندھیری تنگ اور تاریک گلیوں میں آوارہ گھوم رہی ہے۔ بعد میں، میں نے اپنے اس نیچ خیال کو بدلا۔ اور اسے قمر کی رکھیل سمجھ کر اس کی طرف سے اپنا منہ موڑ لیا۔ اس نے اپنا منہ چھپا کر مجھے پناہ دینے کی درخواست کی۔ اور میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا ــــ میرے

افسانہ

غمگینؔ غلام نبی

"ہیلو — ہیلو . . . . . ."

"ہاں فرمایئے ——— میں غمگینؔ بول رہا ہوں۔"

"ارے —! غمگینؔ تو میں ہوں!"

"ہوں گے ——— میں غمگینؔ غلام نبی ہوں۔"

"غلط، بالکل غلط — غمگینؔ غلام نبی میں خود ہوں —"

"کیا ———! (شاید پاگل ہوا ہے) اچھّا چلیئے دو منٹ کے لئے میں مانے لیتا ہوں، کہیئے کیوں کال کی؟ آپ شاید نہیں جانتے کہ اس وقت میں اپنے زیرِ تکمیل افسانے کا کلائمیکس سوچ رہا تھا —"

"اوہ ——! دیکھیے، میں بھی اپنے تازہ افسانے کا کلائمیکس ہی سوچ رہا تھا۔ لیکن کچھ

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میرے شہر کا کون سا وقت خوب صورت ہوتا ہے۔ اگر تم بتا سکو ... تو انعام کے طور پر میں تمھیں ابھی چلے جانے اور جا کر آرام سے سونے کی اجازت دے سکتا ہوں۔

میں تمھارے شہر میں ایک اجنبی ہوں ــــــ میں اسی کالی کلوٹی محبوبہ کی تلاش میں اس شہر میں آیا تھا۔ لیکن جگمگاتے قمقموں اور روشنی کے سمندر میں نہائے ہوئے اس شہر میں وہ مجھے کہیں نہ ملی۔ پھر کسی نے میرے کان میں کہہ دیا کہ وہ تمھارے گھر میں مل سکتی ہے، کیونکہ تم ایک کلاکار ہو۔ میں اس کی تلاش میں یہاں تک آیا اور اس حقیقت کو یہاں بھی پا نہ سکا ــــــ یہاں بھی مٹی کا ایک دیّا روشن ہے۔ تم نے اچھّا کیا کہ اسے اپنے گھر میں پناہ نہ دی۔ ورنہ وہ ننگی ہو جاتی اور اس کا بھید ایک آرٹسٹ کے سامنے کھل جاتا ــــــ اب تم ہی بتاؤ، میں اسے کہاں تلاش کروں؟

تم ضرور بتا سکتے ہو ــــــ!"

اس نے ہونٹ سکوڑ کر کہا ــــــ میں تمھیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میرا شہر اس کی گود میں سویا ہوا ہے....

اور ہم سب تم اور وہ اس کے پالے ہوئے بچے ہیں ــــــ وہ ہر روز صبح ایک سورج کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے ہم سب سورج ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی کوڑے کے ڈھیر پر چمک رہا ہے اور کوئی آسمان پر... اور میں اپنے سوال کا جواب بھی پا گیا ــــــ میرے شہر کا وہ وقت نہایت خوب صورت ہوتا ہے جب ہم سب کی یہ ماں سورج کو اپنی کوکھ سے نکال کر باہر رکھتی ہے...."

میں نے کہا "مجھے نیند آ رہی ہے ــــــ اگر میں سورج ہوں تو مجھے اب رات بھر آرام کرنے کے لئے کنہیا کماری میں ڈوب جانا چاہیئے۔ شب بخیر ــــــ!

ٹھیک ہے۔ لیکن امیر ہیرو یہ کہہ کر ایک امیر لڑکی سے شادی کرتا ہے کہ غریب ہیروئن

سے عشق تو کیا جا سکتا ہے لیکن شادی نہیں۔ لہٰذا غریب ہیروئن غیرت میں آ کر

پُل پر سے چھلانگ لگا کر اپنے آپ کو جہلم کی موجوں کے حوالے کرتی ہے۔"

"ہائیں —— یعنی آپ نے اپنی غریب ہیروئن کو مار دیا۔ تب تو آپ کا افسانہ مکمل

ہو چکا ہے۔"

"نہیں بھئی —— یہ تو میں نے غیرت کی بات کہی تھی۔ اصل سچویشن تو یہ ہے کہ غریب

ہیروئن کو جہلم سے زندہ باہر نکالا جاتا ہے۔ وہ بچتی تو ہے لیکن پیٹ میں بھوک کے

مروڑ اُسے مارنے پر تُل جاتے ہیں۔ پھر وہ امیر ہیرو کے ہاں نوکری کرتی ہے اور اُس

کے فرائض میں صرف یہ شامل ہوتا ہے کہ اُسے امیر ہیرو کے گھر میں، اُس کے بیڈ روم

کے باہر پہرہ دینا ہوتا ہے تاکہ جب امیر ہیرو کی بیوی سو جائے تو وہ داخل ہو جائے۔

اب آپ ہی کہیئے کہ جب وہ مرتی نہیں تو میں کیسے مار دوں ——"

"اوہ —— ! اب کیا کریں ——؟"

"آپ کہیں تو میں ایک مشورہ دے سکتا ہوں ——"

"ہاں، ہاں کہیئے۔ اسی لئے تو رِنگ کیا ہے۔"

"شرط یہ ہے کہ پہلے آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ غمگین غلام نبی آپ نہیں، میں ہوں۔"

"(پاگل ہے شاید) چلیئے دو منٹ کے لئے مانے لیتا ہوں۔"

"تو سُنیئے —— دو میں سے ایک کردار کو مارنے سے آخر ہمارا کیا مقصد ہے ——؟"

"یہی کہ ہمارا افسانہ مکمل ہو جائے ——"

"جی نہیں، بالکل نہیں —— سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے دونوں کرداروں کی شادی

ہوتی تو آپ کیا کرتے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ جب بھی میرا افسانہ تکمیل پاتا ——"

کن فیوز ہوا ہوں ـــــ دراصل میری اس کہانی کا ہیرو اور ہیروئن اب اُس مقام پر پہنچے ہیں جہاں سے جُدائی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ اب میرے لئے دو میں سے ایک کو مار دینا ضروری ہے۔ لیکن کن فیوجن یہ ہے کہ کسے مار دوں، ہیرو کو یا ہیروئن کو ـــــ؟

"دیکھئے صاحب، میرا نام تو آپ نے چوری کیا ہی ہے، اب آپ میرا افسانہ چوری کرنے کی فکر میں ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ نے ابھی تک جو کچھ بھی کہا، یہ میرا وہی افسانہ ہے جس کے کلائمیکس کے بارے میں، میں غور کر ہی رہا تھا کہ آپ نے ڈسٹرب کیا ـــــ"

"کیا مطلب ـــــ؟ کیا آپ کی ہیروئن امیر اور ہیرو غریب ہے ـــــ؟"

"جی نہیں، میری ہیروئن غریب اور ہیرو امیر ہے ـــــ"

"چلیئے پھر ٹھیک ہے ـــــ دیکھئے صاحب، آپ اپنی غلط فہمی دُور کیجیئے۔ میں نے آپ کا افسانہ چوری نہیں کیا ہے۔ ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ میری ہیروئن امیر اور ہیرو غریب ہے ـــــ"

"اچھا اگر ایسا ہے تو آپ اپنے غریب ہیرو کو مار دیجیئے۔ آپ کا افسانہ مکمّل ہو جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ پہلے اصلی سچویشن تو نوٹ کیجیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ میری امیر ہیروئن تو عشق غریب ہیرو سے کرتی ہے لیکن شادی وہ اپنے سے امیر رقیب سے رچاتی ہے۔ لیکن اپنی محبّت کا ثبوت وہ اس طرح سے دیتی ہے کہ اپنے غریب عاشق کو، اپنے گھر میں، اپنے بیڈ رُوم کے باہر، پہرہ دینے کی نوکری سونپتی ہے تاکہ اُس بے چارے کا پیٹ پل سکے۔ غریب عاشق غیرت میں آ کر خودکشی نہیں کرتا ہے بلکہ نوکری کرتا ہے کیونکہ اُس کے خیال میں غیرت ایک ڈکار ہے جو بھرے پیٹ سے نکلتی ہے۔ خالی پیٹ ہو تو غیرت کا کیا کام۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ جب وہ مرتا نہیں تو میں کیسے مار دوں ـــــ؟"

"آپ کا ہیرو بکتا ہے ـــــ آپ اُسے سمجھایئے کہ "غیرت" بھرے پیٹ کی ڈکار نہیں بلکہ خالی پیٹ کے مروڑ ہیں۔ مثال کے طور میں آپ کو اپنے افسانے کے متعلق بتاؤں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ میری غریب ہیروئن، امیر ہیرو سے عشق کرتی ہے۔ یہاں تک تو

شکست

ڈی۔ کے کنول

زہر میری رگ رگ میں ہی نہیں، میری رُوح میں بھی ہے۔ گو کہ میں شنکر نہیں تھا لیکن پھر بھی میں نے شنکر کی طرح ابنِ آدم کی بھلائی کے لیئے اس سنسار کا سارا زہر چُوس کر اپنے کنٹھ میں بھر لینا چاہا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ میں انسان تھا، بھگوان نہیں، زہر میرے جسم میں سرایت کر گیا۔ اور اس طرح خُون کی جگہ زہر میری رگ رگ میں دوڑنے لگا۔

میں پاگل نہیں ہوں ---! نہیں نہیں ------ شاید میں دیوانہ ہی تھا، جو میں نے انسان سے بھگوان بننا چاہا۔ دراصل میں پیار و محبت کی اُن کلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا جنہیں نفرت اور دشمنی کی زہریلی ہوا اُن نے مُرجھا کر رکھ دیا تھا۔ میں اُن پھولوں کو مُسکراتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ جنہیں توپوں اور بموں نے جُھلسا کر

"یہ بھی غلط ہے۔ آپ شادی تک کے واقعہ کو کہانی کہتے ہیں جب کہ اصل کہانی شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح آپ مرنے تک کے واقعہ کو کہانی کہتے ہیں، جب کہ اصل کہانی مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ کہیئے کیا سمجھے؟"

وہ تو ٹھیک ہے، لیکن پھر ایک کردار کو مارنے سے ہمارا کیا مقصد ہے؟"

"صرف یہ کہ ہم انھیں، اُن کے ناکردہ گناہوں کی سزا دینا چاہتے ہیں۔ اس سے ہمیں نہ جانے کیوں تسکین سی ملتی ہے۔"

"بالکل، بالکل یہی بات ہے ۔"

"تو سُنیئے، ہم کسی کو نہیں ماریں گے۔ ہم انھیں زندہ رکھیں گے۔ کیونکہ میرے خیال میں جینے سے بڑھ کر اور کوئی سزا نہیں ہوسکتی ـــــــــ

اچھّا اب اجازت دیجیئے تاکہ میں اپنا افسانہ مکمل کرلوں۔'

ٹھیک، لیکن آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں آپ کا امیر ہیرو اور اپنی امیر ہیروئن لے کر ایک کہانی اور لکھوں گا اور آخر پہ دونوں کو مار دوں گا۔"

"آپ کے من میں جو آئے، کیجئے۔ ویسے میں آپ کا غریب ہیرو اور اپنی غریب ہیروئن لے کر ایک کہانی لکھوں گا ـــــ اور آخر پر دونوں کو زندہ رکھوں گا ـــــ اچھا ـــــ خدا حافظ!!"

کی گذریں جنھیں یاد کرتے ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کسی نہ کسی طرح میں اُن شہر واسیوں سے اپنی جان چھڑا کے تو لے آیا جو میری جان کے لاگو، ہو چکے تھے۔ اپنے شہر میں پہنچا تو اُنھوں نے بھی مجھے دھر لیا اور پابہ زنجیر کر دیا۔

شہر میں یہ مُنادی کر دی گئی کہ نفرت اور دُشمنی کے زہر کو چُوسنے والے نام نہاد شنکر کو کُل شہر واسیوں کے سامنے سنگسار کر دیا جائے گا۔

اگلے روز مجھے ایک بہت بڑے میدان میں ایک کھمبے کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا اور شہر واسیوں نے نفرت اور دُشمنی کے نام پر مجھے ایک ایک پتھر مارا۔

میرا جسم زخموں سے چُور ہو گیا۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا زہریلا خون میرے جسم سے خارج ہونے لگا..... ...

پھر میرے زخموں میں پیپ پڑ گئی۔ میرے جسم کے کئی انگ گل سڑ گئے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ اب میں مر جاؤں گا اور اس طرح امن کا نقارہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گا۔

میں مرا نہیں... حالانکہ مجھے مر جانا چاہیئے تھا۔

میں جیتا رہا.... جب کہ مجھے جینے کی کوئی ہوس نہ تھی!

آدمی، آدمی کے خُون کا پیاسا تھا۔ گولیوں کی دَنا دن —— توپوں کی گھن گرج، آگ کی لپیٹیں —— بچوں کی چیخ و پُکار —— عورتوں کی دِل دوز چیخیں۔ آدمیوں کے سہمے ہوئے چہرے —— کون کس کا دُشمن تھا؟ وہ بچّہ، جس نے ابھی تُتلانا بھی نہ سیکھا تھا۔ وہ بُوڑھا، جو چلنے پھرنے سے معذور ہے —— وہ عورت، جو حاملہ ہے اور جس کے پیٹ میں اُس کا پہلا بچّہ ہے ——؟ یا وہ آدمی، جو ابھی ابھی ایک زخمی کو بچانے کے لئے اپنا خون دے کے آیا ہے ——؟

اگر کوئی کسی کا دُشمن نہیں تو پھر یہ قتل و غارت کس لئے؟ پھر یہ خُون خرابہ کیوں؟

رکھ دیا تھا۔ جانے کیوں مجھ سے پھولوں کا مرجھانا دیکھا نہیں جاتا!

برسوں پہلے جب میں نے چلنا پھرنا سیکھا تو میرے قدم خود بخود اُس سمت اُٹھے جہاں اُونچی اُونچی فصیلیں کھڑی تھیں۔ یہ فصیلیں میرے بزرگوں نے اپنے تحفظ کے لئے کھڑی کی تھیں۔ میں اُن فصیلوں کو روندتا، پھاندتا ایک نئے شہر میں پہنچ گیا جو میرے لئے اجنبی ضرور تھا مگر جہاں کے واسی میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔ ہر چہرہ مانوس، کوئی غیر نہیں۔ کوئی بے گانہ نہیں ——

اُس شہر کے واسیوں نے میری ایک آنکھ پھوڑ دی۔ کیونکہ میں اُن کی اجازت کے بِنا اُن کے شہر میں وارِد ہوا تھا۔

اپنوں نے میری ایک ٹانگ توڑ دی، کیونکہ میں اُن کی ممانعت اور مخالفت کے باوجود اُن لوگوں سے مِلنے گیا تھا جو اُن کی نظر میں اُن کے دُشمن تھے۔ اس شہر کے دُشمن تھے —— امن کے دُشمن تھے —— انسانیت کے دُشمن تھے۔

اب میں ایک ٹانگ اور ایک آنکھ کا کھِلونا ہوں۔ اور اس کھِلونے کے ساتھ یہ المیہ ہے کہ نہ یہ دوڑ سکتا ہے، نہ یہ بھاگ سکتا ہے۔ نہ یہ بول سکتا ہے اور نہ ہی یہ سُن سکتا ہے —— عجیب بے لبسی ہے ——! کہیں تو کس سے کہیں —— سُنائیں تو کون سُنے ——

اب اس ایک ٹانگ اور ایک آنکھ کے کھِلونے سے سب کھیلتے ہیں —— کھِلونا جو ٹھہرا ——

ایک روز میری بدنصیبی مجھے پھر اُسی شہر . . . میں لے گئی جہاں میں ایک بار اپنی آنکھ پھوڑ کے آیا تھا۔

اُس روز اُنھوں نے مجھے پابجولاں کر دیا۔ میں نے اُنھیں پیار و محبت کے واسطے دِیئے مگر اُنھوں نے میری ایک نہ سُنی۔ تین دِن اور تین راتیں مجھ پر ایسی قیامت

آواز کا گھاؤ

روشن لال روشن

"راج ناتھ نے سنیاس دھارن کر لیا تھا۔" ——— "اچھا ہی تو کیا تھا۔" ———

"نوکری پر لات مار دی۔" ——— "چھی، چھی ——— مردانگی پر بھرپور چوٹ۔" ———

"نوکری سالی ——— یہ کون سی ایسی چیز ہے جس کی خاطر آدمی کو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں،

نوکری سے پہلے جو حالت ہوتی ہے، وہ تو ہوتی ہی ہے۔ لیکن نوکری ——— اس کے

حاصل ہونے کے بعد بھی آدمی کو چین و آرام نہیں ملتا۔" ——— "پھر کیا بھیک مانگ

لیتا راج ناتھ؟" ——— "بالکل! فرد کی آزادی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آزادی

کسی بھی پابندی کو قبول نہیں کر سکتی۔ اپنی فطرت پر بے سود پابندیاں لگوانے کی آرزو

کیسے ہوا کرتی ہے؟" ——— "بلّی بھی تو سات گھر چھوڑ دیا کرتی ہے، اپنے سکون

کی خاطر۔ پھر جہاں دیواریں پانی بھرا ہو، وہاں ———" "کیسا سکون ———؟ مشینوں

کیا تخریب ہی آج کے انسان کا منتہائے مقصود ہے ؟ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ سب کیوں ہے ؟ کیوں ہے ؟؟ کیوں ہے ؟؟؟

لوگوں نے اچھا کیا کہ جو مجھے ناکارہ بنا کے رکھ دیا۔ کیونکہ اس طرح اب میں نہ چل سکتا ہوں، نہ دیکھ سکتا ہوں۔ نہ بول سکتا ہوں، نہ ہنس سکتا ہوں۔ نہ رو سکتا ہوں!

اتنے بڑے المیہ کے باوجود بھی میں جی رہا ہوں ـــــ جی رہا ہوں ـــــ

اسی طرح نہ جانے کتنے یگ بیت گئے ـــــ

ایک دن میں نے کیا دیکھا کہ سارا شہر میری ہی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے ـــ اور اُن کے ہاتھوں میں آج پتھر نہیں، پھُول ہیں ـــ رنگ برنگے پھُول ـــ نیلے پیلے پھُول۔ قرمزی رنگ کے پھُول ـــ سفید، سیاہ، گلال جیسے پھُول ... ...

مجھے پھُول بہت پسند ہیں، دیوانہ جو ٹھہرا ... ...

تحریک اور ترغیب ملی مجھے، لوگوں سے راج ناتھ کی کہانی سُن کر۔ میں نے راج ناتھ سے مُلاقات کرنے کی ٹھان لی۔ ایک زندہ اور جاوید کہانی کا کِردار ـــــ راج ناتھ! خزاں رسیدہ آتشیں چنار کی طرح وہ سوالات کی چار دیواری میں مُقیّد ـــــ اپنے سامنے دیکھتے ہی میرے لبوں سے نِکل گیا ـــــ "میں ایک کہانی کار ہوں۔ آپ کا عالیہ قدم مجھے عجیب و غریب لگا۔ آپ نے سنیاس لیا۔ اور اُس کے بعد واپس لوٹ آئے۔ میرے تجسّس کی خاطر آپ چند منٹ ضرور عنایت فرمائیں گے ـــ اپنی بپتا سُنا کر۔"

"زخم کریدنے سے آپ کو کیا ملے گا؟ اُن سے بدبُودار پیپ نکل جاتی ہے؛ اور یہ بدبُو میری نس نس میں سرایت کرجائے گی۔ مت کُریدو ان زخموں کو۔ میرے ساتھ ساتھ آپ کا من بھی خراب ہوجائے گا ـــــ" راج ناتھ کی مایوسی اُس پر غالب آچُکی تھی؛ موقعہ گنوانا میں نے مُناسب نہیں سمجھا۔

جس طرح آدمی اپنے غم میں دوسروں کو شریک پاکر مطمئن ہوجاتا ہے، اُسی طرح آپ بھی اپنا غم مجھے دے سکتے ہیں ـــــ اپنی بپتا سُنا کر ـــــ آپ کا جی بھی ہلکا ہوجائے گا ـــــ" ان باتوں نے راج ناتھ کو ہتھیار چھوڑنے پر آمادہ کرلیا۔

"یہ زِندگی میرے لئے ایک اُبلتا ہوا دریا اور اندھیرا قبرستان بن گئی ہے۔ زِندگی کے بوجھ کو جواں مردی سے اُٹھانا میں نے سیکھا نہ تھا۔ آج کل کی دُنیا میں ہر ایک شخص اپنے مطلب کی طرف دیکھا کرتا ہے۔ میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ گاہک بھٹک کر، دُکان کی طرف آتا ہے؛ اُس کا تو مقصد ہی وہاں آنے کا ہوا کرتا ہے ـــ" ایک ٹھنڈا سانس لینے کے بعد وہ پھر شروع ہوگیا ـــــ

"میری دو جوان بیٹیاں ہیں۔ بیوی مذہبی عورت ہونے کے ساتھ ساتھ سیدھی سادی بھی ہے۔ مغربی تہذیب کی چکاچوند سے میں نے اپنے گھر کے مشرقی ماحول کو مُنوّر

کے اس دور میں ایک پاگل ہی سکون کی تلاش میں سرگرداں ہو سکتا ہے ۔"

سگریٹوں کا دھواں ، کافی کی اُٹھتی ہوئی بھاپ ۔ کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوئے چند دانشور قسم کے لوگوں کی مختلف آوازیں، ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہی تھیں ۔ دنیا بھر کے واقعات وحالات پر تبصرہ کرنے کے بعد یہ لوگ راج ناتھ کی ذات پر آگئے تھے !

راج ناتھ کا ذکر شہر بھر کے اخبارات میں ایک عجیب وغریب کہانی کے ساتھ شائع ہوا تھا ۔ اس کی غیر موجودگی میں اسے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقعہ دیئے بغیر اس کی ذات پر یہ لوگ طنز کے تیر چلا رہے تھے ۔ آہ —— بے چارہ راج ناتھ !

کہنے والے کہتے ہیں کہ راج ناتھ نے سکون کی تلاش میں اپنا گھر بار چھوڑ دیا ۔ کچھ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ گھر کی نقدی سمیت اپنی محبوبہ کی تلاش میں رفوچکر ہو گیا ہے ۔ کئی لوگ کہتے ہیں راج ناتھ خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا ۔

خودکشی کا اقدام قانوناً جرم ہے ۔ اور ہر ایک مذہب کے نقطۂ نظر سے عظیم گناہ بھی ! زندگی کے میدان سے ہمت ہار کر بھاگنا بھی تو خودکشی کہلائی جا سکتی ہے ۔ لیکن راج ناتھ کو پھر سے دوڑ لگانے کے لئے میدان میں کیوں لوٹنا پڑا —— وہ تو اب سنیاس لینے کے بعد دوبارہ نوکری کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے ۔ کیوں ؟ وہ زمین پر پھینکی ہوئی تھوک مٹی اور غلاظت سے اٹی ہونے کے باوجود بھی چوسنے پر آمادہ ہے !

عام آدمیوں کی طرح وہ اب پھر مشین بن جائے گا ۔ لیکن اس کا وقار ، اس کی ساکھ اور اس کی عزت ۔ اس نے تو پوری طرح سے اپنے آپ کو ایکس پوز کیا ہے ۔ مرد ذات پر وہ ایک سیاہ دھبہ ہے ۔ کم ہمت ، جاہل اور نادان ہے ۔ آج کل بنی بنائی اور پکی پکائی کھیر کون چھوڑ سکتا ہے ! راج ناتھ جیسا کوئی خدا کا بندہ —— یا کوئی ایسا گھر جمائی ، جو اپنی بے وقوفی کی وجہ سے سسرال میں اپنی رہی سہی ساکھ ختم کر ڈالتا ہے ، ساس سسر ، اُن کے رشتہ داروں یا اپنی شریکِ حیات پر رعب جما کر ——

بھرم ٹوٹ چکا تھا۔ پریشانیاں حد سے بڑھ گئیں۔ پریشانیوں کے بادل چاروں طرف سے مجھے گھیرے میں لیتے گئے۔ کامنی خون اُگلتی گئی ـــــ تھوک کے ساتھ۔ خزاں کے پھول پر کیا کبھی بہار آتی ہے؟ یہ سوال مجھے خوف زدہ اور پریشان کرنے کے لئے کافی تھا۔ کامنی خزاں کے مرجھائے ہوئے مسکراتے پھول کی طرح نظر آنے لگی ـــــ نہ جانے کب تیز ہوا کا جھونکا اُس کی پتیاں بھی اُڑا کے لے جائے ـــــ یہ سوچ سوچ کر میں پاگل ہوگیا۔ اور آخر تنگ آکر میں نے گھر بار چھوڑ دیا۔

میں آزاد تھا۔ کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا! میرے رشتہ داروں نے واپس بلانے کے لئے یہ بہانہ گھڑ لیا کہ میں گھر کی نقدی اور بیوی کے زیورات لے کر بھاگ گیا ہوں۔ پولیس نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ میں نے فرار ہونے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن میں واپس لوٹ آیا۔ اپنی دوسری بیٹی کی آواز کی بازگشت مجھے دوسروں کی آواز محسوس ہونے لگی۔ گھر سے سنیاس پر نکلنے کے بعد یہی آواز میرا پیچھا کرتی رہی ہے ـــــ پاپا ـــــ آپ کا دوست رمیش بابو ہے نا۔ روز تحفے اور تحائف لاتا ہے میرے لئے۔ یہ سب وہ پہلے کامنی دیدی کو دیا کرتا تھا۔ کیا کامنی دیدی اب چھوٹی ہوگئی ہے ـــــ اور میں بڑی؟

کرنا شروع کیا اور یہی میری غلطی تھی۔ اپنی بڑی بیٹی کے ساتھ میں اکثر اُن لوگوں کے درمیان جا پہنچتا، جنھیں ہم بڑے لوگ کہتے ہیں۔ میری موجودگی میں یہ لوگ میری بیٹی کے ساتھ ہنس لیا کرتے تھے۔ پارٹیاں ہُوا کرتی تھیں۔ میری بیٹی کو دیکھ کر وہ کھِل جایا کرتے تھے۔ ہوٹل، ریستوران، سینما، ڈانس رُوم، کیرم، تاش۔۔۔ دِل بہلائی کے یہ سب سامان مجھے میسّر تھے۔ "زندگی ایک تفریح گاہ ہے، اِس سے ہر وقت استفادہ حاصل کیا کرو۔" یہ بات مجھے بتائی تھی رمیش نے ــــــ ایک کلاس وَن آفیسر ہے رمیش۔ تفریح مِل جاتی ہے، اُونچی سوسائٹی میں رہ کر۔۔۔ اس طرح دِل کشی کی دھوکا دینے والی صورت مجھ پر اثر انداز ہو گئی۔۔ جن کا کھایا جاتا ہے اُنھیں کھِلانا بھی پڑتا ہے۔ اُونچی سوسائٹی کا یہ ایک اُصول ہے۔ میں کماتا رہا۔ پیسہ خرچ ہوتا رہا۔ رِشوت کے طور پر کتنا حاصل ہو جاتا تھا، میرے پاس اس کا کبھی حساب نہ رہا!

وقت کا دھارا چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ میری اُدھیڑی آمدنی پنشن کا زینہ طے کرتی گئی اور کافی کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ خزاں چپکے سے میرے گھر پر دستک دے چکی تھی۔ میری بیٹی، کامنی ــــــ ہنسنے ہنسانے والی کی موہنی صورت نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ رمیش اُسے لینے نہیں آتا تھا۔ جس کی مجھے اُمید تک نہ تھی ــــــ وہی ہوا۔ میری آنکھوں پر پڑا ہوا دبیز پردہ سرکنے لگا۔

بدنامی اور بے عزّتی کا داغ کون باپ اپنے دامن پہ دیکھنا گوارا کر سکتا ہے، کامنی کے ہاتھ پیلے کرنے کی مجھے بہت دیر بعد فکر ہوئی تھی ــــــ جس نے بھی دیکھا، وہی کہنے لگا۔ "کیا پڑی ہے مُفت میں دِق کا مرض مول لینے کی ــــــ کسی نے کامنی کا ہاتھ تھامنے کا اقرار بھی کر لیا تھا ــــــ بھاری جہیز کی شرط پر ــــــ اور جہیز میری بساط سے باہر ــــــ جس کے آگے بھی ہاتھ پھیلائے ــــــ اُسی نے ٹھکرا دیا۔

بوٹیاں میرے کہر زدہ ذہن میں رقص کرنے لگیں۔

حدِ نظر تک صرف۔ بے چارگی اور بے کسی کی لاشیں اور تعفّن زدہ سوچیں بکھری ہوئی تھیں۔ دھند دھیرے دھیرے چھٹنے لگی اور وقت کی بکھری ہوئی کرچیں سمٹنے لگیں۔ مُردہ خور گِدھ یک بیک غول کے غول اُمڈے چلے آرہے تھے۔ چشم زدن میں صرف سایے تھے جو پوری فضا پر مسلّط ہو چکے تھے۔ فقط کالے کلوٹے سایے!

وہ چہرہ اب میرے سامنے ایک زندہ حقیقت بن کر کھڑا ہو گیا۔ میں غور سے سُن رہا تھا اس چہرے کے ہر ایک داغ کو، جسے میں نے بری طرح نوچ ڈالا تھا۔ مگر پھر بھی یہ چہرہ خوبصورت، سحر آگین تھا اور مکروہ بھی ———— ہاں مکروہ!! جس نے میری زندگی میں بے بسی اور بے کسی کے اُن تعفّن زدہ لمحوں کو جنم دیا جو کسی زہریلی بیماری کے خوفناک جراثیم کی طرح ہر لحظہ طوفانی رفتار سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

میری سوچیں! میری ناسُور زدہ سوچیں! جن میں سے پیپ کا ایک قطرہ ٹپک پڑنے کو بے قرار ہے۔ ہاں میرے نہ چاہتے ہوئے بھی قطرہ ٹپک گیا اور اپنے ساتھ بہا کر مجھے بھی اسفل السّافلین میں لے گیا۔

میں جی بھر کے قہقہے مارنا چاہتا تھا۔ مگر میرے زہر میں بجھے تیروں کی طرح رسیلے قہقہوں کو کوئی نہیں سُن رہا تھا۔ وہ بھی نہیں، جو میرے قریب ترین ہے اور وہ بھی نہیں، جو میرے اندر بیٹھا مجھے تھپک تھپک کر سُلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اور پھر اچانک ایک شبہے نے کسی خطرناک سانپ کی طرح اپنا پھن پھیلا دیا۔ میں کس پہ ہنس رہا ہوں۔ اور پھر سوالات کا تانتا بندھ گیا۔ مگر اچانک میرے ذہن کو چیرتی ہوئی ایک لمبی گونج پھسلتی چلی گئی۔ ایک خوفناک اور فکر انگیز گونج!

"نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد"

مجھے لگا جیسے میرا وجود پگھل کر ایک قطرے میں تبدیل ہوا ہے اور یہ تیزاب کا قطرہ

......اور قطرہ ٹپکا!

مسعود سامون

صرف دہکتے ہوئے جذبات تھے۔ سمندر اپنی محدود حدود کو پھاند کر لامحدود خلاؤں میں پھیل جانا چاہتا تھا۔ آگ ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لینے کو بے قرار تھی۔ دھیرے دھیرے طوفان شدت اختیار کرتا گیا اور آگ ہر ممکنہ چیز کو اپنی لپیٹ میں لینے کو بے چین آگے بڑھنے لگی۔ پوری کائنات میں صرف چند دہکتی ہوئی، بپھری ہوئی اور ہانپتی ہوئی سانسیں تھیں۔ فقط سانسیں! اور کچھ بھی نہیں!

قطرہ جھلملا رہا تھا۔ صدیوں سے منتظر بے قرار قطرہ ٹپکا اور فضا کی لامحدود پنہائیوں میں تحلیل ہو گیا۔

درد جوں ہی حد سے گزرا، دوا ہو گیا۔ میں سر پٹختا ہی رہ گیا اور قطرے کا حجم اس تیزی سے بڑھنے لگا کہ میں صرف آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا اور گوشت کی چھوٹی بڑی

باجی

یاسین فردوسی

"تم دیکھ لینا باجی۔ آج رات میں ضرور مر جاؤں گی!"

"پگلی ——— ایسی باتیں نہیں کیا کرتے!"

"نہیں باجی۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ اتنے دن ہوئے ہیں مجھے خون تھوکتے ہوئے۔ میرے ہاتھ پیروں پر ورم چڑھ آیا ہے۔ بات کرتی ہوں تو میرا دم پھول جاتا ہے۔ جب ایسی حالت ہو تو کوئی کیسے زندہ رہ سکتا ہے!

"جاؤ میں نہیں سنتی تمھاری باتیں۔"

"سن لو باجی۔ میں تمھیں روز روز پریشان کرنے تھوڑی آؤں گی۔ مرتے ہوئے دشمن کو بھی دو گھونٹ پانی دے دیتے ہیں۔ میں تو پھر تمھاری بہن ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ میں اپنے دل کی بات دل کے اندر ہی لے جاؤں۔ کیا تم اپنی بہن کی ذرا سی بات بھی نہیں

میرے ذہن پر گِرا چاہتا ہے۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں نہ بچ نہ سکا اور قطرہ ٹپک کر
میرے ذہن کے پردوں کو قطار اندر قطار چھیدتا ہوا گزر گیا۔ میری کمزور نظریں اُس
کا تعاقب کرنے کی کوشش میں تھک کر نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔
حدِ نظر تک صرف تپتی ہوئی ریت تھی۔ دُھوپ پگھل رہی تھی۔ لیکن میں دُنیا و مافیہا
سے بے خبر بھاگ رہا تھا۔ اپنی ہی دُھن میں مگن یہ سوچنا بھی بھُول گیا کہ میں کیوں
دوڑ رہا ہوں۔ مگر پھر بھی جیسے تیز سے تیز تر بھاگنا ہی میری زندگی کی آخری ضمانت ہو۔
کتنی بار مجھے ٹھوکریں لگیں۔ مگر میں اُٹھ اُٹھ کر بے تحاشا بھاگتا جا رہا تھا۔ کوئی غیر
مرئی اور مقناطیسی قوت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور میں بغیر مدافعت کیے
کھِنچا چلا جا رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے میں بستر پہ گِرا۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھی اور تشویش
زدہ انداز میں میرے مُنہ میں تھرمامیٹر رکھ دیا۔ پارہ دھیرے دھیرے چڑھنے لگا۔ پھر
بالکل اُسی رفتار سے بھاگنے لگا، جیسے میں خود دوڑ رہا تھا۔ جب پارہ اپنی تڑپ
کی آخری حدود کو چھُونے لگا تو میرے وجود کی کرچیں پارے میں سمٹ گئیں۔ ڈاکٹر
کی لاکھ کوششوں کے باوجود پارہ تڑپ کر اُچھلا اور دہکتی ہوئی بھٹی میں گِر گیا۔ میٹھی
میٹھی آگ بھڑکتی رہی اور میں سوچتا ہی رہ گیا!
مگر وقت ٹپک چُکا تھا ——— !!

ڈھونڈتی رہی۔ لیکن وہ رُومال تمھیں نہیں مِلا۔ اور مِلتا بھی کیسے! وہ رُومال تو میں نے اپنے دُولھا کو جا کر دے دیا تھا۔ اور اُسے بتایا تھا کہ ہمارے پاس ایک بہت بڑے بکس میں ایسے بہت سے رومال بھرے ہوئے رکھے ہیں ــــــ رُومال پا کر وہ بہت خوش ہوا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا ...... "تم بہت امیر ہو؟"

میں نے کہا ــ "ہاں میں بہت امیر ہوں۔" ...... وہ بولا ــ "میں بھی بہت امیر ہوں!" "امیر، امیر سے شادی کرتے ہیں۔ اور غریب، غریب سے۔" ...... اس لئے میری شادی تمھارے ساتھ ضرور ہوگی!"

"لیکن باجی، تم تو جانتی ہو کہ ہم لوگ غریب ہیں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ اُس وقت مجھے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ امیر کیسے ہوتے ہیں اور غریب کیسے ہوتے ہیں۔ پر اُس دِن کے بعد سے میں نے سوچنا شروع کر دیا۔ میں نے ابّا جان سے پوچھا تھا تو اُنھوں نے بتایا تھا کہ ہم لوگ غریب ہیں۔ اُن کے مُنہ سے یہ بات سُن کر مجھے بڑا افسوس ہوا تھا۔ میرا دِل چاہتا تھا کہ میں پھُوٹ پھُوٹ کر روؤں۔ آخر ابّا جان کو یہ کیا سُوجھی جو وہ بیٹھے بِٹھائے غریب بن گئے۔ اگر امیر بن جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ خواہ مخواہ غریب بن کر ایسے اچھے داماد سے ہاتھ دھو لینا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے اُسے یہ بات نہیں بتائی۔ یہی کہتی کہ میں امیر ہوں ــــــ ابّا جان بھلے ہی چھوڑ دیتے، لیکن میں اتنا اچھا، اتنا پیارا سا دُولھا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔"

وہ سچ مچ امیر تھا۔ ڈھیر سارے چاکلیٹ میرے لئے لے کر آتا۔ اس کی دیکھا دیکھی سے میں نے بھی اچھے اچھے قیمتی کپڑے پہننے شروع کر دیئے۔ میں بھی تمھارا خوشبودار تیل لگا کر جاتی۔"

وہ کہتا ــ "میرے سر میں جو تیل پڑا ہوا ہے، اُسے بس امیر آدمی ہی لگا سکتے ہیں۔"
میں کہتی ــ "ہاں میرے سر میں جو تیل لگا ہوا ہے اُسے بس امیر لوگ ہی لگایا کرتے

سُنو گی۔ تم سُن رہی ہونا ... ... ہوں ـــ"

میں نے اس بات کو برسوں سے اپنے سینے میں دبائے رکھا ہے۔ برسوں میں نے اپنے آپ سے لڑتے لڑتے گزارے۔ بہت دِنوں کی بات ہے۔ میں بالکل چھوٹی سی تھی۔ دولہاں بھائی کے ساتھ تمُھاری تازہ تازہ منگنی ہوئی تھی۔ اُن دِنوں تمھیں یاد ہو گا۔ باجی ایک بار میرے پیچھے ایک کُتّا دوڑا تھا۔ میں بھاگتے بھاگتے ایک نالی میں گر گئی تھی۔ اور میری شلوار گھُٹنوں تک پھٹ گئی تھی۔ میرے گھٹنے بالکل چھِل گئے تھے

... ... یاد ہے؟ ... ... یاد ہے ... ... ہاں ہو ـــ"

"تو پھر تمھیں وہ لڑکا بھی یاد ہو گا۔ وہی چھوٹے چھوٹے سیاہ بالوں والا لڑکا، جو مجھے نالی سے اُٹھا کر گھر لایا تھا۔ راستے میں اُس نے میرے آنسو پونچھے تھے۔ مجھے چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا کھانے کے لئے دیا تھا۔ اور مجھ سے کہا تھا ـــــــ

"چُپ ہو جاؤ منّی۔ اگر تم چُپ ہو جاؤ گی، ہم تمھارے ساتھ شادی کر لیں گے۔"

"اور میں ہنسنے لگی تھی۔ میں چوٹ کو بھُول گئی تھی۔ کیونکہ مُفت میں مجھے ایک اِتنا اچھّا دُولہا مِل گیا تھا ـــــــ

"اور باجی میں سچ کہتی ہوں۔ اُس روز میں اُس لڑکے کے ساتھ اپنے گھر نہیں آئی تھی۔ بلکہ اپنے دُولھا کے ساتھ اپنے میکے آئی تھی ... ... جب وہ چلا گیا، تب کہیں مجھے اپنی چوٹ اور تکلیف کا احساس ہوا، اور میں خوب روئی۔"

اس کے بعد باجی مجھے وہ سڑک پر کئی بار مِلا۔ کبھی میرے لئے پھُول لے کر آتا اور کبھی چاکلیٹ۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرے گا۔ کیونکہ میں اُس کی چھوٹی بہن کی طرح روئی نہیں تھی اور ذرا ذرا سی بات پر مچلتی نہیں تھی ـــ

اُن دِنوں دُولھا بھائی نے تمھیں ایک خوب صورت سا رُومال لا کر دیا تھا۔ جو خود بخود تمھارے بکس سے غائب ہو گیا۔ اور تم کسی سے کچھ کہے بغیر اُسے ہر جگہ

کسی اچھے رشتے کے لئے اُمّی نے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے میں
اس کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ بس میں نے آہستہ سے کھڑکی بند کرلی۔ میرا پورا
چہرہ لال ہوگیا۔ دِل چاہا کہ کھڑکی کی دراز میں سے جھانک کر دیکھوں کہ وہ موٹر
سائیکل پر بیٹھا کیسا لگ رہا ہے! لیکن باجی ... میری طبیعت خراب ہونے
لگی۔ مجھے چکّر آنے لگے۔ جب وہ پھٹ پھٹ کرتا ہوا چلا گیا، تب کہیں میرے دِل
کو سکون حاصل ہوا۔

میں کسی وقت بھی اُس سے ہار ماننے کے لئے تیار تھی۔ میں کیوں ہار مانتی۔ میں جانتی
تھی کہ اس بہار کو ایک نہ ایک دِن ختم ہو جانا ہے۔ کیوں نہ اسے کچھ دیر تک اور روکنے کی
کوشش کروں۔ میں اکثر یہی سوچا کرتی کہ اس پر اپنی امارت کا رُعب کیوں کر جماؤں
آخر میری سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔ دُولھا بھائی نے مجھے سونے کی انگوٹھی لاکر دی
تھی۔ یہ پہلی اور آخری چیز تھی جو میرے پاس خالص سونے کی تھی۔ ایک دِن جب
وہ ایک خوب صورت رُومال میں مٹھائی لے کر آیا اور میری کھڑکی میں رکھنے لگا تو میں نے
دھیرے سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اپنے جسم میں مچلتی ہوئی بجلیوں کی کڑک
بھی محسوس کی۔ بس اپنی اُنگلی سے انگوٹھی اُتار کر اُس کی بھری بھری اُنگلی میں ڈال دی۔
اُس نے ایک بار انگوٹھی کی طرف دیکھا۔ دوسری بار میری طرف اُس کی آنکھوں میں خوشی
کے مارے پانی اُتر آیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ کچھ مسکرا کر، کچھ شرما کر اُس
نے اپنی اُنگلی ہونٹوں کے پاس لے جا کر انگوٹھی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے اور پھر شرمایا۔
اتنا شرمایا کہ بغیر میری طرف دیکھے، بغیر میرا شکریہ ادا کئے اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر
ہوا ہوگیا۔ بعد میں، اُمّی میرے اُوپر کتنا ناراض ہوئیں۔ گھر کا کونہ کونہ چھان مارا گیا،
لیکن انگوٹھی نہ ملی۔ میں نے کہہ دیا کہ منہ دھوتے وقت میں نے انگوٹھی اُتار دی تھی۔ پھر
پہننا بھول گئی۔ یہ تو کسی کو خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ میں نے انگوٹھی کسی اور کو پہنا
دی ہوگی! سب نے یہی سوچا کہ کوئی اُٹھالے گیا۔ اور اس طرح یہ بات خود بخود آئی

ہیں۔" وہ کہتا ــــــ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری تمہاری شادی ہو جائے گی"

اور میں سر ہلا کر حامی بھر لیتی!

"عجیب زمانہ تھا وہ، جانے کیا بات تھی کہ میں تم سے بھی جلنے لگی تھی۔ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ تم مجھ سے زیادہ امیر ہو۔ جبھی تو تمہارے پاس اتنے اچھے اچھے کپڑے ہیں۔ اور بالوں میں لگانے والا خوشبودار تیل ہے۔ کریم ہے، پاؤڈر ہے ــــــ اُن دنوں میں بات بات پر مچلتی اور ضد کیا کرتی تھی کہ جو چیزیں باجی کے پاس ہیں، وہ ہم بھی لیں گے ــــــ بڑے عجیب دن تھے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اور کس طرح وہ دن چپکے سے ہوا کے کسی جھونکے کی طرح سرسراتے ہوئے گزر گئے ــــــ میں بڑی ہونے لگی۔ میرا پردہ کرا دیا گیا۔ تمہاری شادی ہو گئی ــــــ لیکن یہ سامنے والی کھڑکی ہے نا ــــــ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی۔ اچھے اچھے کپڑے پہن کر ــــ متوالی چال ــــ وہ ادھر سے گزرتا وہ بھی کافی بڑا ہو گیا تھا۔ وہ لمبا سا اور موٹا موٹا سا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکراتا۔ کبھی کبھی کھڑکی میں مٹھائی کے ٹکڑے ڈال کر جاتا۔ میں یہی سوچا کرتی تھی کہ میں غریب ہوں۔ میرے ابا جان ایک کلرک ہیں۔ میری اور اُس کی شادی نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ وہ خود کہہ چکا ہے کہ امیر کی شادی، امیر سے ہوتی ہے۔ پھر بھی میں اُسے دھوکے میں رکھے ہوئے تھی۔ میں نے اُس پر یہ بات کبھی کھلنے نہ دی کہ میں غریب ہوں۔ میں جانتی تھی کہ اگر اُسے میری غریبی کا پتہ چل گیا تو وہ میری اور نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ اب میں امیری اور غریبی کے فرق کو خوب محسوس کرنے لگی تھی! ــــ جھوٹے موتیوں اور نقلی سونے کے زیورات، پہن کر میں اُس کی برابری کرتی تھی ــــ ایک دفعہ تو باجی وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر نکلا۔ میری کھڑکی کے پاس موٹر سائیکل روکی اور مجھ سے پوچھنے لگا ــــــ "کیسی ہے یہ ــــ ابا نے ہمارے لئے خریدی ہے۔" میں کوئی بچی تو نہیں تھی، خاصی بڑی ہو گئی تھی کہ میرے

میں سر سے پاؤں تک لرزنے لگی۔ یہ انعام تھا ایک غریب لڑکی کی محبت کا، جو اُس کے امیر محبوب نے اُسے دیا تھا۔ اور یہ تھا وہ تاج محل، جسے میں اپنے دِل کے ٹکڑوں سے اپنی محبت کی حفاظت کے لئے تعمیر کر رہی تھی ... ...

کچھ دیر بعد جب میری طبیعت کچھ سنبھلی اور بہتے ہوئے آنسوؤں کا طوفان تھم سا گیا۔ میں نے اُٹھ کر خون آلود بلغم پر راکھ ڈال دی۔ گلوبند اپنی اٹیچی میں چھپا کر رکھ دیا۔ اور ایک دِن جب اُمی جان، برابر کے گھر میں گئی ہوئی تھیں، میں نے گلوبند کو اُس پاس والے درخت کے نیچے گاڑ دیا۔ گلوبند آج بھی وہیں دبا ہوا ہے۔ جب میں مر جاؤں تو باجی وہ گلوبند اُسے دے دینا۔ اُس سے کہہ دینا کہ میں بالکل کنواری اور بالکل پاک تھی۔ اپنی اس چھوٹی سی زندگی کے کسی بھی لمحے میں۔ میں نے اُس کے تصوّر کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا ... ...

باجی ایت وار کی شام کو وہ یہاں آتا ہے۔ کھڑکی کے چکر لگاتا رہتا ہے۔ پانچ مہینے سے زیادہ دِن ہو گئے ہیں۔ اُسے ایسا کرتے ہوئے۔ لیکن میں کھڑکی نہیں کھولتی۔ میں غریب ہوں اور بیمار ہوں۔ میری غربت میرے اور اُس کے درمیان ایک آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی ہے۔ اور اب میری بیماری نے تو اس دیوار کو اور اُونچا اور ناقابلِ عبور بنا دیا ہے۔ میں اُس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی! نفرت بھی نہیں کر سکتی۔ ہاں اگر میں بھی امیر ہوتی ... ... اگر میرے ابّا جان بھی کسی قابل ہوتے ... ...

"دیکھ پڑ گیا نا کھانسی کا دورہ ... ... میں پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ یہ باتیں صبح کو بھی ہو سکتی ہیں۔"

ایت وار کی شام کو باجی نے اُسے گھر میں بُلوایا۔ پلنگ پر بٹھانے کے بعد اُنھوں نے گلوبند لا کر اُس کے سامنے رکھ دیا ... ..."اسے پہچانتے ہیں آپ؟ ... ..."جی!"

وہ بوکھلا گیا۔ پھر اپنے حواس قابو میں لاتے ہوئے بولا: "یہ گلوبند میری مرحوم ماں کی

گئی۔ میں بہت خوش تھی۔ میں نے اُسے سونے کا تحفہ دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اُس کی نظروں میں بے حد بلند کر دیا تھا۔ میں نے اُسے ایک ایسا تحفہ دیا تھا جو صرف امیر لوگ ہی دے سکتے ہیں ... ...

لیکن میرے دل میں ایک چور چھپا بیٹھا تھا۔ جو بار بار مجھے یاد دلاتا تھا کہ میں غریب ہوں اور وہ امیر ہے۔ وہ آسمان کا تارا ہے۔ اور میں زمین کا ایک ذرّہ ہوں۔ میرا اور اُس کا ساتھ نہیں ہو سکتا ــــــ میں سب کو فریب دے سکتی تھی لیکن اپنے آپ کو کہاں تک فریب دے دیتی! نتیجہ یہ ہوا کہ میں اُداس رہنے لگی۔ میں اکثر راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر رویا کرتی اور دُعائیں مانگا کرتی تھی۔ یہ امیری و غریبی کا سوال کیوں پیدا ہوا تھا؟ کس نے پیدا کیا ہے؟ میں نے بہت سوچا۔ بہت غور کیا، لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ بس راتوں کو روتی رہتی اور دُعائیں مانگتی رہتی۔ مگر باجی آنسوؤں سے دل کی سوکھی ہوئی کھیتی ہری نہیں ہوئی۔ زیادہ جاگنے اور ذہنی پریشانیوں کے باعث میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ مجھے کھانسی، نزلہ اور بخار نے گھیر لیا۔ انگوٹھی پہنانے کے اگلے ہفتہ وہ ایک خوبصورت سا ڈبّہ لے کر آیا۔ اُس کا چہرہ شرم سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ جانے وہ کیا چاہتا تھا! لیکن اُس سے کچھ کہا نہ گیا۔ ڈبّہ اُس نے کھڑکی پر رکھ دیا۔ مُسکراتے ہوئے وہ صرف "یہ ــــ یہ ــــ ناچیز ــــ" زبان سے ادا کر سکا اور چلا گیا ــــ میں نے ڈبّہ کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک بھاری سا سونے کا گلوبند تھا، جو چار پانچ تولے سے کم کا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اسے معمولی سا تحفہ کہہ رہا تھا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے مجھے پھر ہرا دیا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر کھانسنے لگی۔ پھر وہیں فرش پر بلغم تھوک دیا۔ لیکن باجی! وہ بلغم نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا میرے دل سے کٹ کر باہر آ گرا تھا۔ اس میں ہلکی سی ایک سُرخ لکیر تھی ــــ نہ جانے کہاں سے آ گئی! میرے دل میں چھپے ہوئے اُسی چور نے کہا ــــ "تجھے بڑی بیماری ہو گئی ہے۔"

کشمیری

نشانی ہے۔ مرتے وقت اُنھوں نے کہا تھا کہ یہ میں اپنی بیوی کو پہنا دوں۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو شاید آپ اُن صاحبہ کی بہن ہیں جنھیں میں نے یہ حقیر سا گلوبند دیا تھا۔ یہ ایک غلطی ہے جو جان بوجھ کر یا انجانے پن میں سرزد ہو گئی ہے۔ لیکن میں اپنی اس غلطی پر اتنا نادم نہیں ہوں۔ جتنا مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ آپ کی بہن کو میں اپنے اُدھار کپڑوں اور اُدھار موٹر سائیکل سے غلط فہمی میں مبتلا کرتا رہا ہوں تاکہ اُسے میری امیری کا احساس ہو جائے ... آپ کو معلوم ہے کہ یہ جھوٹی شان و شوکت کس قدر مُضر ثابت ہوتی ہے۔ میری معصوم بہن ہمیشہ خود کو آپ کے مقابلہ کا ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے حالاں کہ اُسے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ وہ ایک غریب باپ کی بیٹی ہے ...؟" کتنی عجیب بات ہے کہ ہم دونوں اپنے آپ کو ایک دوسرے سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ کیا میں آپ سے یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ اب جب کہ آپ سب کچھ جانتی ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ ہم ایک دوسرے سے پائدار محبت کرتے رہے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی بہن کو زندگی بھر کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا اور ... ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" باجی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی کہ

"وہ ــــ تو ــ ق ــ ب ــ ر ــ س ــ تان !"

کشمیری افسانے کا سفر

هردے کول بھارتی

کشمیری افسانوی ادب کی تاریخ کچھ اتنی پرانی نہیں کہ ماضی کے دھندلکوں میں اس کے نقوش ڈھونڈنا مشکل ہو جائے۔ حصول آزادی کے ساتھ ساتھ کشمیری افسانے کا بھی جنم ہوا۔ یہ وہ وقت تھا، جب سارے ملک میں ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی۔ یہاں یہ بحث چھیڑنا غیر ضروری ہوگا۔ کہ یہ تحریک ادب کے ارتقاء کی ایک فطری منزل تھی۔ یا کہ سیاست کے شطرنج کی ایک چال، لیکن اتنا ضرور ہے کہ کشمیر میں جن بزرگ ادیبوں نے نثری ادب کی کمی کو محسوس کر کے اس کا آغاز کیا۔ وہ اس تحریک سے گہرے طور وابستہ تھے۔ چنانچہ کشمیری افسانے کا آغاز بھی اسی تحریک سے ہوا۔

شری دینا ناتھ نادم کا افسانہ "جوابی کارڈ" اور شری سوم ناتھ زتشی کا افسانہ "یلہ پھیل گاش" کشمیری زبان کے پہلے افسانے ہونے کے ساتھ ہی ساتھ کشمیر کے نثری ادب میں ترقی پسند تحریک کے بھی جنم داتا ہیں۔ یہ تحریک ہماری ریاست میں بھی اتنی ہی منظم تھی، جتنی کہ ملک کے باقی حصوں میں، بلکہ کئی معنوں میں اس سے بھی زیادہ، دہلی، بمبئی اور الہ آباد ایسے شہروں میں
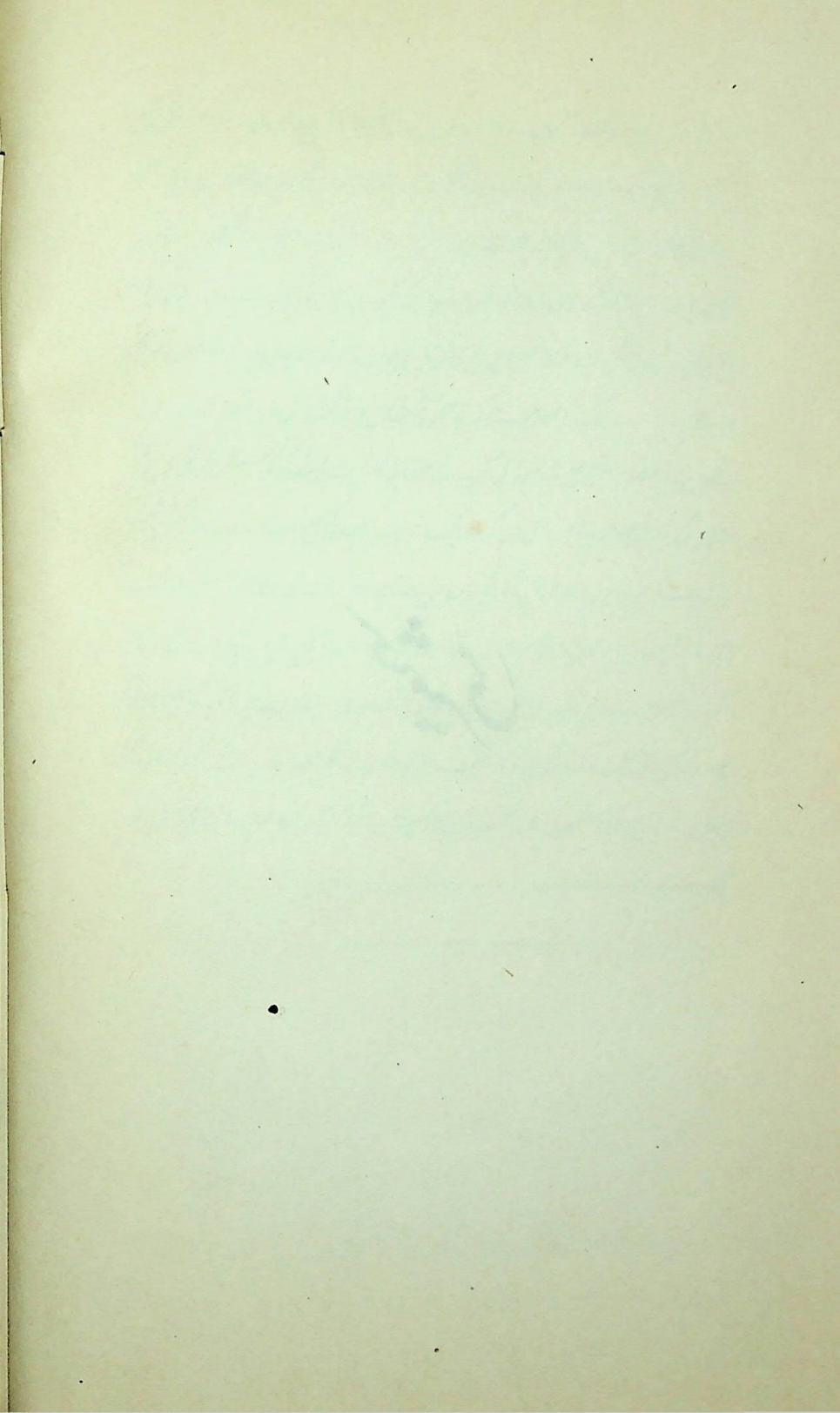
اس لگی بندھی "اصلیت" کو عوام تک پہنچانے کے عمل نے جہاں کشمیری افسانے کو ایک فنی تخلیق سے زیادہ ایک سیاسی فریضہ بنا دیا۔ وہاں اس کے موضوع اور ہیئت کو مصنوعی سطحی اور سٹیریو ٹائپ بھی بنا دیا۔ شری دینا ناتھ نادم کا افسانہ "رُے" ارجن دیو مجبوُر کا "کولہ وان" اور نور محمد روشن کا "نیہہ گٹہ" اس کی بہترین مثال ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے جیسے ایک ہی افسانے کو کرداروں کے نام بدل کر تین بار لکھا گیا ہو۔

سارے کسان چنار باغ میں جمع ہو گئے تھے۔ رحیم سوچ رہا تھا۔ آیا اُن گھروں کی حالت کیا ہو گی جہاں پچھلے کئی دنوں سے چولہا ہی نہیں جلا جن کے ہاں بیج تک میسر نہیں، وہ اٹھ کھڑا ہوا، کسانوں کی ایک ٹولی آ رہی تھی۔" کولہ وان (مدو کہ رضا کارانہ صفائی، ارجن دیو مجبوُر،

"کونگ پوش" اکتوبر ۱۹۵۰ء

سارے کسان مرد، عورتیں، بچے سلمان میں جمع ہو گئے تھے۔ اُن کے چہرے غم سے اُترے ہوئے تھے، وہ سب دم بخود تھے، تھوڑی دیر بعد ہی ندی سے نمبردار اور اس کا جلیل آتے دکھائی دیئے۔

"رُے" از: دینا ناتھ نادم، "کونگ پوش" جولائی ۱۹۵۰ء

اُوپر دیئے گئے اقتباسات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس دور میں جو کچھ بھی لکھا گیا، وہ ایک خاص گائڈ لائن کے تحت لکھا گیا اور یہ کہ اس میں ادیب کا ذاتی تجربہ یا انفرادیت کہیں نظر نہیں آتی، لیکن اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ اس "ادبی سخت گیری" نے کشمیر میں افسانوی ادب کی تحریک کو منظم کرنے کے ساتھ ہی ساتھ مضبوط بنیادوں پر بھی کھڑا کیا۔ یہ اسی تحریک کا نتیجہ تھا جس نے اختر محی الدین، امین کامل، دیپک کول، رمیش کول اور علی محمد لون ایسے بلند پایہ افسانہ نگاروں کو جنم دیا۔ آج کا ادیب بھی اگر ایمان داری سے اپنے وجود کا جائزہ لے گا۔ تو اپنی جڑیں اسی دور میں پیوست پائے گا۔ اختر محی الدین کا افسانہ "دریا یہ ہند یزارہ" امین کامل کا "کوکر جنگ" امیش کول کا "دَڈ ووَت" علی محمد لون کا "یم لوکھ" اور دیپک کول کا "راٹھی کاکنی برارے" ایسے افسانے ہیں جنہیں آج بھی سنگ میل کی

جہاں کچھ متوازی تحریکیں بھی چل رہی تھیں، وہاں ہمارے یہاں کسی اور ٹرینڈ (TREND) کو ابھرنے یا پنپنے کا موقعہ ہی نہیں دیا گیا۔ ترقی پسندی کے محدود سے دائرے کے باہر کسی بھی ادبی کوشش کا مضحکہ خیز سمجھ کر رد کیا جاتا۔ کلچرل فرنٹ وادی کی واحد ادبی تنظیم تھی (وقت وقت پر کچھ ترامیم اور تبدیلیوں کے ساتھ اس تنظیم کا نام بدلتا رہا۔ کبھی انجمن ترقی پسند مصنفین، کبھی کلچرل کانفرنس اور کبھی کلچرل کانگرس کے نام سے یہ اپنا فریضہ انجام دیتی رہی۔) اور یہ جس نام سے بھی کام کرتی رہی "ترقی پسندوں" کا غلبہ اس پر ہمیشہ رہا۔ یہی تنظیم مختلف وقتوں میں مختلف ناموں سے شاعروں، ادبی محفلوں، ہفتہ وار میٹنگوں، غرض وادی کی تمام ادبی سرگرمیوں کے لئے لائحہ عمل مرتب کرتی رہی۔ شاید یہ ایک خاص وجہ ہے کہ کشمیری افسانوی ادب کی تاریخ میں (ROMANTICISM) ایسے ایک فطری دور کا کہیں وجود نہیں اس دور میں جتنے بھی افسانے لکھے گئے۔ وہ اتنے ہی بامقصد اور حقیقت پسندانہ ہیں۔ جتنی کہ ایک سیاسی لیڈر کی تقریر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی افسانہ تخلیق کرتے وقت ادیب کے ذاتی تجربے، مشاہدے یا محسوسات کا دخل کم ہوتا تھا۔ اور اس لائحہ عمل یا "لائین" کا دخل زیادہ، جو ترقی پسند ادب تخلیق کرنے کے لئے مخصوص سیاسی نقطۂ نظر کے تحت مرتب کیا گیا تھا۔ اس بات کی وضاحت نیچے دیئے گئے ایک اقتباس سے ہوتی ہے۔

پرانی سازشیں۔ نئی سازشیں،

"اول مارچ کو کشمیری شاعروں، ادیبوں، فن کاروں اور دانشوروں کی طرف سے کلچرل کانگرس اور اس کی آئینی اکائیوں نے ــــــ ایک پریس کانفرنس میں برطانوی اور امریکی سازشوں کے متعلق ایک بیان دیا۔

کشمیر کے اردگرد پانچ بڑے ملک واقعہ ہیں۔ اور جو سامراجی نہیں)۔ اور سامراجی ممالک چین اور روس کے خلاف جنگی اڈے تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ سامراجی جنگ بازوں کی اس چال کو ناکام بنائیں اور تمام رجعت پسندوں کا مقابلہ کریں۔ انہیں ننگا کیا جانا چاہیئے اور اصلیت کو عوام تک پہنچانا چاہیئے۔"

ایڈیٹوریل "کونگہ پوش" جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

کا بیانیہ انداز موضوع کے مزاج کے عین مطابق ہے اور بالکل فطری لگتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض قلم کار حضرات کو ان میں کوئی "جدیدیت" نیا پن یا بغاوت نظر نہیں آتی۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ۱۹۶۷ء سے پہلے جو کچھ لکھا گیا۔ وہ سب فرسودہ اور بے معنی ہے۔

مختصر یہ کہ سنہ ۱۹۶۷ء ایک مریخ دوراہا ہے۔ ایک راستہ نئی حقیقتوں کی طرف بازو پھیلائے دوڑ رہا ہے اور دوسرا راستہ اس تبدیلی کا نہ روادار ہے۔ نہ مشتاق،

کشمیری افسانہ آج اور کل۔ (رتن لال شانت)

(شیرازہ، ستمبر ادسمبر ۱۹۷۴ء)

۱۹۶۷ء سے بہت پہلے مرحوم شنکر رینہ نے چند ایک افسانے ایسے لکھے ہیں جنھیں شانت کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد بھی جدید کشمیری افسانوں کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ خود شنکر رینہ کا خیال تھا کہ وہ "اسٹاین بیک" کے اسٹائل میں افسانے لکھتا ہے۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں شنکر رینہ نے "شر مشین"، سنہ ۱۹۶۱ء میں بھارتی نے "شکست" اور سنہ ۱۹۶۵ء میں فاروق مسعودی نے "نارہ ژکر" افسانے لکھ کر کشمیری افسانے کو ایک نیا موڑ ضرور دیا۔ لیکن پھر بھی اس کو "جدید" کہہ کر ماضی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ ہمارے افسانوی ادب کے ارتقاء کی ایک فطری اور لازمی کڑی ہے اور آج بھی "جدید" یا "قدیم" کے نام پر جو کچھ ایمان داری سے لکھا جا رہا ہے، وہ بھی اسی ارتقاء کی ایک منزل ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ۱۹۶۷ء تک کشمیری افسانوی ادب نے ملک کے ادبی منظر میں ایک مقام حاصل کر لیا تھا۔ اور اس سے متاثر ہو کر ہماری ریاست کے کچھ اچھے ادیب جو ہندی یا اردو میں لکھ رہے تھے۔ اپنی زبان کی طرف مائل ہوئے، ان میں ہری کرشن کول اور رتن لال شانت کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن یہ دونوں چونکہ ہندی جگت کی "سمان انتر" تحریک سے وابستہ تھے، اسلئے ان کے کشمیری افسانوں میں بھی ایک خاص طبقے کا ہی ذکر اکثر ملتا ہے اور اسلوب کے اعتبار سے بھی ان کے فن پارے سمان انتر تحریک کے تحت لکھے گئے بیشتر افسانوں جیسے ہوتے ہیں۔ اس کا احساس ان کا افسانہ "تاپھ" یا "دوناتھ داکن" پڑھنے پر خاص طور سے ہوتا ہے۔ افسانہ "ییگاہ" میں انہوں نے اس اثر سے آزاد ہونے کی کافی کوشش کی

حیثیت حاصل ہے۔ یہ افسانے موضوع کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ہیئت اور اسٹائل کے اعتبار سے بھی اعلیٰ معیار کے ہیں۔ یہ دور کشمیری افسانے کے سفر کا وہ اہم پڑاؤ ہے۔ جہاں افسانہ نگار نے بڑی جرأت مندی سے کسی تحریک یا "ازم" کے لگے بندھے میزانوں کو ٹھکرا کر اپنے ذاتی مطالعے اور مشاہدے کے بل بوتے پر فن پارے تخلیق کئے، اس دور کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کی اہمیت کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ:۔

"اختر یا اس سے پہلے کے افسانے اب تک لہروں سے ٹکرانے کی بجائے، کناروں پر ہی سمٹ گئے تھے، اور دریا کے بہاؤ کو گالیاں دے رہے تھے"

کشمیری افسانہ آج اور کل، از:۔ رتن لال شانت

شیرازہ، ستمبر، دسمبر ۱۹۷۶ء

اختر محی الدین اپنے افسانوی مجموعہ "ست سنگر" کے مختصر سے پیش لفظ میں لکھتے ہیں،

"فن کار زندگی کے بھرے جسم کا ایک انگ ہے۔ اس لئے زندگی کا پیارا اور لاڈلا بچہ زندہ رکھنے کی اپنے فن کو ہمیشہ زندگی کی چھاتیوں کے قریب رکھنا پڑتا ہے۔ عظیم فن وہی ہے۔ جس میں زندگی کے دل کی دھڑکنیں ہوں اور جس کے چہرے پر معصوم بچوں کا تبسم رقص کر رہا ہو۔"

یہ صرف اختر محی الدین کا ہی نظریہ نہیں۔ بلکہ اس پیڑھی کے تمام ہم عصر ادیبوں کا نظریہ تھا۔ اسلئے یہ کہنا درست نہیں کہ "اس دور کے ادیب کنارے پر کھڑے پانی کے بہاؤ کو بس کوستے ہی تھے اور یہ کہ تیرنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ تب ضرورت کے پیش نظر روایت سے بغاوت کی گئی تھی۔ اور آج بطور فیشن کی جاتی ہے۔ ضرورت کے تحت روایت سے بغاوت کا احساس رہبر کے افسانوی مجموعے "تو بر کھ" اور بنسی نردوش کے افسانوی مجموعے "بال مرآلو" کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ ان دونوں مجموعوں کا مطالعہ کرنے کے بعد سنجیدہ پڑھنے والا اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ بغاوت برائے بغاوت یا بطور فیشن نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ ایک ضرورت کے تحت کی گئی ہے۔ رہبر کا مقالاتی اسٹائل اور نردوش صاحب

آگے کوئی نہ پیچھے!

علی محمد لون

آج دیواریں مجھے ایک بار پھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہیں۔ یہ لپا پتا، صاف ستھرا کمرہ آج پھر اداس ہے۔ اوہ! آج سردی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ لیکن وہ کیسے؟ ابھی تو بت جھڑ کا ہی موسم ہے۔ پھر یہ سردی کیسی؟ نہیں نہیں۔ موسم ٹھنڈا نہیں ہے۔ یہ تو میرے اپنے دل کے اندر کی سردی اور زیادہ منجمد ہو رہی ہے اور میرے انگ انگ اور میری رگ رگ میں اتر کر مجھے ٹھرا رہی ہے۔ میرے دل کا یہ کہرا کہیں مجھے مار ہی نہ ڈالے! دس بج رہے ہیں۔ لیکن میں نے ابھی تک داڑھی بھی نہیں بنائی۔ میری قمیص میل میں اٹ چکی ہے لیکن میں پھر بھی اسے پہنے ہوئے ہوں۔ میرے جوتوں پر گرد کی تہہ جم چکی ہے، لیکن میں اسے صاف نہیں کر رہا ہوں۔ لگتا ہے آج دفتر جانے میں دیر ہو جائے گی اور صاحب ناراض ہوں گے۔ لیکن ان کی ناراضگی بھی میرے دل کے کہرے کو پگھلا کر اور اسے بھاپ بنا کر میرے دل سے نکال نہیں

ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کے مکان و زمان کے بارے میں پڑھنے والا قطعیت کے ساتھ کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پاتا۔ آج کا کشمیری افسانہ نگار بہت سی تحریکوں اور ازموں سے متاثر ہونے کے بعد اب کم و بیش اسی طرح ہر تحریک اور ازم سے منکر ہو گیا ہے۔ جیسے دنیا کے باقی ممالک کے فن کار، لیکن اس بات کا جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ آج کا کوئی بھی ادبی کارنامہ ماضی سے جڑا ہوا ہے اور اس دور کی "جدید" سوچیں محض فطری ارتقا کی ایک منزل ہیں۔
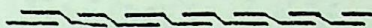
ہوئے ہوں۔ اصلی ٹیری وُول کا ہے۔ پچاس رُوپے میٹر کا۔ اب میں نے ٹیری لین کی رنگین شرٹ پہنی ہے۔ میرے جُوتے تو دیکھ۔ ان کے ہاتھوں تنگ آ گیا ہوں۔ میری اُنگلیاں ایک دوسری کے اُوپر سوار ہو گئی ہیں۔ اور میرے پاؤں دُکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ وُلی! تُو نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ میں سب سے پہلے دفتر آتا ہوں۔ رحمان شیخ بھنگی کا ناک میں دم کر کر دیتا ہوں۔ میں اپنے سامنے اُس سے ایک ایک چیز حاضر کرواتا ہوں۔ خصوصاً تیری میز کرسی اور ٹائپ رائیٹر۔ اور تیری اِن کمنگ اور آؤٹ گوئنگ ٹرے۔ تُو نے یہ بھی مارک کیا ہو گا کہ میں سب کے آخر میں دفتر سے نکلتا ہوں۔ لیکن تُو ایک بات نہیں جانتی۔ تیرے اِدھر آنے سے پہلے ہمارے دفتر کی بُری حالت تھی۔ پہلے تو ہر روز ہماری جواب طلبی نکلا کرتی تھی۔ بے عزّتی ہوا کرتی تھی۔ کوئی چیز یہاں سلیقے سے رکھی ہوئی نہ تھی۔ کوئی ریفرنس آسانی سے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ لیکن اب ہمارا دفتر ہمارے باقی دفتروں میں سب سے زیادہ ایفی شنٹ جانا جاتا ہے، کیونکہ تُو نے آنکھ جھپکنے میں ہی ہر چیز کی کایا ہی بدل ڈالی۔ اس کے لئے ہم پہلے تیرے اور پھر صاحب کے آبھاری ہیں جس نے تجھے یہاں مُلازم رکھا۔

مہاراج ایک عرض ہے:

عرض مت کر۔ حکم کر۔ آگیا دے۔ میں اپنی جان دُوں گا تجھے! اپنے دِل میں بساؤں گا تجھے! اور وہیں تجھ سے پیار کروں گا۔ دیکھ اس وقت میرے سامنے تیری پرسنل فائل ہے۔ میں نے کل ہی اس کا کور بدل دیا ہے اور خود ہی اس کے سبجکٹ کے کالم میں لکھ دیا: پرسنل فائل آف کماری دُلاری رازدان، ٹائپسٹ۔" جانے کیوں مجھے تیرا نام لال حروف میں لکھنا پسند آیا۔ دیکھ اس فائل میں ابھی کچھ ہی کاغذ جمع ہو گئے ہیں۔ تیرا اپوئنٹ منٹ آرڈر۔ تیری جوائننگ رپورٹ۔ اور ایک دو معمولی سے کاغذ۔ اور صرف ایک کیجول لیو۔ مائی گاڈ! تُو کتنی پنکچول ہے دُلی! خیر نہ بھی ہوتی، تو کیا ہوتا ہے! میں تمھاری لیو درج بھی کر دیتا کیا؟ ایک بھی درج نہیں کرتا۔ باقی رہا تیرا ٹائپ ورک۔ وہ میں خود ہی کیا کرتا۔ لیکن تُو نے اس کی حسرت ہی رکھی میرے دِل میں۔ صرف ایک لیو۔ اور وہ بھی اُس مجبُوری کی وجہ سے۔

سکتی۔ چالیس سال! دِن رات مِلا کے اَسّی سال! ٹھنڈے کھُر زدہ چالیس سال!
نہیں نہیں۔ میں شاید اِنسان نہیں ہوں، ایک فوسِل ہوں، فوسِل۔ جس کا کچھ بھی
نہیں ہو سکتا۔ جس سے کوئی زندہ نہیں کر سکتا۔ کیا کچھ بھی نہیں ہو گا اس کا؟ کوئی
زندہ نہیں کر پائے گا اِسے؟ پھر۔ پھر میں نے وہ سپنا کیوں دیکھا تھا؟ راکھ کی اس
ڈھیری میں وہ چنگاری کہاں چھُپی بیٹھی تھی جس نے مجھے اس کی اور کھینچا تھا۔

نمسکار مہاراج!

نمسکار مت کہا کر ڈولی۔ ہیلو ام کہا کر۔ اور میں تجھ پر اپنی جان نچھاور کر دوں گا۔
کہے گی تو اپنی شہ رگ کا خون تجھے پلا دوں۔ تو نہیں جانتی، تیرے آنے سے میرے جیون میں
کیسی اُتھل پتھل مچ گئی ہے! یہ گندا اور بے جان دفتر بھی تیرے آنے سے جی اُٹھا۔ میرے
ایک یُگ دھڑنے سے۔ تیری ایک سانس سے۔ تیری ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے سب کچھ سُندر
ہو گیا۔ ایک شوبھا آ گئی۔ اور اس دفتر پر ایک نامعلوم شاپ کی جو گہری چھاپ پڑی تھی،
وہ ختم ہو گئی!

دیکھ ڈولی! ان تنومند کلرکوں کو دیکھ رہی ہے؟ یہ جو دلیپ کٹ ہیر اسٹائل اور
جیول تھیف ٹوپیاں پہنے ہوئے ہیں، یہ ڈریس پائپ اور جرکن پہنے ہوئے کلارک۔ تو تو جانتی
ہی ہے کہ یہ کتنے گندے اور میلے رہا کرتے تھے۔ ٹیڑھے میڑھے بے ڈول، جیسے یہاں بیگار پر
آیا کرتے تھے۔ بد دل، بے غرض اور عیار کلارک۔ پگلی، تو تو خود بھی سمجھ گئی ہو گی کہ تیرے
یہاں آنے کے بعد یہ کیوں بدل گئے؟ اچھا اِن کی بات چھوڑ۔ تو میری ہی طرف دیکھ! میں
خود اس دفتر کی غلاظت اور گندگی کا عادی بن چکا تھا۔ میں بھی انھیں کی طرح میلا کچیلا
یہاں آیا کرتا تھا۔ سات سات دِنوں کی داڑھی کا ملبہ منہ پر چڑھائے ہوئے۔ پتاجی کے زمانے
کا ایک بند گلے کا کوٹ پہن کر۔ اور اسی کوٹ کے اندر میں مہینوں ایک ہی قمیض اور بنیان
ڈالا کرتا تھا۔ میں اپنی گرگابی کو کبھی پالش نہیں کیا کرتا تھا۔ لیکن اب میری طرف دیکھ۔ روز
شیو کرتا ہوں۔ میں نے بند گلے کا کوٹ اُتار پھینکا ہے۔ اور اس وقت میں ایک اوپن کوٹ پہنے

اور وہ مجھے اسی حالت میں لے جاتیں۔ پھر میری آتما کبھی نہ تڑپتی۔ میری پیاس بجھ جاتی اور جنم جنم کے آواگون سے مُکتی مل جاتی۔ لیکن بیڑا غرق ہو مکھن کا۔ وہ اسی سمے آیوڈین اور کاٹن لے کر آگیا۔ اور یہ انمول نرالی گھڑی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ جانتی ہے۔ اس کے بعد مکھن کے نام میں نے یکے بعد دیگرے چار جواب طلبیاں نکال دیں۔ کیونکہ اس نے میری کامنا کو ادھورا بنا کر چھوڑا۔ میری تپسیا بھنگ کر دی۔ پھر بھی میں اسے معاف کر دیتا لیکن اس کمینے نے خود ہی تیرے زخم پر آیوڈین لگا دی۔ اور جب مارے درد کے تیرے منہ سے "سی" کی آواز نکلی تو مکھن کمینے نے جانے کس تاؤ میں آکر تجھے، یہ یوں سمجھو، گلے سے لگا دیا۔ اور تو؟ اور تو بھی دم سادھے اس کی بغل میں چپکی بیٹھی رہی۔ اور یہ سب میرے سامنے ہوا۔ وہ شاید بھول گیا کہ اسے ایسا کرنے کا کوئی ادھیکار نہ تھا۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ میں تھا۔ اور اپنے ماتحت کام کرنے والوں کے سکھ دکھ کا خیال کرنا میرا فرض تھا۔ میرا دھرم تھا۔ کیا نہیں تھا ڈلی؟"

"مہاراج ایک عرض ہے:"

پھر وہی برا شبد؟ عرض۔ عرض! میں نے تجھ سے پہلے بھی کہا ہے ڈلی۔ مجھ سے عرض نہ کیا کر۔ سر اونچا کر کے میرے کمرے میں آیا کر۔ میری آگیا بنا کرسی پر بیٹھا کر۔ اور میری ٹیبل پر کہنیاں جما کر اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ لیا کر۔ اور مسکراتے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر۔ ہونٹ ذرا سے کھلے چھوڑ کر۔ تاکہ میں تمہارے دانتوں کی لڑی دیکھ سکوں! یہ پھول سا چہرہ، انار کلی جیسے ہونٹ اور سفید برف جیسے تاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے دانت! تجھے کہاں یاد ہوگا ڈلی؟ لیکن مجھے یاد ہے، جیسے کل ہی کی بات ہو۔ میں نے ایک دن تجھ سے اپنا ایک پرسنل لیٹر بند کرنے کو کہا تھا۔ میں نے گم کی بوتل ٹیبل کی دراز میں پہلے ہی چھپا رکھی تھی۔ اور تجھ سے انکار کرتے نہ بنی۔ تجھے وہ چٹھی اپنے ہونٹوں اور زبان سے گیلی کر کے بند کرنا پڑی۔ میں نے جھپٹ کر چٹھی تیرے ہاتھوں سے چھین لی اور تیرے جانے کے بعد میں نے چٹھی کا وہ حصہ اپنے ہونٹوں سے لگا دیا جس پر ابھی ابھی

مجھے اچھی طرح وہ دِن یاد ہے۔ میری آنکھ سویرے سے ہی پھڑکی تھی اُس دِن۔ دِل میں یُوں ہی کچوکے سے لگتے تھے اور میں جانتا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ خیر ہونا کیا تھا، تیرا ٹائپ رائیٹر خراب ہوگیا۔ اور اندر سے کچھ ضروری کاغذات ٹائپ کرنے کے لئے آ گئے۔ فاروق سویرے ہی صاحب کے بچّوں کو برائن ہال اسکول چھوڑنے گیا تھا۔ اور اُس نے دونوں ٹائپ رائیٹر بند رکھے تھے۔ تو پیچ کس ہاتھ میں اُٹھا کر ٹائپ رائیٹر کو ٹھیک کرنے لگ گئی۔ میں نے کہا تھا، لاؤ ڈُلی میں تیری مشین ٹھیک کر کے دوں گا۔ لیکن تو مانی ہی نہیں — جلد بازی میں یہ ہوا کہ تیرا ہاتھ پیچ کس سے زخمی ہوگیا۔ ہتھیلی کے بیچ میں چھید ہوگیا اور خون بہنے لگا۔ میں خود درد سے تڑپ اُٹھا جیسے کسی نے دِل پر گھونسہ مار دیا ہو — میں کرسی سے فوراً کھڑا ہوگیا۔ میرے سر کے اندر جیسے شہد کی مکھّیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے تیرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اور مکھن سے صمد کی انٹرنیشنل ڈسپنسری سے ڈی ٹول اور آیوڈین لانے کے لئے کہا۔ جانے مجھے کیا ہوگیا! مکھن کے جانے کے بعد میرے سارے شریر پر ایک ساتھ لاکھوں چیونٹیاں رینگنے سی لگیں۔ اور میں نے تیرا زخمی ہاتھ ہونٹوں کے ساتھ لگا دیا۔ اور تیرا گرم گرم اور نمکین خون چُوسنے لگا۔ تُو نے ہاتھ کھینچنے کی کوشش تو کی تھی۔ لیکن میں نے اسے چھوڑا نہیں۔ میرے سر کے اندر شہد کی مکھّیوں کا شور اور زیادہ بڑھ گیا۔ اور میرے شریر پر کروڑوں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ تیز تیز — اور میرے بدن سے سر سے پاؤں تک شعلے لپٹنے لگے۔ صرف میری ہی ایسی حالت نہ تھی۔ تیرے شریر میں بھی جھُرجھُری سی پیدا ہوئی جس کی وجہ سے مجھے ایسا لگا جیسے میری آنکھوں میں گاڑھا تیل جیسا کوئی مادہ اُبلنے لگا اور میری زبان گلے سے نیچے کی طرف لُڑھکنے لگی۔ اب تک میں نے تیرے یہ پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک ہاتھ دُور دُور سے دیکھا کئے تھے لیکن اس سمے تیرا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں بندھا۔ اور تیرا زخمی ہاتھ میرے ہونٹوں کے نیچے، ایسے میں، میں نے کامنا کی کہ سمے کیول اسی کھشن پر رُک جائے اور مرگھٹ جانے کی یاترا تک میں تیرا ہاتھ ایسے ہی چُوستا رہوں۔ یا یم راج کو اس کھشن میں فرصت ملے۔

دے آگیا دُلی؟ دیکھ کیا رہی ہے ہرنی کی طرح؟ بول کیا چاہتی ہے؟ دیکھ بیسؔ برس نوکری کرتے کرتے میں نے کچھ بچت کی ہے۔ اپنی جان کہاں تک خرچ کرتا؟ اصل میں یہ سب تیرے بھاگیہ میں بھی ہے۔ دیکھ، ڈاک خانے میں بھی کوئی دس بارہ ہزار روپے ہوں گے، جی، پی فنڈ میں بھی اتنی ہی رقم ہوگی۔ اور پھر دوؔ انشورنس پالیسیاں۔ ایک پانچ ہزار روپے کی سرکاری بیمے والی اور دوسری میری پرائیویٹ دس ہزار روپے کی۔ کوئی بھی پریمیم ناغہ نہیں ہوا اور پرائیویٹ والی دو سال میں میچور ہونے والی۔ مانگ کیا مانگتی ہے؟ اپنے میں جرأت پیدا کر۔ اچھا میری آنکھوں کی اور دیکھ۔ میری یہ سانڈ آنکھیں بھی تجھ سے کچھ کہہ رہی ہیں؟ اچھی طرح دیکھ! یہ لے۔ میں عینک اُٹھا لیتا ہوں۔ کچھ نظر آیا ان میں؟ ہائے جی میں آتا ہے کہ اُٹھ کر تجھے گلے لگا دوں، اور رو رو کر تجھ سے کہوں: دُلی! میری بنے گی؟

میری چالیسؔ سالہ آیو سے گھبرا مت! تُو تو خود بھی تیئسؔ سال کی ہے۔ میں نے تیری میٹرک کی سرٹیفکیٹ پر تیری عمر دیکھی ہے۔ سترہ ورش کا انتر بھی کوئی انتر ہوتا ہے؟ تُو چھوٹی ہے، کومل۔ اور میں بھی بُوڑھا نہیں ہوں۔ دیکھ، ایک بال بھی اُجلا نہیں ہوا ہے اب تک۔ بھنورے کی طرح کالے کیش ہیں میرے! کاش! میں یہ سب کچھ اپنی زبان پر لا سکتا۔ ! خود میری ہمت نہیں پڑتی اور تجھ سے جرأت پیدا کرنے کی بات کر رہا ہوں۔ تجھ سے کچھ مانگنے کی بات کر رہا ہوں۔ لیکن تو کہتی کیوں نہیں؟ میں نے تو اپنا ہردے، اپنی کامنا، اپنے بھاؤ اور آتما اپنی آنکھوں میں اُتار لی ہے؟ پوچھ لے ان سے۔ یہ میرے دل کی پیڑا تجھ پر ظاہر کریں گی اور کہیں گی: دُلی! ڈرمت! اور میں بھی یہی کہوں گا: دُلی! ڈرمت! میں ایک جوان سے بھی بڑھ کر تجھ سے پیار کروں گا اور ایسا کرنے میں کوئی کنجوسی نہیں کروں گا۔ عیش کراؤں گا تجھے! کہیں تو یہ تو نہیں سوچ رہی کہ ایک ذی عزت کو مجھ پر اس طرح باؤلا ہونا چاہیئے؟ کیوں نہیں دُلی؟ کیوں نہیں؟ اس عزت کے سینے میں بھی بھار بھرا پریم بھرا ایک دل دھک دھک کر رہا ہے۔ دُلی! میں کیوں نہ باؤلا بن جاؤں؟

تو نے اپنی زبان پھیر دی۔ جسے تیرے ہونٹوں نے چوما تھا۔ چٹھی کا یہ حصّہ ابھی تک گیلا ہی تھا اور تیرے ہونٹوں کی ہلکی ہلکی گرمی اب تک اس پر باقی تھی۔ تیری سانسوں کی سُگندھ ابھی تک اس پر لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے چٹھی کھول دی اور تو نے جس حصّے پر اپنی لال لال زبان پھیری تھی، اُس پر میں بہت دیر تک اپنی زبان پھیرتا رہا۔ میرے کان ایک بار پھر شہد کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ سے گونجنے لگے۔ میرے جسم پر پھر ایک بار چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ میری زبان ایک بار پھر سمٹنے لگی۔ آنکھوں میں ایک بار پھر وہ سیّال مادہ تیرنے لگا۔ میں بہت دیر تک چٹھی کو چاٹتا رہا۔ بہت دیر تک! اور پھر گوند کی ہلکی ہلکی مٹھاس میرے سارے مُنہ میں پھیل گئی۔ نہیں نہیں۔ یہ گوند والی مٹھاس نہیں تھی۔ یہ تیرے انار کلی جیسے ہونٹوں کی میٹھی مدیرا تھی۔ تیری لال زبان کی سُرخ شراب تھی۔ ہماری خوشبودار سانسوں کا امرت، جس نے مجھے مدہوش کیا۔ میرے ہوش چھین لئے۔ میری آتما کی پیاس ایک بار پھر بجھنے لگی۔ میں اپنی پیاسی آتما کو پُوری طرح سیراب کرتا۔ لیکن اُسی سمے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے چونکا اُٹھا لیا لیکن چٹھی میرے ہونٹوں کے ساتھ ہی چپک کر رہ گئی۔ میں ابھی تک اسے چُومے جا رہا تھا۔ اور دوسری اور سے صاحب زور زور سے بک رہا تھا:

"امرناتھ، یُو بلڈی فول! وٹ آر یُو ڈُوئینگ؟ آر یُو اِن یُور سینسز؟"

ہونہہ، سینسز کا سالا! اسے بھی ایسے ہی میں مرنا تھا۔ اصل میں میری خوشی کسی کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ نہیں تو، یہاں کون سا ایکسپورٹ امپورٹ کا دفتر تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی نہیں کہ قیامت ٹوٹ پڑی!

مہاراج! میں کچھ عرض کر رہی تھی!

عرض کرنے والے تو ہم ہیں، تیرے سیوک! ہائے یہ میں کیا کہہ رہا ہوں! عرض کرنے والے؟ ہم اور تیرے؟ نہیں نہیں۔ عرض کرنے والا، میں اور تیرا۔ میں اور تُو۔ اور کوئی نہیں۔ میں تیرا، تُو میری۔ تو میری دیوی اور میں تیرا داس! تُو میری مالکن اور میں تیرا سیوک۔ آگیا دے آگیا!

اور اُس نے سُن لیا۔ اس سے آگے اور کیا کہنا... ... کیا کہوں دُلّی؟ تو ہی بول!
نہیں بولے گی؟ میں ہی کہتا ہوں۔ لیکن کس مُنہ سے کہوں؟

"تُو کہیں ناراض تو نہیں ہوگی؟ تُو نوکری چھوڑ کر تو نہیں جائے گی، جس سے نکلنے کے لئے میں اس حد تک ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں؟ دُلّی! میری جان تجھ پر واری! ناراض نہ ہو؟ نوکری نہیں چھوڑ۔ دیکھ مجھے یوں اکیلا چھوڑ کر مت جا! نہیں، نہیں! ایسا نہیں کرنا دُلّی؟ اچھا دُلّی! میں ہمت سے کام لوں گا۔ میں تجھ سے سب کچھ کہہ دوں گا، سب کچھ دُلّی! میری سنے گی؟ بول سنے گی میری؟ دُلّی! میں نے ہمیشہ تجھ سے اپنے من کی بات چھپائے رکھی۔ کبھی تجھے اپنا دِل کھول کر نہیں دِکھایا۔ کبھی بھی اپنی زبان پر تیرا نام نہیں لیا، لیکن دُلّی! میری آنکھیں بھی تجھ سے کچھ نہیں کہہ رہی تھیں؟ میری آنکھوں کی اور میرے ہردے پر نظر ڈالتی، وہ سب کچھ بتا دیتا تجھے!

او میرے بھگوان! میرے بھگوان!! مجھے ہمت دے! مجھے شکتی دے! میرے بھگوان! میرے بھگوان مجھے اس پریکشا میں سپھل کر دے! میرے بھگوان! میرا ہاتھ تھام لے! مجھے ساہس دے بھگوان! لیکن، لیکن میں ڈرتا کس بات سے ہوں؟ بہت سے بُوڑھوں نے نوجوان لڑکیوں سے شادیاں رچائیں۔ پھر میں کیوں نہیں؟ دُلّی! میں تجھ سے کیوں نہیں کہہ پاتا۔ دُلّی تو ایسا کر!

مہاراج مجھے پرسوں سے ایک مہینے کی چھٹی چاہیئے۔ چھٹی؟ ایک مہینے کے لئے؟ اسے کیا کرنا ہے۔ دُلّی، کیا بات ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟ تیرے پتا جی، ٹھیک ہیں نا ——
ارے، تو شرمائی کیوں؟ کیا بات ہے؟ تُو تو کبھی ایک دِن بھی چھٹی پر نہیں رہتی۔ پھر یہ ایک ساتھ ایک مہینے کی چھٹی، کس لئے؟ میری شادی ہو رہی ہے مہاراج!

شادی؟ دُلّی! تیری شادی؟ یہ کیا کہا تُو نے دُلّی؟ تو بھی دھوکا دے گئی مجھے؟ لیکن نہیں۔ تُو نے دھوکا نہیں دیا۔ میں ہی تجھ سے کبھی کچھ کہہ نہ سکا!

جب کہ تو چھ گھنٹے میرے سامنے رہتی ہے۔ اور تیرا پیارا پیارا وجود چوبیس گھنٹے میرے اُجڑے ہوئے سنسار پر چنار کی چھاؤں بن کر چھایا رہتا ہے۔ میرے گھائل شباب کو ایک نیا جیون اور نئی اگن دیتا رہتا ہے؟ دیکھ دُلی! اس میں حرج ہی کیا ہے؟ میں اکیلا ہوں۔ آگے کوئی نہ پیچھے۔ تو ایک نردھن باپ کی بیٹی ہے۔ اُس باپ کی بیٹی، جس پر فالج گرا ہے۔ تیرے لیے بھی وِواہ اتنا ہی کٹھن ہوگا جتنا کہ میرے لئے ہوا ہے۔ سب یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ اس لنڈورے کو بیٹی کون دے گا؟ میرا باپ کبھی نائی کا کام کرتا تھا۔ لیکن اُس نے ایک چھوڑ، دو دو شادیاں کی تھیں۔ اور پھر ان پڑھ بھی تھا۔ میں گریجویٹ ہوں۔ سرکاری ملازم اور بہت جلد انڈر سیکرٹری بننے والا۔ لیکن اس جان کا کیا کروں؟ جس نے ہمیشہ ہی مجھے دھتکار دھتکار کر اس اوستھا تک پہنچا دیا۔ دُلی سُن! سمے گزرتا گیا اور میری عمر ڈھلتی گئی۔ تو تئیس ۲۳ سال کی ہو گی۔ تو کہاں سے اتنا داج دہیج لائے گی؟ کوئی اچھا سا لڑکا مل جائے؟ پھر یہ اچھا نہیں ہے، کیا تو میری بن جائے اور میں تیرا؟ لیکن میرے بھگوان، میں یہ صرف سوچتا ہی کیوں ہوں؟ میری ہمت کیوں نہیں پڑتی تجھ سے یہ سب کچھ کہنے کی؟ میری ہمت کیوں میرا ساتھ نہیں دیتی کہ میں تجھ سے کہوں: دُلی! میری بنے گی! دیکھ کیسی لمبی چوڑی کوٹھی انسانوں کی غیر موجودگی میں بھوتوں کا مسکن بن چکی ہے۔ دیکھ میرا پاک اور پوتر جسم تنہا ہونے کے کارن ادھ موا ہو چکا ہے۔ دیکھ کیسے ارمان، کامنائیں تیرے بنا دھول میں مل رہی ہیں! دیکھ دُلی! میری بات مان! پھر یہ دن لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ پھر بھگوان نہ کرے تیری بھی دُشا ویسی ہی ہو گی، جیسی اس سمے میری ہے۔ دیکھ میری بات مان! دُلی، سُن میری بات!"

"مہاراج! آپ اس طرح کیا... ...؟"

ارے مارے گئے! اس نے سُنا تو نہیں؟ ہاں ہاں سُن لیا ہے۔ چلو، یہ بھی اچھا ہوا۔ بونی ہو گئی۔ اب تو آگے چلا جا سکتا ہے۔ لیکن میں نے اونچی آواز میں صرف اتنا کہا... دُلی!

کی مچھلیاں۔ عمر کی تپتی، مگر پیاری دھوپ کا دن۔ جس کے آگے میرا پریم، میری کامنا اور میری جلن، سب دم توڑ کر رہ گئے اور اسی لمحے مجھے لگا جیسے میرے کیش اُجلے ہونے لگے ہیں۔ اور دن بہت ڈھل گیا۔ شام کے سایے دوڑتے بھاگتے میری اور آ گئے۔ میرا ہر دے ٹھنڈا پڑ گیا اور میری نسوں میں برف کا پانی گزرنے لگا۔ اور آج سب کچھ ویراں ویراں اور اُجڑا اُجڑا ہے۔ پھر دیر ہوتی ہے۔ تو کیا ہوتا ہے؟ صاحب ناراض ہوں گے، تو ہونے دو، دفتر اگر اُجڑ بھی جائے تو مجھے کیا؟ اب تو کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا — کوئی فرق نہیں پڑے گا اب!

——————— {کشمیری سے ترجمہ}

میری ہمت نہیں ہوئی۔ آپ مجھے یوں کیا گھور رہے ہیں۔ جیسے کوئی اپرادھ ہوا ہو مجھ سے'

نہیں، نہیں کوئی اپرادھ نہیں کیا تو نے۔ کوئی پاپ نہیں کیا۔ لیکن میری پیاری دُلی! میرا

تو ستیاناس کر دیا تو نے۔ تو نے مجھے ایک بار پھر تنہا اور اکیلا چھوڑ دیا۔ اب اس اکیلی جان

کو لے کر کیا کروں دُلی؟ نہیں، کیوں نہیں؟ بھاگنا ہی تھا تو میرے ہردے میں جگہ نہ پائی

ہوتی! میرے جذبات کو اُبھارا نہ ہوتا! دُلی! اب بھی جی چاہتا ہے کہ کہہ دوں، دُلی! آ

میرے ساتھ وِواہ کر!" آپ تو اُن کو جانتے ہیں۔ وہ بھی یہیں کام کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر تو نے

دِل پر چھُری چلائی دُلی! کون یہاں کام کرتا ہے؟ جس کی تو بننے والی ہے؟ دُلی! اس

صاحب کو شیشے میں تو نے اُتارا؟ نہیں، نہیں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ دوسرا وِواہ

کیسے کر سکتا ہے؟ پھر یہ بھاگیہ وان کون ہے؟ "ہو از ڈیٹ باسٹارڈ؟ ٹیل می؟ ہو از

ڈیٹ سواین! دیش بھر کے سالے نے شک بھی نہیں ہونے دیا۔ اور اپنا کام کر گیا۔ اور

اب اور سہنا غلط ہو گا۔ اب مجھے اس سے کہنا ہی چاہیئے۔ ہاں، کہہ دوں گا! ابھی کہہ دونگا"

یہ اپنے سٹور کیپر مہاراج!

کون وہ مکھن لنگڑا؟ وہ لنڈورا چوہا؟ تو کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی ہے، دُلی! نہیں،

نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ میں مر گیا کہ تو مکھن لنڈورے

سے وِواہ کرے گی؟ جا۔۔ تو بڑھا ہے، غریب ہے۔ جیسی بھی ہے، مجھے سویکار ہے

بول، کیا منظور ہے؟ بول، کیا کہتی ہے دُلی! رہا یہ مکھن لنگڑا۔ دیش بھر کا سالا!۔۔۔

باسٹارڈ! راسکل! میں کل ہی صاحب کے ہاتھوں اِسے ڈسچارج کروا دوں گا! ویرانے

کا اُلّو! اِدھر اُدھر کہیں بات بنی نہیں تو ہمارے پیچھے پڑ گیا! تیرے پیچھے پڑ گیا لنگڑا

سُوّر کہیں کا! میں بھی کہوں۔ اُس دِن تجھ سے گلے کیوں ملا تھا!

نہیں۔ مکھن اُس کے پیچھے نہیں پڑا تھا۔ اور نہ ہی وہ اُس کے پیچھے پڑی تھی۔ وہ تو

شباب شباب کی اور باہنیں پھیلا چکا تھا۔ ناڑیوں کا گرم خون، اُچھلتی کودتی باہنوں

اُس کے ہاتھوں میں جو چوزہ تھا۔ اُس میں کوئی ایسی خاص بات بھی تو نہیں تھی کہ اس کی موت کسی اچھے خاصے انسان کو دیوانہ بنا دیتی۔ کالا رنگ، چھوٹی چھوٹی روئیں جیسے بال، پر چھوٹے اور موٹے، لمبی ٹانگیں، کمر کی جلد کھردری اور سفید، مجھے تو گھن آ رہی تھی۔ لیکن کچھ اُس کا دل رکھنے کو اور کچھ اس چوزے کی خصوصیات جاننے کیلئے میں نے پوچھا۔ "کسی اچھی نسل کا چوزہ ہوگا۔ کیوں؟

پھٹکار ہو نسل پر، اُس نے تیز لہجے میں کہا۔ تمہیں نسل سے کیا مطلب، کچھ بھی رہا ہوگا۔ شاید یہ کسی بھی نسل سے تعلق نہیں رکھتا ہوگا۔ خیر! یہ کہہ کر اس نے ایک آہ بھری، کندھے سکوڑ لئے۔ کچھ عجیب سی بدلی نظروں سے مرے ہوئے چوزے کو دیکھا اور کہا۔" میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ــــــــ

اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ الفاظ اُس کے رندھے گلے میں اٹک کر رہ گئے۔ آنکھیں چھلک کر رہ گئیں۔ باقی تو صرف اُسی کا نام رہنے والا ہے۔ میں نے اُسے تسلی دینا چاہی۔

"کس کا؟ اُس نے کچھ ایسے لہجے میں سوال کیا۔ جیسے سوال تو وہ مجھ سے پوچھ گیا ہو لیکن جواب کا طالب مجھ سے نہیں اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے ہو۔ کیونکہ اُس کی نظریں اُسی پر ٹکی ہوئیں تھیں۔

میں بے بس سا ہو گیا اور پھر اُس چوزے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ سوچ کر کہ اس اسرار سے واقف ہو جاؤں۔ جو اُسے اس چوزے میں نظر آ رہا ہے۔ کوشش کے باوجود بھی مجھے ایسی کوئی خصوصیت اس چوزے میں نظر نہیں آئی۔ کالے رنگ اور نحیف جسم کی وجہ سے یہ چوزہ اور بھی بدصورت لگ رہا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ اس کی سفید کھردری کمر، مجھے بات آگے بڑھانے کا موقع مل گیا۔

یہ اس کی کمر کو کیا ہوا ہے؟

اُس نے کچھ اس طرح چوزے کی کمر کو دیکھا، جیسے پہلے اس کی طرف اُس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اس کے بعد بائیں ہاتھ سے اُس کے پر ایک طرف ہٹا کر اسے دیکھنے لگا۔ میری نظروں میں بھی تجسس تھا۔ چوزے کی کمر پر جیسے سفید آٹا چھڑکا ہوا تھا۔ جو خشک ہو کر سفید کھرنڈ جیسی اختیار کر گیا تھا۔

یہی ردِ گوشت اس کی جان لے بیٹھا۔ اس نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ اصل میں کوئی کبھی کا

سانحہ

اختر محی الدین / مترجم: بشارت احمد

مرگیا چوزہ! اُس نے کہا

"مرا" تو پھر؟ میں نے سوچا۔ اُس سے کچھ کہے بغیر۔

"سنا تم نے، اُس نے پھر کہا۔ "چوزہ مرگیا"

میں نے اُس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اچھا خاصا انسان تھا۔ صاف دھلے کپڑوں میں ملبوس دیوانگی کی کوئی علامت نہیں۔ ہاں البتہ بال بکھرے اور آنکھیں سرخ اور حلقوں سے باہر نکلی ہوئی دائیں ہاتھ میں کالے رنگ کا ایک مرا ہوا چوزہ لیکر، ایک نظر مجھ پر اور ایک نظر اس چوزے پر ڈالتا ہوا ـــــ مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ چوزے تو مرتے ہی رہتے ہیں کسی کو چیل اٹھا کر لے جاتی ہے۔ کوئی کتے کا شکار ہو جاتا ہے۔ کوئی اچانک مرجاتا ہے اور کوئی اچانک مرجاتا ہے۔ اور کوئی کسی بھرے پرے گھر کی گھر والی کے پیروں تلے آکر مرجاتا ہے۔ بس ایسے ہی مرتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ایسے ہی مرگیا ہوگا تو پھر؟

اِن میں ساری کائنات کو وہ اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ جیسے انہی کے پھلنے پھولنے اور پلنے کے لئے قدرت نے یہ کائنات وجود میں لائی ہو۔

میں سن رہا تھا۔ وہ شاید اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہتا تھا۔

"اپنی مثال لو۔ اگر اچانک تمہارے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرا دوں۔ تو بدک کر پیچھے ہٹ جاؤ گے۔ اسلئے کہ خوف کا جذبہ تم میں پروان چڑھ چکا ہے۔ اور اب تم اِس جذبے کو مار نہیں سکتے، اِس کے برعکس اگر دودھ پیتے بچّے کے حلق پر چھری رکھ دو گے، اُسے اِس بات کی پروا بھی نہ ہوگی، وہ اِسے کھلواڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیگا۔ شاید مسکرا بھی دے، کچھ سمجھے، ہا، ہا، ہا، ہا وہ ہنسنے لگا۔

پھول کو اگر اپنے انجام کی خبر ہو تو وہ وقت سے پہلے مرجھا جائے گا۔ میں ہنس نہیں رہا تھا سوچ رہا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے سے ایک کارواں سا گذرنے لگا۔ ہنستے کھلتے پھولوں کا۔ کسی فلسفی کی طرح سوچ میں ڈوبی ہوئی پنسزی کا۔ شوخ شہابی رنگ کے رخساروں کی طرح کھلتے گلاب کا، سدابہار اور بنفشی پھولوں کا، سب مست اٹھکیلیاں کرتے ہوئے سارا عالم مسکراتا ہوا اور چرند و پرند اپنی میٹھی اور مدھر آواز میں گاتے ہوئے،

"سب اُسی کی قدرت ہے۔" میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

"کس کی"؟ اس نے جیسے الفاظ کا طمانچہ میرے منہ پر جڑ دیا۔ اور میں چونک گیا۔

"ڈر گئے"۔ وہ ہنسا۔ "تم بھی بس ایسے ہی نکلے، کورے اور اتھلے۔

تم تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ خدا جانے کہاں سے چیل جھپٹا مار کر یہ چوزہ اٹھا لائی۔ اِس کے نرم گرم ہنسنے میں اپنے بے رحم پنجے گاڑ کر، شاید کہیں اطمینان سے بیٹھ کر اسے مار ڈالنے کا ارادہ رکھتی تھی ضرور مار ڈالتی لیکن پھسل گیا اس کے پنجوں سے اور سیدھے ہمارے صحن میں آگرا،

"اچھا"۔ میں غور سے سننے لگا۔

"صحن میں گرتے ہی میں نے اسے دیکھا۔ اور کتے نے بھی، دونوں لپک پڑے، میں تو نہیں

نہیں، ماں باپ بھائی بہن، سب جھوٹ ہیں یہ رشتے۔

"خدا جانے یہ فلسفیانہ انداز کیوں؟

"یہ پوڈر ہے" ویٹرنری والوں نے جھڑکا، اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

اب اسے پھینک کیوں نہیں دیتے؟ میں نے اس سے کہا۔ ایسے ساتھ ساتھ لیے پھرنے سے کیا ہوگا۔" ___ اب تو وہی کروں گا۔ اس کے لہجے میں ایسی لاچارگی تھی، جیسے کسی عزیز کو دفن کرنے جا رہا ہو۔ یہاں اس نالی میں پھینک دو، کوئی کتا کوا آ کر لے جائے گا۔" میں نے کہا۔

کیا کہہ رہے ہو تم۔ اس نے ناراض ہو کر کہا۔ میری بات سے یقیناً اسے دکھ پہنچا تھا۔

"ہونا آخر آپ بھی دنیا کے رہنے والے۔"

"نہ جانے اس کا ارادہ کیا ہے۔"

"میرا خیال تھا۔ عقلمند آدمی ہو۔ بات سمجھ جاؤ گے۔ خیر! اس نے مایوس ہو کر کہا۔

میں خاموش ہو گیا۔ جیسے کوئی غلط بات کہہ کر اب احساس شرمندگی ہو۔

سب اس کے پیچھے پڑ گئے۔ کسی کو ترس بھی نہ آیا۔ اس نے کہا اور یہ کہتے کہتے دایاں ہاتھ آگے بڑھا کر سینے سے لگا لیا۔ اور ایسے انداز سے اس چوزے کو دیکھنے لگا۔ جیسے اپنی آنکھوں کی نمی سے چوزے کے مردہ جسم میں جان ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

"یہ بھی تو پورے اکیس دن گھاس کے ڈھیر میں دبکا گرمی کرتا رہا ہوگا۔ خدا جانے کیسے کیسے ارمان لے کر اس دنیا میں آیا ہوگا۔" وہ شاید چوزے سے مخاطب تھا یا پھر اپنے آپ سے۔

"تم نے کبھی گھاس کے ڈھیر پر مشک کے پھولوں جیسا چوزہ دیکھا ہے؟ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "ہاں دیکھا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کتنا معصوم ہوتا ہے۔ اس نے کہا۔ نوزائیدہ بچہ، گائے کا بچھڑا، چوزہ اور پھول یہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بالکل ایک سا مزاج رکھتے ہیں۔ خوف کے جذبے کا نشان تک نہیں ہوتا۔

کوئی گنہگار بندہ۔ لمحے بھر کے لئے مجھے ایسے ہی تکتا رہا۔ اور پھر کہا۔ "مرغوں نے چونچیں مار مار کر چوزے کی کمر کی کھال اس طرح اُدھیڑ رکھی تھی کہ اس کی کمر کی ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں اور خون اِن پر جم کر رہ گیا تھا اور یہ ایک کونے میں دُبکا بیٹھا تھا۔

"میں نے اِسے پکڑا، اب کی بھاگا نہیں۔ ہاتھ میں اُٹھایا۔ میری گرفت سے نکلنے کے لئے مچلا نہیں۔ دھیمی دھیمی آوازیں نکال رہا تھا۔ ایسے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

اب تو خوش ہو، اب میں مرنے جا رہا ہوں۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں تم سے جو انسان ہے۔ کُتا ہے، چیل ہے، مُرغا ہے۔ خوش ہو گئے۔ اب میں مرنے جا رہا ہوں۔ اذان نہیں دوں گا۔ انڈے نہیں دوں گا۔ اب میں کسی کام کا نہیں، اب میں سب کو خوش کر دوں گا۔ وہی کروں گا جس سے سب خوش ہو جائیں گے۔ میں مر جاؤں گا۔ چیچ، چیچ، چیچ، ہاتھ میں پکڑتے ہی میں نے چاول کے دانے اس کے آگے بڑھا دیئے۔ دو ایک بار چونچیں ماریں۔ شاید بھوکا تھا۔ یا شاید میرا دل رکھنے کو ایسا کر رہا تھا'

"کہتے ہیں خدا بڑا بے نیاز ہے۔ ویٹرنری والوں نے پاوڈر چھڑکا اس کے زخموں پر میں نے اِسے گرم رکھنے کی کوشش کی۔ اب اِسے میرا خوف نہیں تھا۔ کسی کا خوف نہیں تھا۔ صرف دھیمی دھیمی آوازیں نکال رہا تھا۔ چیچ چیچ چیچ۔ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا تھا۔ میری رُوح سے باتیں کر رہا تھا۔ دھیمے دھیمے کہہ رہا تھا۔ اب تو تم خوش ہو گئے نا، تم جو انسان ہو۔ تم" جو کُتے ہو۔ اب تو ٹھنڈک پڑ گئی۔ اب میں مر جاؤں گا۔

"کوئی ایک گھنٹے کے بعد دم توڑ دیا۔ وہ رو رہا تھا۔ وہ اس مرے چوزے کو دیکھ رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ "سنا تم نے، آخر مر گیا،
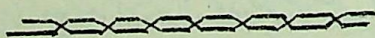
پڑسکا۔ کتا پکڑ گیا اور اسے اُدھیڑنے لگا۔ میں نے پتھر اُٹھا لیا۔ اور کتا میرے ہاتھ میں پتھر دیکھ کر ڈر گیا۔ چوزے کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اب میں اکیلے اس کے پیچھے دوڑ پڑا، اور یہ اپنی پتلی پتلی، لمبی لمبی ٹانگوں پر آوازیں نکالتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ کسی کو بُلا رہا تھا۔ شاید اُسے جس نے گھاس کے ڈھیر میں اپنی آغوش کی گرمی سے اُسے زندگی دی تھی، لیکن کون آتا وہاں بھاگ کر کہاں جاتا۔ میں نے پکڑ لیا۔ ہاں میں نے۔

یہ کہہ کر وہ لمحے بھر کے لئے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گلا صاف کرتے ہوئے کھنکارا اور بولا۔ "مان لو اچانک تمہارے سامنے پچاسوں، شیر، سانپ، ریچھ یا پاگل کتے نمودار ہو جائیں اور تمہارے پیچھے دوڑنے لگیں تمہیں مارنے کے لئے۔ کیا حالت ہوگی تمہاری؟ تم کیا جانو، کوئی بھی نہیں جانتا، وہ بھی نہیں جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر ٹانگوں کے ساتھ ساتھ حواس بھی جواب دے جاتے ہیں۔ انسان بھاگتا ہے۔ لیکن کدھر؟ یہ نہیں جانتا۔ دیکھتا ہے لیکن کیا، یہ نہیں جانتا گیا ہے۔ لیکن کیا؟ یہ نہیں جانتا۔ میں نے یہ چوزہ پکڑ لیا۔ خوف سے اس کے جسم میں تھرتھری پڑ گئی، کانپ رہا تھا۔ آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ عجیب و غریب آوازیں نکال رہا تھا۔ شاید رو رہا تھا۔ یا شاید رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ میں تو بس ایک چوزہ ہوں ایک چوزہ، مرغا ہوتا تو اذان دیتا نہیں تو پھر انڈے دیتا۔ لیکن میں تو ایک چوزہ ہوں۔ میں نے کیا بگاڑا ہے۔ تمہارا، ہمارے گھر میں مرغے ہیں۔ اُن میں سے ایک صبح و شام اذان دیتا رہتا ہے مرغیاں کبھی انڈے دیتی ہیں کبھی انڈوں پر بیٹھتی ہیں اور کبھی ایسے ہی چہلیں کرتی رہتی ہیں، اچھا بھرا پُرا گھر ہے۔ میں نے سوچا یہ چوزہ پل بڑھ سکتا ہے۔ بڑا ہوگا تو ذبح کر کے کھا جائیں گے میں نے اُٹھا کر اسے انہی کے ڈربے میں ڈال دیا۔ سوچا اپنی برادری میں اس کا خوف بھی دور ہوگا اور بہل بھی جائے گا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد جب ڈربے کی اور گیا تو جانتے ہو کیا دیکھا؟ اس نے آنکھیں گھما کر میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر زیرِ خندہ لئے ہوئے ایسے دیکھ رہا تھا، جیسے وہ خدا تھا اور میں

صفائی اور گندگی، نصیحت اور فضیحت اور تمیز و بدتمیزی میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ اس نے ڈاکٹر اشرف کو بھی اُن ہی کمزوریوں کا شکار سمجھا تھا۔ جو ایک عام نوجوان میں ہوتی ہیں۔ کیونکہ اُس نے زندگی بھر دو ہی تجربے کئے تھے۔ ایک وہ جو اس کی طرف آنکھ اٹھائے بغیر اُسے کچھ بھیک دے دیتا۔ وہ اس کی نظر میں بھولا بھالا اور شریف تھا۔ دوسرا وہ جو اس کی طرف بغور دیکھ کر کچھ پوچھے کہے بغیر ہی بھیک دے دیتا۔ ایسی آدمی کے دل میں اُسے ایک سویا ہوا شیطان جمائیاں لیتا محسوس ہوتا تھا۔

جب کسی آدمی کو کوئی دوا بار بار دی جائے تو بعد میں وہ دوا اُسے کوئی فایدہ نہیں دیتی، وہ اس دوا کا اتنا عادی ہو جاتا ہے۔ کہ اُس کے بغیر نہ تو اس کا کھانا ہضم ہوتا ہے اور نہ ہی اُس کا قبض کھلتا ہے۔ مغلی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ ڈاکٹر اشرف نے اُسے یہ بات اتنی بار کہی تھی کہ اب اُسے اس میں کوئی نیا پن دکھائی نہ دیتا۔ بلکہ اگر ڈاکٹر اشرف یہ بات کہے بغیر ہی اُسے بھیک دے دیتا۔ تو شاید اُسے تشفی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے تمام گاہکوں کو جانتی پہچانتی تھی۔ ناک بھوں چڑھا کر ایک پیسہ پھینکنے والے مہتاب سنگھ سے لیکر جو اُسے کہتا۔

"کہو کیا کہتی ہو، کروگی میرے ساتھ شادی۔"

ہاتھ میں پیسہ زور سے تھما دینے والے عزیز تانگے والے تک ڈاکٹر اشرف کو بھی اس نے ہی لوگوں میں شمار کیا تھا۔

مغلی ایک دکان سے دوسری دکان اور ایک دفتر سے دوسرے دفتر پھرتی رہتی۔ ہسپتال میں بھی یہ ہر جمعہ کے دن پہنچتی، وہاں وہ بیماروں کے علاوہ ڈاکٹر اشرف کو بھی سلام کر کے دو چار پیسے بھیک مانگے کر لے ہی جاتی۔ اُسے جمعہ کے دن وہاں آنے میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا۔ بلکہ جوں ہی جمعہ کا دن آتا۔ مریض ایک دوسرے سے پوچھنے لگتے کہ آج مغلی کہیں نظر نہیں آتی۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ مگر مغلی ہر جمعہ کو دیر سویر ضرور پہنچتی تھی۔ ایک دن وہ سچ مچ غائب ہو گئی۔ ... ایسی

بھک منگے

ایین کابل / ترجمہ: مُنیب الرحمان

یہ زمانہ اصل میں بالکل ویسا ہی بھکاری اور گندہ ہے۔ جیسی کہ مُغلی ڈاکٹر اشرف کو لگ رہی تھی، مُغلی ایک نوجوان بھکارن تھی۔ وہ خوبصورت تو نہ تھی۔ لیکن دلکش ضرور تھی۔ اس کے بدن پر پیاز کے چھلکوں کی طرح میل کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ باقاعدہ تین دن صابن سے نہا کر بھی وہ کسی مہذب آدمی کے نزدیک بیٹھنے کے قابل نہ تھی۔ اسی لئے ڈاکٹر اشرف بھی اس کو ٹکا دو ٹکے دیتے ہوئے کہتا ——

"کیوں، کیا تمہیں کسی نل سے پانی کے دو چلّو بھی نہیں ملتے۔ کتنی گندی ہو تم۔"

مُغلی اس نصیحت کو بھی اُسی طرح کی پھبتی سمجھتی، جو تانگے والے اور دُوسرے اوباش لوگ ہر روز اُس پر کسا کرتے تھے، شاید اس لئے کہ ایک بھکاری کی سوچ میں بھی بھک منگا پن ہوتا ہے۔ اُسے

کو پکارا ـــــ ٹھہریے ڈاکٹر صاحب، ساتھ ہی نکلتے ہیں۔

"مُغلی ہسپتال کی طرف مریضوں سے بھیک مانگنے چل دی۔

اور نرس موہنی ڈاکٹر اشرف سے پُوچھنے لگی۔

"آج یہ کس کا بچہ لے کر آگئی ہے۔"

"اُس کا اپنا ہے۔" ڈاکٹر اشرف نے سائیکل پر چڑھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا ہے۔" موہنی نے مذاقاً کہا ـــــ

"بڑی بدذات ہو تم ـــــ"

"آپ تو کچھ ایسے اس بچہ سے پیار کر رہے تھے کہ میں سمجھ گئی کہیں ... ..."

"تم بے فکر رہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔" ڈاکٹر اشرف نے مذاق کا جواب مذاق سے ہی دیا۔

"اس نے یہ شادی کب کی ہے۔" موہنی نے پہلو میں سائیکل چلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں" ڈاکٹر اشرف کو خیال آیا۔ "تم نے مجھے یاد دلایا۔ میں نے اس سے پُوچھا لیکن اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شادی تھوڑے ہی کی ہوگی۔ کسی تانگے والے نے خیرات میں بچہ دیا ہوگا۔

"ایسا نہ کہیئے ممکن ہے کہ شادی ہی کی ہو۔ ویسے یہ بری نہیں لگتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ایک بھک منگے کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے۔ پانچ رُوپے کے نوٹ سے اس کا منہ ایسے بند کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کھڑکی پر کاغذ چسپاں ہو جائے۔

موہنی کو اس تشبیہہ پر زور کی ہنسی آئی۔

" WELL SAID " موہنی نے کہا۔

ڈاکٹر اشرف نوجوان تھا۔ چار پانچ سال سے سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹر ہوا تھا۔ دولت جمع کرنے کا شوق اس کو خبط کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ گھر کی طرف سے یہ خالی ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس کے ماں باپ کے پاس جو بچا کھچا رُوپیہ تھا۔ وہ انہوں نے اس کی تعلیم پر خرچ کیا تھا۔ اس کے کانوں میں ہر

غائب کہ کسی مریض یا ہسپتال کے کسی مُلازم کو وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔

بہت مدّت کے بعد، ایک دن جب چار بجے ہسپتال بند ہو گیا۔ اور ڈاکٹر اشرف سائیکل پر گھر کی طرف جانے کو تھا کہ مُغلی اچانک اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ حسبِ معمول سلام کر کے ڈاکٹر کی طرف ہاتھ پھیلایا اور ڈاکٹر کے اُن الفاظ کا انتظار کرنے لگی جو کہ وہ اُسے اکثر کہا کرتا۔

"کیوں، کیا تمہیں کسی نل نے پانی نہیں دیا۔" مگر ڈاکٹر اشرف اس کو دیکھ کر حیران ہوا اور مُسکراتے ہوئے پُوچھا۔

"بہت دیر بعد نظر آئی ہو۔ کہاں تھی اتنی دیر ــــ یہ کس کا بچّہ گود میں ہے۔"

"یہ میرا اپنا بچّہ ہے۔" مُغلی کی آنکھیں جھک گئیں۔

"اچھا! اِسی لیے اتنی دیر غائب رہی۔"

"ہوں۔" مُغلی نے ناک ہی سے اقرار کیا۔

"مگر تم یہ شادی کہاں سے کر بیٹھی، وہ تمہارا شوہر کیا کرتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر اشرف نے اپنے کوٹ کی اندر والی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

مُغلی نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ اُس کی اندر والی جیب کی طرف کچھ ایسے دیکھنے لگی جیسے ایک کُتا قصائی کی دکان کے سامنے ٹکٹکی باندھے بیٹھا ہو ــــ ڈاکٹر اشرف نے جُوں توں کر کے ایک چوّنی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی۔

"یہ لے آج چوّنی، تمہارے اس بچّے کی دِکھائی کے لیے۔" اُس کو اپنی اس بات پر خود ہی ہنسی آ گئی پھر پُوچھا ــــ "اس کا کیا نام رکھا ہے؟"

"مجید" مُغلی نے چوّنی لیتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر اشرف نے پیار سے مجید کی ناک کو کھینچا۔ مُغلی لال ہو کر اپنے آپ سے سوچنے لگی۔ کہ کتنا محبت بھرا ہے یہ، اتنے میں نرس موہنی نے سائیکل سٹینڈ سے اپنی سائیکل نکالتے ہوئے ڈاکٹر اشرف

"یہ چھ خوراک دوا اس کو دے دو اور پرسوں پھر مجھے دکھاؤ۔"

مغلی نسخہ لے کر چلنے لگی کہ ڈاکٹر اشرف نے پھر کہا:

"تمھیں اگر کسی نلکے نے پانی نہیں دیا۔ اس بے چارے کو تو دے گا۔ اس کو تھوڑی کسی صابن لگا کر نہلا دو۔"

مغلی کو ڈاکٹر اشرف سے اب بہت دیر کی جان پہچان تھی۔ اس پر جب ڈاکٹر اشرف بھی ایک ایک بات مزید اس سے کرنے لگا تو وہ بھی اس کے ساتھ اپنائیت محسوس کرنے لگی۔ اُسے ڈاکٹر اشرف میں ایک ایسی کشش محسوس ہونے لگی جو کہ اُسے کسی دوسرے آدمی میں نظر نہیں آئی تھی۔ شاید اسی لئے اس نے تھوڑی سی جرأت کر کے اُس سے کہا:

"صابن کہاں سے لاؤں، اگر آپ دیں تو میں اس کو نہاؤں۔"

"بالکل ٹھیک کہا۔" موہنی نے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "صابن ان ہی سے لینی چاہیئے!"

"اس حد تک تو سچ ہی ہے۔" دوسرے ڈاکٹر نے بھی زہر خند کیا۔

"دیجیے، دیتے کیوں نہیں؟" موہنی نے ڈاکٹر اشرف سے کہا۔

ڈاکٹر اشرف اٹھا اور اپنے ہاتھ دھونے کی جو صابن وہاں پر تھی، مغلی کو دے دی۔ اور ساتھ ہی ایک پرانی تولیہ بھی پکڑوا دی۔

"اس سے نہا دھو کر پونچھنا چاہیئے۔"

مغلی یہ دونوں چیزیں لے کر چلی گئی۔ موہنی اور دوسرے ڈاکٹر نے زور کا قہقہہ مارا، اور ڈاکٹر اشرف بھی ان کے قہقہے میں شامل ہو گیا۔

"دیکھیے بچہ کتنا صحت مند ہے!" ڈاکٹر اشرف نے کہا۔

"ہمارے بچے کتنے کمزور ہوتے ہیں۔ میں کیا کہوں، میرا پہلا بچہ اسی کی عمر کا ہے۔ اس کے مقابلے میں گاجر سا پتلا نظر آتا ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ ان لوگوں کو یہ حسن اور یہ صحت کہاں سے آتی ہے۔" دوسرے ڈاکٹر نے اس کی تائید کی۔

وقت، موٹر کار کے ہارن بجتے تھے اور آنکھوں میں ایک شان دار بنگلے کی پرچھائیاں گھومتی رہتی تھیں۔ وہ اُن تمام لوگوں کو جانتا تھا جو دیکھتے دیکھتے شہر کے اُونچے طبقے میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ بھی اس طبقے میں جوں توں شامل ہونا چاہتا تھا۔ اسی لئے یہ جائز اور ناجائز، ہر طریقہ سے دولت بٹورنے کی طرف لگ گیا تھا۔

ایک دن صبح کے وقت ڈاکٹر اشرف دوسرے ایک ڈاکٹر کے ساتھ مریضوں کا ملاحظہ کرتا اور نسخے لکھتا تھا کہ مغلی بھی اپنا بچہ، مجید لے کر اس کے سامنے آئی۔

"السّلام علیکم!"

"تم اس وقت کیسے آئی ہو؟" ڈاکٹر اشرف نے پوچھا۔

"ذرا اس کو بھی دیکھیے۔" اس نے ڈوپٹہ کے آنچل کے نیچے اپنے بچّے کو چھپا رکھا تھا۔

"کیا ہُوا ہے اسے؟"

"دو تین دن سے اکثر روتا رہتا ہے۔"

"روئے گا نہیں تو کیا گائے گا تمھارے لئے؟" ڈاکٹر اشرف اور دوسرے ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"کبھی کبھار اسے دُودھ بھی واپس آتا ہے۔"

"بیٹھو اس سٹول پر، ہاں دکھاؤ اس کو۔"

مغلی نے مجید کو آنچل سے باہر نکالا۔ ڈاکٹر اشرف اس کی جسمانی بناوٹ دیکھ کر دوسرے ڈاکٹر سے کہنے لگا ——

"Doctor see this child — what a fine body he has got."

دوسرے ڈاکٹر نے عینک میں سے ہی بچہ پر بغور نظر ڈالی اور حیران ہو کر کہا:

"Of course he is well built."

ڈاکٹر اشرف نے مجید کے پیٹ کے مطالعہ کے بعد نسخہ لکھا اور مغلی سے کہنے لگا:

تھا کہ بھکارنیں میلی رہنے کے لئے مجبور ہیں۔ یہ جان بُوجھ کر اپنی صورتیں خراب کر دیتی ہیں تاکہ بہت سی بلاؤں سے محفوظ رہ سکیں!

مغلی کے سارے بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی۔ وہ ڈاکٹر اشرف کے یہ الفاظ سُن کر تمتما اُٹھی۔ نہ جانے وہ کچھ بول بھی دیتی کہ نہیں، اتنے میں اُدھر سے ایک دوسرا ڈاکٹر آ گیا۔ وہ سیدھی ڈسپنسری پر دوا لینے چلی گئی۔

"ہیلو ڈاکٹر، آج آپ کو دیر کیوں ہوئی؟" ڈاکٹر اشرف نے پوچھا۔

"دیر نہیں ہوئی، بلکہ میں اندر صاحب کے پاس چلا گیا تھا۔"

دوسرا ڈاکٹر اپنے ہی آپ سے ہنسنے لگا۔

"آپ ہنستے کیوں ہیں؟" ڈاکٹر اشرف اُس کو گھورنے لگا۔

"یوں ہی ...... بلا آئی تھی میرے سر تھوپ دی تمھارے سر۔"

"کون سی بلا؟" ڈاکٹر اشرف نے پوچھا

"بچوں کے مقابلہ میں، جمعہ کے روز قومی پارک میں آپ کی ڈیوٹی لگ گئی ہے۔"

"بھئی یہ کیا کیا آپ نے۔ میں خدا سے مانگتا تھا کہ اب کے میری ڈیوٹی نہ لگے۔" ڈاکٹر اشرف نے کہا۔ لیکن اچانک وہ کسی گہرے سوچ میں کھو گیا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی پھیل گئی۔

"اس میں کیا بُرائی ہے!" دوسرے ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بچوں کا یہ دن ہر سال قومی پارک میں منایا جاتا ہے۔ اس دن صحت مند بچوں کا ملاحظہ کیا جاتا ہے اور ان میں انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ پہلا انعام تین ہزار، دوسرا دو ہزار اور تیسرا ایک ہزار۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے انعامات دیئے جاتے ہیں، یہ دن ایک ڈاکٹر کے لئے سچ مچ بہت کٹھن دن ہوتا ہے!

اگرچہ ڈاکٹر اشرف کا چہرہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کٹھن ڈیوٹی کو اپنے سر لینے پر رضامند ہے۔

"سب خدا کے رنگ ہیں۔" مومنی نے جیسے فیصلہ دے کر کہا۔

"ان کے گندہ ماحول کو دیکھتے ہوئے ان کا کوئی نام و نشان بھی نہیں رہنا چاہیے تھا۔

لیکن اس کے برعکس یہ بچہ کسی بھی مقابلے میں اوّل نمبر پہ آسکتا ہے۔" دوسرے

ڈاکٹر نے کرسی سے اُٹھ کر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر اشرف لمحہ بھر کے لئے اس بات سے کسی خیال میں کھو گیا۔ اس کے بعد اس کی بھویں

پھیل گئیں جیسے کسی اُلجھے ہوئے مسئلے کا حل پا یا، یا جیسے موٹر کار کے چار پہیوں میں سے

ایک پہیہ حاصل کرلیا۔

"دراصل یہ لوگ مختلف جراثیم میں اتنا رہتے بستے ہیں کہ یہ بیماری پروف بن جاتے ہیں،

اُس نے یُوں ہی اپنے آپ سے کہا۔

یہ سوموار کا دِن تھا۔ دو دِن چھ خوراک دوا دینے کے بعد بدھ وار کی صبح کو منگلی پھر

مجید کو لے کر ہسپتال پہنچی۔ اس نے اپنے بچے کو صابن مل مل کر روئی کا گالا بنا دیا تھا۔

اس کا گول گول چہرہ پورے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے تن کا کپڑا بھی دُھلا ہوا تھا

اسے دیکھ کر ڈاکٹر اشرف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی اور منگلی سے کہنے لگا:

"کہو، کچھ فرق ہوا ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ اب تو بہت کم موقعوں پر دُودھ واپس آتا ہے۔"

"ایک دو دِن یہی دوا دینی چاہیے۔" ڈاکٹر اشرف نے نُسخہ پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔ "جس

نلکے نے اس کے لئے پانی دیا، اُسی سے اپنے لئے بھی مانگ لینا تھا۔ یا پھر اپنے لئے صابن

نہ رہا؟"

"کیوں نہیں رہتی؟" منگلی نے شرما کر اور مُسکرا کر کہا۔ "مگر میں نے سوچا کہ آپ نے یہ

صرف مجید ہی کے لئے دی ہے۔"

"مجید کے بہانے تمھیں دے دی تھی۔ اور تم ویسی کی ویسی ہی ہو۔" ڈاکٹر اشرف نہیں جانتا

"آپ کو بھی پیارا ہے یہ؟" مغلی کی آنکھوں میں خمار سا چھا گیا۔

"مجھے یہ بہت پیارا لگتا ہے۔" ڈاکٹر اشرف نے اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر کر کہا۔ "اتنا پیارا کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ اچھا تم ایک کام کرو۔"

"کیا؟" مغلی نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"آج دن کو اسے میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم رات کے نو بجے یہاں میرے کمرے میں آؤ اور اسے لے جاؤ۔"

"رات کے نو بجے؟" مغلی کا گلا خشک ہو گیا اور وہ اپنی انگلی دانتوں میں دبانے لگی۔

"ہاں! آج مجھے رات کی ڈیوٹی ہے، اسی لئے نو بجے کہا۔"

"مگر آپ اسے دن بھر کیسے اپنے پاس رکھیں گے؟" مغلی کی آنکھیں نیچے جھک گئیں۔

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ لاؤ پھر اسے۔" ڈاکٹر اشرف نے اپنی باہیں پھیلائیں اور مغلی نے شرما کر اُسکی باہوں میں تھما دیا۔ "کیا کہا میں نے۔ نو بجے پہنچنا۔ اُس سے پہلے میں یہاں نہیں ہوں گا۔" ڈاکٹر اشرف نے اُسے تاکید کی۔

"ٹھیک ہے۔" مغلی نے کہا اور سر جھکائے چلی گئی۔

وہ اپنے بائیں ہاتھ کی اُنگلیاں ایک ایک کر کے دانتوں میں دبا رہی تھی۔ وہ کبھی شرماتی اور کبھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ اُسے لگ رہا تھا کہ جیسے اُس نے ایک بڑی خیرات کو پا لیا۔ ایک محبت بھرا دل، ایک مہذب انسان —— وہ کبھی دوڑنا کبھی ناچنا اور کبھی گانا اور کبھی کھُلے دل قہقہے مارنا چاہتی تھی۔

موہنی ہسپتال سے واپس نکلی اور ڈاکٹر اشرف کے نزدیک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر اشرف کی باہوں میں جب مغلی کا بچہ دیکھا تو اُسے ہنسی آئی۔ مگر جلد ہی منہ پر ہاتھ رکھا۔ اُس کے کندھے شدید ہنسی سے ہل رہے تھے۔

ڈاکٹر اشرف سنجیدہ ہوا۔ اور مجید کو تھماتے ہوئے موہنی سے کہنے لگا:

پھر بھی اُس نے دوسرے ڈاکٹر سے کہا:

"بھئی یہ کوئی بلا نہیں ہے لیکن لوگ اسے ہمارے لئے مصیبت بنا لیتے ہیں۔ خواہ مخواہ انعام حاصل کرنے کی لالچ میں اپنے گاجر جیسے پتلے بچوں کو لے آتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ آیا یہ بچہ مقابلے میں چل سکتا ہے کہ نہیں۔ ہمارا وقت اور ہماری انرجی ضائع کرتے ہیں۔"

"وہ تو ہماری عادت ہی ہے۔" دوسرے ڈاکٹر نے اس کی تصدیق کی۔

یہ بُدھ کا دِن تھا۔ تیسرے دِن جُمعہ کو مُغلی حسبِ معمول ہسپتال کے بیماروں سے اپنا باج وصول کرنے آئی۔ جُوں ہی وہ ہسپتال کے اندر والے دروازے کے قریب پہنچی، وہاں ڈاکٹر اشرف اور نرس موہنی باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اشرف نے جُوں ہی مغلی کو دیکھا تو نرس موہنی کو اس کی طرف ہنستے ہنستے کچھ اِشارہ کیا۔ مغلی جب اُن کے نزدیک آ گئی۔ ڈاکٹر اشرف کہنے لگا:

"کیوں، آج بھی نہیں نہا آئی ہو؟"

"جی، کل دِن بھر اپنے کپڑے دھو لئے۔ سوچا کہ نہا دھو کر میلے کپڑے پہننا اچھا نہیں۔"

"وہ تو بھلی بات ہے۔ مجید کا کیا حال ہے۔ اب کوئی شکایت تو نہیں ہے؟"

"نہیں! اب دُودھ بھی واپس نہیں آتا۔"

"تم وارڈ نرس سے کہہ کے رکھو کہ آج میرے ساتھ زنانہ پارک میں اُس کی ڈیوٹی ہے۔" ڈاکٹر اشرف نے موہنی سے کہا۔ وہ واپس ہسپتال میں چلی گئی۔ اُس کے بعد ڈاکٹر اشرف مغلی سے کہنے لگا:

"تم کو اپنے بیٹے سے کتنی محبت ہے؟"

مغلی یہ سوال سُن کر حیران ہوئی۔ "جتنا ایک ماں کو اپنے بیٹے سے ہونی چاہیئے۔" اُس نے وہی جواب دیا جو کوئی بھی ماں اُس وقت دے دیتی۔

"میرے سے بھی پیارا ہے۔" ڈاکٹر اشرف نے کچھ اس انداز سے کہا کہ مغلی ششدر رہ گئی۔

عجیب سرسراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ اُس نے اپنے سینے پر زور سے اپنا ہاتھ رکھا۔۔۔ ڈاکٹر اشرف اس کی طرف آگیا۔ اُس کا بائیاں بازو پکڑ کر اُس کو دروازے کے اس طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔۔۔

"تم یہیں ٹھہرو۔ میں آیا۔" اُس نے دروازہ کھولا۔ لیکن اسی دم واپس اندر آگیا۔۔۔

"وہ تو خود ہی آگئی!" وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

ڈاکٹر اشرف کے اس کے بانہہ پکڑنے سے مغلی کا بند بند ٹوٹا۔ جیسے وہ آدم زاد نہ تھی بلکہ پاتال کی ایک ایسی پری تھی جس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ جس کو انسان دو ہاتھوں کی دو دو انگلیوں پر اٹھا کر آرام سے بستر پر ڈال سکتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف کا بستر بھی مغلی کو اُن ہی پریوں کے نازک بدن کی طرح نرم نرم لگ رہا تھا۔

اتنے میں موہنی اندر آگئی اور اندر آتے ہی اُس کے مُنہ سے نکلا۔۔۔

"آہا! آج مغلی بڑی صاف ستھری دُلہنیا جیسی لگ رہی ہے۔"

موہنی کی اس بات سے مغلی جیسے کسی چوری میں پکڑی گئی۔ اگر موہنی کی گود میں مجید نہ ہوتا شاید مغلی کمرے سے کھسک گئی ہوتی! مگر مجید پر نظر پڑتے ہی مغلی کے اندر کی ماں بیدار ہوئی اُس نے موہنی کی طرف باہیں پھیلائیں اور مجید کو زور سے اپنے سینے سے لگایا۔ مجید کو دُکان سے خریدی ہوئی ایک خوب صورت Ready made قمیض اور ایک موٹا سا گُل دار جانگیہ پہنایا گیا تھا۔ پیلے رنگ کی ایک نئی تولیہ اسے لپیٹی گئی تھی۔

"کیوں، ہے نا مجید اچھی طرح سے؟ خواہ مخواہ تمہارا سانس رُک گیا تھا۔"

ڈاکٹر اشرف نے ہنستے ہنستے مغلی سے کہا۔ اُس نے اندر والی جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور مغلی کی طرف بڑھایا۔

"نہیں جی!" مغلی نے لینے سے انکار کر دیا۔ زندگی میں پیسہ لینے سے اُس کا یہ پہلا انکار تھا۔

"یہ کس لئے؟"

"ڈاکٹر صاحب کے بیٹے نے بچوں کے مقابلے میں پہلا انعام جیت لیا۔ یہ اُسی کا شادیانہ ہے۔"

"ٹانگے پر اس کو اپنے ساتھ رکھو۔"

"گویا آپ نے اسے لا ہی لیا۔" موہنی نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

شام کے نو بجتے ہی مغلی ہسپتال پہنچی۔ جوں ہی وہ اِنڈور گیٹ سے داخل ہوئی، وہ ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہوئی۔ اُس کے چلنے کی ادا ہی بدل گئی۔ وہ سہم سہم کر آہستہ مگر تیز قدم اُٹھا رہی تھی۔ ہر قدم پر چپکے سے ادھر اُدھر دیکھتی تاکہ کسی کو اُس کے وجود کا احساس نہ ہو جائے! اور جب وہ ڈاکٹر اشرف کے کمرے کے قریب پہنچ گئی تو اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ زبان جیسے سُوکھ گئی۔ آنکھوں میں ایسا نشہ چھا گیا، لگ رہا تھا کہ کہیں اسے گناہ کا احساس اور لذت کا غلبہ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہلاک نہ کر دے! اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر دی۔ اور دائیں بائیں ڈر کر نظریں ڈال کر جلدی سے دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔ اپنی پیٹھ سے دروازہ بند کر کے اور اُس سے ٹیک لگا کر وہ ڈاکٹر اشرف کی طرف اس انداز سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو — "کہیں کوئی دیکھ نہ لے!"

ڈاکٹر اشرف کرسی پر بیٹھے، ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اُس کی بائیں طرف ایک پلنگ تھا جس پر ایک خوب صورت بستر اور ریشمی رضائی، ایک میٹھی اور نرم نیند کا احساس دے رہی تھی۔ کمرے میں ایسی خاموشی تھی جیسے کسی مشین سے اس کی ساری ہوا باہر نکالی گئی ہو۔ مغلی کی تیز تیز سانسیں اب صاف سُنائی دے رہی تھیں، ڈاکٹر اشرف کو بھی شاید اسی چیز کا احساس ہوا۔ اسی لئے پوچھا — "تمہارا سانس کیوں پھُولا ہے، جیسے کچھ ڈری سی گئی ہو؟"

مغلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اُس کا سر پیچھے کی طرف لٹک سا گیا۔ وہ ڈاکٹر اشرف کی طرف کچھ ایسے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو: سانس نہ پھُولے تو اور کیا ہو؟"

"تم تو دن بھر بھی بے چین رہی ہوگی۔ سوچا ہو گا کہ کہیں مجید کو کچھ ہو نہ جائے!" ڈاکٹر اشرف نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ مغلی نے اپنا سر اقرار میں ہلا دیا۔ اُسے اپنی چھاتیوں میں

سنگِ مزار

غلام رسول سنتوش

پھر یوں ہوا ۔۔

بیوی نے کہا ۔ "وہ مر جائے گی !"

رسوئی کے کونے میں بنے ہوئے چھوٹے سے حوض میں نہاتے ہوئے جب اُس نے یہ غیر متوقع بات سُنی تو لمحہ بھر کے لئے اُس پر سکتہ سا طاری ہوا ۔ گیلے بدن پر پھسلتی ہوئی پانی کی بوندیں جیسے یک لخت منجمد ہو گئیں ۔ بڑی مشکل سے گردن لمبی کر کے جھروکے سے اندر کمرے میں جھانکا ۔ بیوی لحاف کو ایک طرف ہٹا کر الف ننگی لیٹی ہوئی تھی ۔ وہ تولیہ لپیٹتا ہوا تیز تیز قدموں سے بیوی کے پاس آیا اور داہنے طرف جا کر کھڑا ہوا ۔

بیوی آنکھیں بند کیے چت لیٹی ہوئی تھی ۔

وہ گم سُم نظروں سے اُس کے چہرے کو دیکھتا رہا ۔ پھر اُس کی نظریں سر سے پاؤں تک

مومنی نے بات کی وضاحت کی۔

"یہ تو لینا چاہیئے۔ انکار نہیں کرتے۔" ڈاکٹر اشرف نے پانچ روپے کا نوٹ مغلی کو تھما دیا۔
مغلی کو صرف اتنا سمجھ آیا کہ ڈاکٹر اشرف کے گھر میں کوئی بڑا دن تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل آئی اور جاتے جاتے ڈاکٹر اشرف کی طرف ایک ایسی نظر ڈالی جیسے کہہ رہی ہو :
"آپ نے میرا مذاق کیوں اڑایا؟ میں صرف آپ ہی کے لئے نہائی تھی۔"

——————— (کشمیری سے ترجمہ)

اور ایک ابدی سکون اور سکھ محسوس ہوتا ہے!

ہر کرتی اور پُرش کا مِلاپ!

تانترک یوگی اس ایک لمحے کو جاوِدان بنا کر مکتی حاصل کر لیتے ہیں۔

پھر جیسے آگ بجھنے لگی اور اُسے محسوس ہوا کہ بیوی کا جسم ٹھنڈا پڑتا جا رہا ہے۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا —— بیوی کا جسم سوکھی مچھلی کی طرح اکڑ گیا تھا۔

پھر یوں ہوا ——

اُس نے ایک چیخ بلند کی کہ اُس کی بیوی مر گئی۔

اپنے پرائے سبھی آئے۔ مُردے کو غسل دیا۔ کفن میں لپیٹا اور قبرستان میں جا کر دفنا آئے ——

وہ یہ سب ایک تماشائی کی طرح دیکھ رہا تھا۔ قبرستان سے جب واپس گھر آیا۔ تو اُسے یُوں محسوس ہوا کہ وہ مر چُکا ہے اور لوگ اُسے قبرستان میں دفنا کر آئے ہیں!

"جینا مرنا خُدا کے ہاتھ میں ہے۔۔"

لوگ۔ اُسے سمجھاتے رہے۔ وہ سب کچھ سُنتے ہوئے بھی کچھ بھی نہیں سُن رہا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُن سب کو ایسے دیکھ رہا تھا کہ جیسے اُنھیں پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ یا انھیں کہیں پہلے مِل چُکا ہے اور اب پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

دِن بھر لوگوں کا ہجوم مکھیوں کی طرح اُس کے اِرد گرد منڈلاتا رہا۔ شام کو سبھی ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اب وہ اکیلا ہی کمرے میں رہ گیا۔ اُسے کمرے کی دیواروں میں چت لیٹی ہوئی بیوی کا ننگا جسم اُبھرتا ہوا دِکھائی دینے لگا۔ اُس نے لپک لپک کر پکڑنے کی کوشش کی۔ خالی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر فرش پر ڈھیر ہوا۔

جب رات کے اندھیرے گہرے ہو گئے تھے، وہ ہوش میں آیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ قبر میں لیٹا ہوا ہے۔ اُس نے گردن گھمانا چاہی۔ وہ جیسے لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ نظریں گھما کر اِدھر

بیوی کے ننگے بدن پر پھیلنے لگیں۔

بیوی نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں کھولیں اور ایک لمبی سانس لی۔

وہ اُس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ داہنے ہاتھ کی اُنگلیاں اُس کے بالوں میں پھیرنے لگا۔ اور بائیں ہاتھ سے اُس کے گال سہلانے لگا۔ جب بیوی کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی تو وہ اُس کے ساتھ لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ اُس کی چھاتی کو ملنے لگا۔ چھاتی کو ملتے ہوئے اُس کا ہاتھ اُبھری ہوئی چھاتیوں پر پھسلنے لگا اور پھر غیر اختیاری طور پر گولائیوں کو سمیٹنے لگا۔

بیوی آنکھیں بند کئے چت لیٹی ہی رہی۔

آج پھر اُس کے دل میں یہی خواہش اُبھری کہ وہ بیوی کے ننگے بدن کو ملتا رہے! اور وہ کسمساتی رہے۔ اُسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں جکڑے اور وہ پھڑکتی رہے۔ اور پھر تھک ہار کر ڈھیلی پڑ جائے!

پانی کے اندر ہاتھوں میں پکڑی ہوئی مچھلی پھسل جائے!

وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور بیوی کے ننگے بدن کو ملنے لگا۔ ریشم کی طرح ملائم اور مکھن کی طرح چکنے بدن میں جب تیزی سے حرارت بڑھنے لگی تو اُس نے بیوی کی چھاتیوں کو اپنی ہتھیلیوں سے دبا دیا۔ اور پھر جھک کر اپنے ہونٹ اُس کے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے۔

بیوی نے آنکھیں جھپکائیں۔

اُس نے ہتھیلیوں سے دبی ہوئی چھاتیوں کو مٹھیوں میں کس لیا اور آہستہ آہستہ اپنا جسم اُس کے بدن پر چادر کی طرح تان دیا۔

دو بدن چولھے کی طرح تپنے لگے۔

آگ تپتی رہی، بدن پگھلتے رہے، پگھل کر پھیلتے رہے، پھیل کر سمٹتے رہے اور سمٹ کر ایک ایسے نقطے پر آ کر تھم گئے جہاں چند لمحوں کے لئے وقت کی گردش رُک جاتی ہے،

پڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ بوڑھے سنگ تراش نے ہتھوڑا اور چھینی ایک طرف رکھ دیئے۔ اور اُس کی طرف دیکھے بنا حقہ بھرنے لگا۔ حقہ پی کر نے اُس کی طرف بڑھا دی اور پھر پتھر تراشنے لگا۔

"مجھے قبر کے لئے سنگ بنوانا ہے۔" اُس نے بوڑھے سنگتراش کو متوجہ کرنا چاہا۔

بوڑھے سنگتراش نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ مکان کی اور دیکھ کر آواز دی۔ چند لمحوں میں ایک لڑکی جلتا ہوا چراغ لے کر باہر آئی۔ اُس نے سرسری نظر سے لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی سُرخ رنگ کا پیرہن پہنے ہوئی تھی۔ اور چراغ کی روشنی میں آگ کا شعلہ سا دکھائی دے رہی تھی۔ لڑکی نے چراغ بوڑھے سنگتراش کے پیچھے ایک اُونچے پتھر پر رکھا۔ چند لمحے وہیں کھڑی رہی اور پھر واپس مکان کے اندر چلی گئی۔

ہاری پربت قلعے کے عقب میں جب شری چکر مندر میں آرتی کی گھنٹیاں بجنے لگیں تو بوڑھے سنگتراش نے ہتھوڑا اور چھینی ایک طرف رکھ دیئے اور سر نگوں ہو کر دم سادھے بیٹھ گیا۔ وہ متحیر نظروں دیکھتا رہ گیا۔ جب بہت دیر تک بوڑھے سنگتراش کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تو اُسے محسوس ہوا کہ آس پاس پڑے ہوئے پتھروں میں بوڑھا سنگتراش بھی ایک پتھر ہے جسے اُس کے ہاتھ ایک نہ ایک دن کسی قبر کے لئے سنگ تراشیں گے!

قبرستان کی خاموشی، رات کے سیاہ مہیب اندھیرے، پتھر کی طرح ساکت بوڑھا سنگ تراش؛ ایسا ماحول دیکھ کر اُس کے دل میں خوف کا سا احساس جاگا۔ اُس نے مکان کی اور دیکھا۔ وہاں رسوئی کے دو جھروکوں میں سے ہلکی مدھم سی روشنی دکھائی دی۔ جیسے جھروکے نہ ہوئے، ادھ کھلی دو مری ہوئی آنکھیں ہوں! مکان کی دیوار کے سہارے تراشے ہوئے سنگ یوں دکھائی دیئے کہ جیسے قبروں میں سے بھاگے ہوئے مُردے دیوار کی آڑ میں سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اُدھر دیکھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اُسے یقین ہوا کہ وہ مر چکا ہے اور اب اُس پر فشارِ قبر کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ کمرے کی دیواریں اپنی جگہ سے سرک رہی ہیں۔ اور اُس کی طرف سمٹتی چلی آ رہی ہیں۔ وہ چیختا چلاتا سیڑھیوں کو پھلانگتا ہوا باہر سڑک پر آیا۔ گھوم کر گھر کی طرف دیکھا۔ سارے کا سارا مکان اپنی طرف سرکتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ بہت رات گئے تک اپنے آپ کو سڑکوں پر بے مقصد گھسیٹتا رہا۔ جب رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی تو اُس نے اپنے آپ کو قبرستان میں بیوی کی قبر پر پایا۔ رُکے ہوئے سیلاب کے پانی کو جیسے نکلنے کا راستہ مل گیا!

وہ دیر تک بیوی کی قبر پر روتا رہا۔ قبر کی مٹی کو اپنے آنسوؤں سے بھگوتا رہا۔ جب اُسے گیلی مٹی کی چکناہٹ کا احساس ہوا، تو وہ اُچھل کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ قبر کو ایسے دیکھتا رہا، جیسے قبر نہ ہو اُس کی بیوی لیٹی ہوئی ہو!

اب وہ ہر روز سورج غروب ہونے کے بعد بیوی کی قبر پر جاتا۔ قبر سے لپٹ کر زار و قطار رو لیتا۔ اُسے بوسے دیتا۔ اور ہاتھوں سے سہلاتا رہتا جیسے قبر نہ ہو، اُس کی بیوی کا جسم ہو!

ایک دن اُسے اپنے ہاتھوں پر نظر پڑ گئی جو قبر کو سہلاتے سہلاتے کھردرے سے ہو گئے تھے۔ وہ چونک اُٹھا۔ مٹی سے لت پت ہاتھوں کو صاف کیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیری۔ سارا مُنہ مٹی سے بھر گیا۔ قبر کو غور سے دیکھا۔ جا بجا مٹی اُکھڑی ہوئی تھی۔ قبر پر رکھے ہوئے پتھر اپنی جگہ سے اُکھڑ گئے تھے اور آس پاس کی سب جگہ نئی قبروں سے بھر گئی تھی۔ تب اُس کو محسوس ہوا کہ اُسے قبر پر سنگ لگوانا چاہیے!

قبرستان میں ہی بوڑھے سنگتراش کا مکان تھا۔ مکان کی دیوار کے سہارے کئی ایک تراشے ہوئے سنگ رکھے ہوئے تھے۔ اُسے ان میں سے ایک بھی پسند نہ آیا۔ وہ بوڑھے سنگتراش کے پاس گیا، جو کھلے صحن میں کیکر کے نیچے پتھر تراش رہا تھا۔ وہ پاس

لڑکی نے چراغ اُٹھاکر بوڑھے سنگتراش کے سامنے پڑے ہوئے ایک پتھر پر رکھ دیا۔ اور پھر اُس پتھر سے ٹیک لگائے کھڑی ہوئی؛ جہاں پہلے چراغ رکھا ہوا تھا۔

بوڑھے سنگتراش کی آنکھیں چراغ کی لو جیسی چمک رہی تھیں۔ اُس نے بوڑھے سنگتراش کے چہرے پر سے نظریں ہٹالیں اور لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ کنکھیوں سے اُسے دیکھ رہی تھی اور مسکرائے جارہی تھی۔

اُس کا ذہن جیسے ماؤف ہوگیا اور سوچنے کی قوت لڑکی کی مسکراہٹ میں مقید ہوکر رہ گئی ——

پھر یوں ہوا ——

وہ اپنی بیوی کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر سیدھا بوڑھے سنگتراش کے پاس آکر بیٹھ جاتا ——، قبرستان کی خاموشی، رات کے اندھیرے، بوڑھے سنگتراش کی اُلجھی اُلجھی باتوں سے اب اُسے کوئی خوف محسوس نہ ہوتا۔

ایک دن جب وہ بوڑھے سنگتراش کے پاس بیٹھا تھا، قبرستان میں کئی ایک جگہ ایک ساتھ مُردے دفن کئے جارہے تھے۔ تو بوڑھے سنگتراش نے کہا:

"پہلے یہاں لوگ کم تھے اور جنگل زیادہ۔ جنگل کٹ کر گر گئے اور اُن کی جگہ انسان اُگنے لگے۔ سرسبز و شاداب زمین بنجر بن کر رہ گئی۔ اُگتے بڑھتے پھیلتے ہوئے انسانوں کو جب کھانے کے لئے کچھ بھی نہ رہا۔ تو ایک دوسرے کو کھانے لگے۔

بوڑھا سنگتراش بولتے بولتے نہ جانے کن سوچوں میں ڈوب گیا۔ اُس کے ہاتھوں سے ہتھوڑا اور چھینی چھوٹ کر گر گئے۔ وہ بظاہر کھُلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا لیکن اُس کی نظریں جانے کہاں بھٹک رہی تھیں۔

قبرستان میں موت کا سا سنّاٹا تھا۔ لوگ مُردوں کو دفنا کر چلے بھی گئے تھے۔ بوڑھا سنگتراش جیسے گہری نیند سے جاگ پڑا۔ رات کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے قبرستان

جب شری چکر مندر کی گھنٹیاں بجنا بند ہو گئیں۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ بوڑھے سنگتراش کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اُس نے جھکا ہوا سر اُوپر اُٹھایا۔ گردن کو زور سے جھٹکا دے کر جیسے لمبا کرنے کی کوشش کی اور پھر اُس کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگا

"مجھے قبر کے لئے سنگ بنوانا ہے!"

"تمھاری اپنی قبر کے لئے؟" بوڑھے سنگتراش کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی تھی۔

اُس کے تمام جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ہلنے کی کوشش کی۔ جسم پتھر کی طرح بھاری محسوس ہوا۔

بوڑھے سنگتراش کی گردن اب بھی اکڑی ہوئی تھی۔ اُس نے ہتھوڑا ہوا میں لہرایا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا، لیکن آواز گلے میں ہی اٹک کر رہ گئی۔

بوڑھے سنگ تراش نے ہتھوڑا زور سے چھینی پر مارا۔ پتھر کا ایک ٹکڑا اُس کے سر پر سے ہوتا ہوا دُور کہیں اندھیرے میں جا گرا۔ اُسے اپنی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بوڑھے سنگتراش نے سر گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا، جہاں لڑکی آ کر کھڑی ہوئی تھی۔

وہ دَم روکے باپ بیٹی دونوں کو سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

بوڑھے سنگتراش نے ہتھوڑا اور چھینی نیچے رکھ دیئے۔ اور پھر یُوں مخاطب ہوا — "تو تمھیں اپنی بیوی کی قبر کے لئے سنگ بنوانا ہے۔"

اُس نے گردن ہلا کر ہاں کہہ دی۔

بوڑھے سنگتراش نے سرد آہ بھری — "یہاں سبھی مرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔" بوڑھا سنگتراش چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر دھیمے مگر ترش لہجے میں کہا — "اور ایک دِن تو بھی مر جائے گا!"

"ہاں!" گھبراہٹ میں اُس کی زبان سے خود بخود نکل گیا۔

مُڑ کر دیکھا۔ رات کے اندھیرے کے سوا کچھ بھی دِکھائی نہ دیا۔

جب ہر مکھ کی برفیلی چوٹیاں، بڑے بڑے چنار کے درخت، آس پاس پھیلے ہوئے مکان رات کی تاریکیوں میں ڈوب جاتے اور قبرستان میں مکمل سناٹا چھا جاتا تو اُسے بوڑھے سنگتراش کا صحن، چراغ کی دھیمی دھیمی روشنی میں کسی لوک کہانی کی وہ جگہ دکھائی دیتا جہاں پریاں اور دیو رہتے ہیں۔ ہاری پربت قلعے کی پہاڑی کسی دیو کی صورت اپنا لیتی لڑکی وہ پری، جو کسی شہزادے کی یاد میں ہر دم ڈوبی رہتی ہے اور بوڑھا سنگتراش پُرانے قصّے کہانیوں کا داستان گو۔

اب وہ بوڑھے سنگتراش کی باتیں اُسی دلچسپی سے سُن لیتا تھا کہ جیسے کوئی پُرانی لوک کہانی سُن رہا ہو ــــ "تو تمھاری بیوی ابھی کم عُمر تھی؟" بوڑھے نے ایک دن کہا ــــ "موت، عمر دیکھ کر نہیں آتی۔ تمھیں اپنی بیوی کے ساتھ بے حد پیار تھا۔ کیوں نہ ہو ــ؟ بیوی تو اپنے ہی جسم کا ایک انگ ہے۔ اپنے سے پیار کسے نہیں ہوتا!"

بوڑھے سنگتراش کا لہجہ گمبھیر ہو گیا۔ "اس دُنیا میں رہنے والا ہر انسان صرف اپنے وجود سے پیار کرتا ہے۔"

اس کے بعد بوڑھا سنگتراش خاموش ہو گیا۔ اُسے بوڑھے سنگتراش کی یہ بات اچھی نہیں لگی اُس نے چاہا کہ وہ اُس سے کہے کہ میرے دِل کے اندر جھانک کر دیکھو، جہاں میری بیوی کی یاد دِل کی دھڑکن بن کر دھڑک رہی ہے۔ میری ہر ایک سانس میں اُس کی خوشبو رچی بسی ہے۔ میرے تمام جسم پر اُس کے انگ انگ کا لمس ابھی تک موجود ہے ــــ لیکن وہ کچھ نہ کہہ پایا۔

پھر یوں ہوا ــــ

رات کی تاریکیوں میں سے اُسے اپنی بیوی کا ہیولا اُبھرتا ہوا دکھائی دیا۔ ہیولا آہستہ آہستہ ننگے بدن میں ڈھل گیا۔ ہوا کے دوش پر لہراتا ہوا بوڑھے سنگتراش کے سر کے اوپر آکر ٹھہرا

کے اِردگرد نظریں دوڑائیں۔

"اب یہ قبرستان بھی قبروں سے بھر گیا۔" "آس پاس کی قبروں میں اپنی بیوی کی قبر پہچان پاتے ہو؟" بوڑھا سنگتراش اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اسی لئے تو چاہتا ہوں کہ قبر پر سنگ لگ جائے۔" اُس نے بوڑھے سنگتراش کو یاد دلایا

"وہ اپنی کہتا رہا۔" اگر انسان کا نام نہ ہوتا!" وہ اپنے ہی سوال کے جواب میں کھو گیا۔ پھر جیسے اُسے سوال کا جواب مل گیا۔" یہ دُنیا ایک بھٹی ہے، اس میں بسنے والے انسان کچے برتن، جو بھٹی کی آگ میں پک رہے ہیں اور ہر گھڑی اپنی ہیئت بدلتے رہتے ہیں۔ بہت کم اصلی حالت میں بھٹی سے باہر آتے ہیں۔ باقی یا تو بگڑی ہوئی صورت لے کر نکلتے ہیں یا بھٹی میں ہی ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔"

بوڑھا سنگتراش پھر خاموش ہو گیا۔ اُس کے چہرے کی جھُریاں اور گہری ہو گئیں۔ پھر جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔" ارے ہاں۔ اپنی بیوی کا نام اور تاریخِ وفات کاتب سے لکھوا کر لے آنا۔"

پھر بوڑھا سنگتراش سُرعت کے ساتھ سنگ تراشنے لگا۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے بوڑھے سنگتراش کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے چل دیا۔ مکان کی دیوار کے پاس سے گزرتے ہوئے اُس کی نظر کھڑکی میں گئی۔ لڑکی کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنیاں جمائے، اپنا چہرہ ہاتھوں میں لئے رات کے اندھیروں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا اور غیر اختیاری طور پر جوتے کی نوک سے زمین پر بکھرے ہوئے پتھر کے ٹکڑوں میں آواز پیدا کی۔ لڑکی نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور اُس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے دونوں کی نظریں مل گئیں۔ لڑکی نے نظریں ہٹا لیں۔ لیکن اُس کی اپنی نظریں وہیں جیسے ہوا میں معلّق ہو کر رہ گئیں۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ چلتے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ لڑکی کی نگاہیں اُس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ دُور پہنچ کر جہاں قبرستان ختم ہوتا ہے، اُس نے

کو دینے لگا۔ چلم میں آگ بھر کر حُقہ پینے لگا۔ جب وہ حُقہ پی چکا تو نے اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا:

"تم کبھی مندر گئے ہو؟" اُس کا جواب سُننے سے پہلے ہی وہ خود بول اُٹھا۔ "تم مسلمان ہو۔ مسجد میں جاؤ گے! ہندو مندر میں جاتا ہے اور مسلمان مسجد میں —— انسان کہاں جائے گا؟"

پھر جیسے اُسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"ایک سوامی جی تھے۔ ساری عمر صرف مندر بنواتے رہے۔ ہر نئے مندر میں ایک نئی مورتی نصب کروا دیتے۔ آخری مندر جو اُس نے سمادھی لینے سے پہلے بنوایا، اُس میں مورتی کے بدلے آئینہ رکھوا دیا۔"

بوڑھا سنگتراش سرنگوں ہوا۔ اور اپنی سوچوں میں گم ہوا۔

وہ کچھ دیر کے لئے بوڑھے سنگتراش کی کہی ہوئی کہانی پر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ جیسے سوچتے ہوئے بھی کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ پھر اپنی گردن کو یوں جھٹک دیا کہ جیسے اپنے ذہن سے تمام تر سوچیں نکال کر پھینک دیں!

لڑکی نے انگڑائی لی۔ وہ جیسے تھک ہار کر چور ہوئی تھی۔ اُس کی نظریں پیچان کے بیل کی طرح لڑکی کے جسم سے لپٹنے لگیں۔ لڑکی کی نظریں اُس کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے جا ٹکرائیں۔ وہ چھوئی مُوئی کی طرح شرما کر سمٹ گئی۔

بوڑھا سنگتراش جیسے اپنے آپ سے بول رہا تھا:

"اس دُنیا میں رہنے والا ہر انسان صرف اپنے وجود سے پیار کرتا ہے۔"

پھر یوں ہوا ——

دوسرے دن صبح سویرے نیند سے جاگنے کے بعد اُس نے بیوی کی تصویر کو دیکھنے کی بجائے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اُسے ایسا کوئی احساس نہیں ہوا کہ اُسے اپنے آپ سے پیار ہے —— اُس نے آنکھیں بند کیں۔ بیوی کے ننگے بدن کا روپ اپنی آنکھوں کے سامنے لے آیا۔ اور اُس کے انگ انگ کو چومتا رہا۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے یہ محسوس ہوا کہ ان

ہُوا۔ اُس نے چاہا کہ لپک کر پکڑ لے۔ لیکن ہیولا پیچھے کی طرف بڑھتا ہوا بُوڑھے سنگتراش کے مکان میں جاکر غائب ہوا۔ وہ آنکھیں ملتا رہا۔

ہاری پربت قلعے کے عقب میں شری چکر مندر میں آرتی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بُوڑھا سنگتراش سرنگوں ہوکر ساکت پتھر جیسے بن گیا۔ وہ دیر تک مکان کی اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اور پھر اُس نے دیکھا کہ اُس کی بیوی کا ہیولا مکان سے باہر آکر بُوڑھے سنگتراش کے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔ اب کی بار ہیولے کو پکڑنے کے لئے وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ ابھی وہ اُٹھا ہی تھا کہ گھنٹیاں بجنا بند ہوگئیں۔ بُوڑھے سنگتراش کے جسم میں حرکت ہوئی۔ اور اُس کی بیوی کا ہیولا بُوڑھے سنگتراش کی بیٹی میں ڈھل گیا۔ اُس کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں۔ لڑکی پاس پڑے ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مُسکرا رہی تھی۔

بُوڑھا سنگتراش اُس سامنے تراشے ہوئے سنگ پر اپنے ہاتھ پھیرنے لگا۔

"میری ساری عمر یہی سنگ تراشتے تراشتے بیت گئی۔ ان ہی ہاتھوں نے میری بیوی کی قبر کے لئے سنگ تراشا۔ یہی وہ ہاتھ ہیں جنھوں نے دو جوان بیٹوں کی قبر کے لئے سنگ تراشے ہیں۔"

بُوڑھا سنگ تراش اپنے ہاتھوں کو اُلٹ پلٹ کر ایسے دیکھ رہا تھا کہ جیسے کسی تاریخ کے ورق پڑھ رہا ہو۔ اُس کے سنجیدہ چہرے پر کسی بھی دُکھ کے آثار نہیں تھے۔ جیسے چہرہ نہ ہُوا، پتھر پر کندہ کیا ہوا کتبہ ہوا۔

"کئی بار سوچا کہ اپنے لئے بھی ایک سنگ تراش کے رکھ دوں۔ لیکن ہمیشہ اس لڑکی نے باز رکھا۔" اُس نے دیکھا کہ لڑکی کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے ہیں۔ اُس کی نگاہیں لڑکی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

ـــــ کاش کہ وہ ان آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں میں سمو سکے!

لڑکی نے ڈوپٹے سے آنسو پُونچھ لئے۔ بُوڑھا سنگتراش کانگڑی کی راکھ میں سے آگ تلاش

طرف یوں دیکھنے لگا کہ جیسے اُس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اُس کے چہرے پر سے نظریں ہٹا کر بیٹی کی اور دیکھا۔ وہ اُٹھ کر مکان کے اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد جلتا ہُوا چراغ لے کر باہر آئی۔

بُوڑھا سنگتراش ٹاٹ کے ایک ٹکڑے سے سنگ صاف کرنے لگا۔

"جانتے ہو، یہ سنگ کب سے تراش رہا ہوں؟" بُوڑھے نے سوال کیا۔

"ہاں۔ جب سے میں یہاں آ رہا ہوں ـــ" اُس نے محض سوال کا جواب دینے کی خاطر کہا، نہیں تو اُسے بُوڑھے سنگتراش کے ساتھ اب باتیں کرنے کی کوئی چاہت نہیں تھی۔

"نہیں ـ یہ سنگ میں تمھارے آنے سے پہلے بھی تراش رہا تھا ـــ شاید تب سے تراش رہا ہوں، جب سے میں نے ہتھوڑا اور چھینی چلانا سیکھی ہے۔" بُوڑھا سنگ تراش پھر سوچوں میں کھو گیا۔

شری چکر کے مندر میں آرتی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بُوڑھا سنگتراش سرنگوں ہو کر بیٹھ گیا۔ اُس کی اور لڑکی کی نظریں ایک ساتھ ایک دوسرے کی طرف اُٹھ گئیں۔ چند لمحوں کے لئے دونوں غیر اختیاری طور پر ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوب گئے۔ پھر لڑکی کی آنکھیں جُھک گئیں۔ اُس کا چہرہ عنابی ہُوا جا رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے ایسا ہی عنابی رنگ اپنی بیوی کے چہرے پر ہر اُس وقت دیکھا ہے جب وہ اُس کے ننگے بدن کو ملتا تھا۔ جب وہ اُس کی ننگی چھاتیوں کی گولائیوں کو سمیٹتا تھا۔ اور جب ہونٹوں کا بوسہ لیتے ہوئے وہ دانتوں سے انھیں ہلکے سے کاٹتا تھا۔

آرتی کی گھنٹیاں بجنا بند ہو گئیں۔ بُوڑھے سنگتراش کا جُھکا ہوا سر اوپر اُٹھا۔ آج اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔ اُس نے زور سے سر کو جھٹک دیا۔

"یہ انسان بھی ایک عجیب شے ہے۔ نہ اسے ماضی یاد رہتا ہے اور نہ مستقبل میں جھانکنے کی ہی اسے فرصت ہے۔ حال کے ہالے میں ایسے گھومتا ہے جیسے بھنور اپنے ہی ارد گرد گھومتا رہتا ہے!"

یوں تو وہ بُوڑھے سنگتراش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن اُس کی چور نظریں لڑکی کے

بوسوں میں مٹّی کا سا مزہ ہے۔ تب اُس کو یہ بات یاد آئی کہ اُس کی بیوی منوں مٹّی کے نیچے قبرستان میں دفن ہے۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ آئینے میں بوڑھے سنگ تراش کی بیٹی کا چہرہ دِکھائی دیا۔ کنوارہ چہرہ، ڈل جھیل کے شفاف پانی میں دُھلے ہوئے کنول جیسا چہرہ، دُھوپ میں چمکتے ہوئے برفیلے ہرمُکھ جیسا چہرہ۔ چاند کا جیسا خمار آلود چہرہ، بہار کے شگوفوں کی طرح مُسکراتا ہوا چہرہ ——— اُسے تمام جسم میں مستی سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ بے تحاشہ اس چہرے کو چُومتا ہی گیا۔

پھر اُس نے دیکھا کہ آئینہ اندھا پڑ گیا۔ اپنی چھاتی سے رگڑ کر آئینہ صاف کیا۔ اب کی بار اس میں بوڑھے سنگتراش کا جھُریوں بھرا چہرہ اُبھر آیا۔ اُس نے آئینہ فرش پر پٹخ دیا۔ آئینے کے ٹکڑے تمام فرش پر بکھر گئے۔ آئینے کے ہر ٹکڑے میں سے اُسے بوڑھے سنگتراش کا مُسکراتا ہوا سنجیدہ چہرہ دِکھائی دیا۔ اور کانوں سے یہی آواز ٹکراتی ہوئی محسوس ہوئی:

"اس دُنیا میں رہنے والا ہر انسان صرف اپنے آپ سے پیار کرتا ہے۔"

دِن بھر یہی آواز اُس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ شام کو جب وہ بوڑھے سنگتراش کے پاس آیا تو وہ چھینی چھینی سے سنگ کو صاف کر رہا تھا۔ لڑکی بھی اُس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بھی لڑکی کے ساتھ ہی پڑے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ لڑکی تھوڑا کسمسائی اُس کے اس طرح کسمسانے سے اُس کے تمام جسم میں کھلبلی سی مچ گئی۔

——— "کاش کہ وہ لڑکی کے اُوپر جال کی طرح پھیل سکتا!"

اُس نے انگڑائی لی۔ اُوپر کی طرف اُٹھی ہوئی بانہیں کچھ دیر ہوا میں مُعلق رکھ دیں۔ اور پھر ان کا حلقہ بنا کر یُوں نیچے لے آیا کہ جیسے ان میں کوئی پھڑکتا ہوا ننگا بدن جکڑا ہوا تھا۔ لڑکی کا چہرہ انگارے کی طرح دھک رہا تھا۔ بوڑھا سنگتراش حُقّہ پیتا رہا۔ پھر جیسے وہ حُقّہ پینا ہی بھول گیا۔ نَے ہونٹوں میں دبا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اُس کی ادھ کھُلی آنکھیں نہ جانے کہاں کہاں دیکھ رہی تھیں۔ حُقّے کو تھامے اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور نَے اُس کے ہونٹوں سے چھُوٹ گئی۔ بوڑھے سنگتراش کے جسم میں جھٹکا سا لگا اور وہ جیسے نیند میں چونک اُٹھا۔ اور اُس کی

لئے بھٹکنے لگتا۔ اب اُس کی اپنی سوچیں تھیں، جو پھیلتے پھیلتے لڑکی کے وجود میں سمٹ جاتیں۔ اور وہ بے چین ہو اُٹھتا۔ جب شری چکر مندر میں آرتی کی گھنٹیاں بجنے لگتیں، وہ اُٹھ کر لڑکی کے پاس چلا جاتا۔

دونوں کے درمیان فاصلے سمٹ چکے تھے اور سمٹ کر ایک ایسے نُقطے پر آکر رُک گئے تھے جہاں دائرہ نُقطہ بن جاتا ہے اور نُقطہ دائرے میں پھیل جاتا ہے۔ باتیں بے معنی ہو چکی تھیں۔ اب آوازوں کا سرگم تھا اور دھڑکنوں کا زیر و بم۔ انگ انگ کا لمس پاکر بدن تپنے لگتے۔ تپ کر پگھل جاتے اور پگھل کر ایک دوسرے پر پھیلنے لگتے۔ دو جسم ایک ہی وجود میں ڈھل جاتے!

گردِش رُک جاتی!

حقیقتیں خواب بن جاتیں!

خواب پگھلنے لگتے!

ابدی سکون اور سکھ کا احساس جاگ اُٹھتا!

پرکرتی اور پُرش کا ابدی مِلاپ!

پھر یُوں ہوا ـــــ

بُوڑھے سنگتراش نے کہا کہ اُس کی بیوی کی قبر کے لئے سنگ تیار ہے۔ صرف نام اور تاریخ وفات کندہ کرنا باقی رہ گیا ہے۔

تب اُس نے بہت کوشش کی کہ وہ قبرستان کی قبروں میں سے اپنی بیوی کی قبر پہچان سکے۔ پھر تھک ہار کر یہ بات ہی ذہن سے اُتار دی۔

پھر یُوں ہُوا ـــــ

بُوڑھے سنگتراش نے کہا ـــ وہ مر جائے گا!

اندر مکان میں سے لڑکی کی بین کرنے کی صدائیں آرہی تھیں۔ اور وہ صحن میں کھڑا اپنی بیوی کی قبر کے لئے تراشے ہوئے سنگ کو دیکھ رہا تھا جس پر بُوڑھے سنگتراش نے اپنا نام اور تاریخِ وفات کندہ کیا ہوا تھا:

▲▲▲

چہرے کو چوم رہی تھیں۔ اُس کی تمام تر سوچیں لڑکی کو اپنے ہالے میں جکڑ رہی تھیں۔
وہ بوڑھے سنگتراش کی باتیں سنتے ہوئے بھی کچھ بھی نہیں سُن رہا تھا۔ ماضی کی تمام تر یادیں پُرانی قبروں کی طرح اُس کے ذہن میں منہدم ہوتی جارہی تھیں۔ مستقبل کے بارے میں اُس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ حال کا باسی تھا۔ لڑکی کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر حال کے ہالے میں ناچ رہا تھا۔
اُس نے دیکھا کہ لڑکی کنکھیوں سے اُسے اُٹھنے کے لئے اشارہ کررہی ہے۔ لڑکی اُٹھ کر مکان کے اندر چلی گئی۔ بوڑھا سنگتراش اپنے کھردرے ہاتھ تراشے ہوئے سنگ پر ایسے پھیر رہا تھا کہ جیسے کسی نوزائیدہ بچے کو تھپکیاں دے رہا ہو!
"انسان خود اپنی قبر کا سنگ ہے۔ اس سنگ پر اس کا نام اور تاریخ وفات کندہ کیا ہوا ہے ——
—— تمھیں یہ سنگ پسند ہے؟" بوڑھا سنگتراش سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔
اُس کو بوڑھے سنگتراش کا چہرہ کسی پرانی قبر کا وہ کتبہ دکھائی دیا جو کوشش کرنے کے باوجود پڑھا نہیں جاتا تھا۔
"ہوں —— اچھا ہے!"
بوڑھے سنگتراش کے کھردرے ہاتھ تراشے ہوئے سنگ کی چکنی سطح پر پھیل رہے تھے؛ اور اُس کی نظریں جیسے کہیں خار دار جھاڑیوں میں اُلجھ گئی تھیں۔ چہرے کی جھریاں سُکڑ کر کبھی پھیل رہی تھیں اور پھیل کر سُکڑ رہی تھیں۔ وہ بوڑھے سنگتراش کو کچھ کہے بغیر وہاں سے چل دیا۔
مکان کے پاس سے گذرتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ لڑکی کھڑکی میں اُس کا انتظار کررہی ہے۔ وہ پاس گیا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے میں اُلجھ کر رہ گئیں۔
پھر یوں ہوا ——
وہ محض وقت گذارنے کے لئے بوڑھے سنگتراش کے پاس آکر بیٹھ جاتا۔ نہ ہی وہ اُس کی باتوں پر دھیان دیتا اور نہ ہی اب۔ اُس کا ذہن بیوی کی یادوں میں لمحہ بھر کے

کیا کہوں؟ میرے سر اس دھرتی کا بوجھ جو ہے۔ میں وہی بات، دُرست تسلیم کرکے اُس کا ساتھ دوں گا جو پَل بھر کے لئے یہ بوجھ اپنے سر لے کر مجھے دم لینے دے!"

وِیاس جی کہتے ہیں کہ وِشوامتر نے اپنی ہزاروں برس کی تپسیا کا سہارا لیا۔ پھر بھی وہ دھرتی کا بوجھ نہ اُٹھا سکے۔ وِشسشٹ جی نے اپنے ایک لمحے کے ست سنگ کا سنکلپ کیا کہ بھاری بھرکم دھرتی کنول کے پھُول کی مانند ہلکی ہو گئی اور آسانی کے ساتھ اُسے اپنے سر پر اُٹھا لیا۔ وِشسشٹ جی کا کمال دیکھ کر دیوتا خوش ہوئے اور انھوں نے آسمان سے پھُولوں کی ورشا کی۔

پُرانوں میں درج یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ ست سنگ یعنی اچھے لوگوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کو کس قدر کمال اور عظمت حاصل ہے۔ انسان کتنا ہی زور لگا لے، بالآخر اُسے ست سنگ ہی پار لے جا سکتا ہے۔ مگر اس بات کا احساس مجھے اُس وقت ہُوا جب میں چالیس برس کی عمر سے تجاوز کر گیا۔ جب میں نے اپنی نصف سے زائد عمر ست سنگ کے بنا ضائع کر دی تھی۔ چلیئے، دیر آید دُرست آید۔ میں بیدار تو ہوا۔ اب دوسرے لوگوں کو جگانا میرا فرض بن جاتا ہے۔ ست سنگ کے بنا نادانوں کی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ یہی احساس جگانے کے لئے میں لوگوں کے کلیان کی خاطر وِشوامتر اور وِشسشٹ جی کی یہ کتھا بیان کرتا ہوں ____

لیکن وہ ست یُگ تھا۔ ہر سُو سچائی، سادگی، اعتماد اور اعتبار کی فضا مہک رہی تھی۔ مگر آج ___ آج لوگ شکّی اور سُخن ساز ہیں۔ انھیں تو نُون میں نکتہ نکالنے کی لت پڑ چکی ہے۔ وہ کہیں گے یہ بھی کوئی بات ہوئی ____ نہ کوئی ڈائیلاگ، نہ کہیں ماحول کی عکاسی۔ اور نہ ہی کہیں وِشوامتر یا وِشسشٹ جی کا کردار اُبھرتا ہے ___ یہ صرف ایک خاکہ ہے، خاکہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ____

میں نے اس افسانے کے ڈھانچے میں گوشت پوست اور خُون بھرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ آج کل کے سُخن سازوں کو اس پر اعتبار آجائے اور وہ اس سے کوئی نصیحت حاصل کرلیں۔ بُنیادی طور پر یہ پُرانوں میں درج وہی پُرانی دھرم کتھا ہے اور اسے قلم بند کرکے

پنڈتوں کیلئے دھرم کتھا

• جسے مسلمان بھائی بھی پڑھ سکتے ہیں!

ھری کرشن کول

آدِ دیو مہا گنیش کو نمسکار کہہ کر پُورانوں میں درج ایک کہانی بیان کرتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ ایک دِن مُنی وِشوامترا اور وِشسٹ رِشی کے مابین یہ بحث چھڑ گئی کہ تپسیا عظیم ہے یا ست سنگ؟ وِشوامتر مہارشی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تپسیا، ریاضت یعنی کسی مقصد کی خاطر جان لڑانے کو ہی بلند مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن وِشسٹ جی اس بات کے قائل تھے کہ سچا کمال اور سچی عظمت ست سنگ یعنی اچھے اور نیک لوگوں کی صحبت حاصل کرنے، اُن کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے میں ہی مُضمر ہے۔ چونکہ دونوں اعلٰے پایہ کے مُنش تھے، اس لئے شاید کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ بالآخر دونوں بھگوان شیش ناگ کے پاس چلے گئے اور ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ ــــ "ہے شیش بھگوان! آپ عقل، فہم و فراست کا سرچشمہ ہیں۔ ہمیں یہ بتائیے، تپسیا عظیم ہے کہ ست سنگ؟ شیش ناگ نے کہا ــــ "ارے! میں

"پنڈت جی! آپ اتنی دیر کہاں تھے؟ پرنسپل جیسے بوکھلا گیا تھا۔" چوتھے پیریڈ میں فسٹ ٹی، ڈی والوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا۔

وِشسٹ جی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ٹائی کو نرم کرتے ہوئے قمیض کے اُوپری بٹن کو کھول دیا۔ اور رُومال سے پسینہ پونچھ کر پرنسپل سے کہا۔ "جناب۔ کیا کہوں ۔ میں نارد جی کے ہاں گیا تھا اور اتنی دیر وہیں پھنسا رہا۔"

"آپ نارد جی کے ہاں گئے تھے۔" پرنسپل شیش ناگ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُس نے اکاؤنٹنٹ کو بعد میں آنے کا حکم دیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک سگریٹ ہونٹوں میں رکھ لیا اور دوسرا وِشسٹ جی کی طرف بڑھا دیا۔

"اچھا! تو کیا فرما رہے تھے نارد جی؟" سگریٹ سُلگا کر شیش ناگ نے پوچھ لیا۔

"جناب ــــــ نارد جی کے کیا کہنے ہیں۔" وِشسٹ جی نے کہا۔ "سچ مچ وہ گھڑیاں رنگ لا رہی ہیں جو انسان ان کے چرنوں میں گذار دیتا ہے۔"

"سچ ہے۔ سچ ہے ــــــ" شیش ناگ نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے زور زور سے سر ہلایا اور پوچھا۔ "کہیں میرا ذکر تو نہیں ہوا؟"

"جناب! میں نے تو خود ہی بات چھیڑ دی اور کہا کہ آپ جیسے پرنسپل نصیب سے ہی ملتے ہیں۔ جب سے آپ نے چارج سنبھالا، کالج میں رونق سی آگئی ہے۔ کیا مجال کہ کوئی لڑکا ہنگامہ کرے یا کوئی پروفیسر کلاس چھوڑ کر چلا جائے۔"

"اُن سے یہ بھی کہنا تھا کہ اخباروں میں یہ جو کچھ میرے خلاف شائع ہوتا ہے، وہ میرے دُشمن لکھواتے ہیں۔" شیش ناگ نے سگریٹ کا لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے اور پھر وِشسٹ جی نے شیش ناگ سے دریافت کیا۔ "جناب! سُنا ہے کہ پروفیسر وِشوامتر کٹھوعہ سے تبدیل ہو کر یہاں آرہے ہیں۔"

"اُس نے آج دوپہر سے قبل ہی جوائن کیا ہے۔" شیش ناگ نے کہا۔ "لیکن مجھے

میں اس بات کا دعویٰ نہیں کروں گا کہ جسے راہی صاحب نے "نیک خصلت" کا نام دیا ہے

وِشوامتر اور وِشسٹ پہلی جماعت سے ایم، اے تک ایک ساتھ پڑھے۔ وِشوامتر فائنل میں اوّل درجے پر رہا اور اننت ناگ کالج میں لیکچرار مقرر ہوا۔ چھٹا پرچہ خراب ہونے کی وجہ سے وِشسٹ اُس سال امتحان میں شامل نہ ہو سکا اور اگلے سال ایم' اے میں دوسرے درجے پر رہا۔ اور وہ بھی سری نگر کے ایک بڑے کالج میں لیکچرار بھرتی ہو گیا۔
وِشوامتر کی اننت ناگ سے بھدرواہ تبدیلی کو اب تین سال ہو چکے تھے۔ بھدرواہ میں اڑھائی سال رہنے کے بعد اُس کا تبادلہ کٹھوعہ ہوا۔ یہاں وہ چار سال تک رہا۔ ملازمت میں آنے کے ساڑھے نو سال بعد اُسے پھر شہر کے اُسی کالج میں بھیج دیا گیا جہاں اس کے دوست وِشسٹ جی پڑھا رہے تھے۔
جس روز اُسے کالج میں حاضر ہونے کی رپورٹ دینا تھی' وہ ٹھیک دس بجے کالج پہنچا۔ اور سیدھا پرنسپل شیش ناگ کے پاس گیا۔ پانچ چھ منٹ اس کے پاس بیٹھا۔ ٹائم ٹیبل وغیرہ دیکھ کر وہ دفتر میں چلا گیا اور ڈیوٹی پر حاضر ہونے کی رپورٹ کی۔ پھر ایک کے بعد ایک، متواتر چار پیریڈ لیے۔
چار جماعتیں پڑھا کر اب وِشوامتر سٹاف رُوم میں کچھ پروفیسروں سے گلے مِلا۔ چند ایک کے ساتھ ہاتھ بھی مِلایا۔ اتنے میں وِشسٹ جی کالج گیٹ پر آ پہنچے اور بائیسکل سے نیچے اُترے۔ چوکیدار نے آگے آ کر سائیکل تھامی۔
"صاحب آئے ہیں؟" وِشسٹ جی نے چوکیدار سے پوچھا۔
"جی صاحب! وہ تو آج پونے دس بجے ہی آ گئے۔"
"سُنا ہے کہ آج یونی ورسٹی میں اُن کی میٹنگ ہے۔" وِشسٹ جی نے اپنے آپ سے کہا اور پرنسپل شیش ناگ کے پاس چلا گیا۔
پرنسپل کے پاس اُس وقت اکاؤنٹنٹ چیک پر دستخط کروا رہا تھا۔ وِشسٹ جی نے پرنسپل کو نمسکار کیا۔

"آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں کس قدر عدیم الفرصت ہوں؟"

"جاؤ نا! دو سو روپے اُن سے مل ہی جائیں گے۔"

"کہا نا۔ مجھے فرصت نہیں۔"

"دیکھو! جاؤ۔ اُس کا باپ سیکرٹری ہے۔ کسی بھی وقت کام آئے گا۔"

"مگر کیسے جاؤں۔ کیا میں نے آج تک یہ کام کیا ہے؟"

وشوامتر جی۔ جانا ہی بہتر رہے گا۔ اُس کی پری رُو ماں اپنے ہاتھوں چائے لے آیا کرے گی۔"

دونوں ہنس پڑے اور پھر وشسٹ جی نے کہا۔ "سُنا ہے کہ بھدرواہ میں ہنگا کا کوئی قصہ رُونما ہوا تھا۔ کیا ماجرا تھا وہ؟"

وشوامتر کی ہنسی ہوا ہوگئی۔ چہرہ لال ہوگیا۔ اُس نے وشسٹ جی سے کہا۔ "قصہ تو کچھ بھی نہ تھا۔ وہ تو وہاں کے پرنسپل آنندر نے میرے خلاف سازش کی تھی۔ اُسے یہ وہم ہوگیا تھا کہ کہیں میں اُس کا عہدہ ہڑپ نہ کرلوں۔"

"بات کیا تھی؟" نچلے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وشسٹ جی نے پوچھ لیا۔

"کچھ نہیں۔ وہ لڑکی ہنگا فائنل میں پڑھتی تھی۔ ایک دن وہ میرے ڈیرے پر آئی۔ اور رو کر کہنے لگی — "میں یتیم لڑکی ہوں۔ کبھی کبھی مجھے گائیڈ کیا کیجیے۔" بس مجھے اُس پر دیا آگئی۔"

"اور ہاں اُن دنوں فیملی بھی آپ کے ساتھ نہیں تھی۔"

وشسٹ جی کی بات سُن کر وشوامتر کا چہرہ اور زیادہ سرخ ہوا۔ آنکھیں خون میں ڈوب گئیں۔ وشسٹ ڈرا۔ اور بات کا رُخ موڑ لیا۔

"ارے بھئی چھوڑو بھی۔ ہم بھی کیا قصہ لے بیٹھے!" "چلیے۔ صاحب کے پاس چلیں!"

"نہیں جناب۔ پہلے میں یہ ریفرنس چیک کرلوں۔"

لگا کہ اُسے کچھ خبط سا ہو گیا ہے۔ صُبح کو درشن دیئے اور پھر ــــــــ"

"خ ــ خبط ــــ ہاں جناب! ایسا ہی لگتا ہے۔ چونکہ میرے پُرانے دوست ہیں،

میں اُن سے بات چیت کرنے جا رہا ہوں۔"

"وِشسٹ جی سٹاف رُوم میں چلے گئے لیکن وِشوامتر جی وہاں نہ تھے۔ اُس نے

چپڑاسی سے پُوچھ لیا ــ "یہ پروفیسر وِشوامتر کہاں چلے گئے؟"

"جناب! کون وِشوامتر؟" چپڑاسی نے دریافت کیا۔

"وہی ــ جنھوں نے آج یہاں جوائن کیا!"

"او ــ جناب، وہ نئے پروفیسر ــــ وہ تو لائبریری میں کچھ پڑھ رہے ہیں ــ" چپڑاسی

نے کہا۔

"لائبریری میں پڑھ رہے ہیں؟" وِشسٹ جی دھیرے دھیرے آپ ہی آپ ہنس پڑے

اور پرنسپل کے پاس پیچھے چلے گئے۔

وِشوامتر کو لگا کہ سیکنڈ ایئر اور تھرڈ ایئر کے طلبا پڑھائی میں بالکل پیچھے رہ گئے ہیں۔

اُس نے طلبا کے لئے زیادہ کلاس لینے شروع کئے۔ اب وہ چھٹے پیریڈ کے بجائے آٹھویں

پیریڈ کو فارغ ہوتا تھا۔ اور بچا کھچا وقت لائبریری میں گزار دیتا تھا۔ ایک دِن وہ

لائبریری میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ وِشسٹ جی آ پہنچے۔

"کیا ہو رہا ہے؟ وِشوامتر جی!"

"کچھ نہیں پنڈت جی! یہ کتاب دیکھ رہا ہوں۔"

"رکھا ہی کیا ہے ان کتابوں میں۔ اب بند بھی کرو! ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

وِشوامتر نے کتاب بند کر دی۔

"وزیر باغ کا ایک لڑکا فائینل میں ہے، جاؤ گے؟" وِشسٹ نے پوچھا۔

نہ دن کو قرار، نہ رات کو آرام۔ چلو۔ اب تو یہ دو چار مہینے باقی ہیں۔ سو چار ماہ کے بعد ریٹائر ہو جاؤں گا۔ تب کہیں یہ بوجھ سر سے اُتر جائے! اور میں دم لے لوں ——"

اسی وقت وِشسٹ جی آ گئے۔ شیش ناگ نے وِشوامتر کی چوتھی کتاب دکھا دی۔

"جناب! میں اس جیسی دس کتابیں مہینے میں لکھ سکتا ہوں۔ لیکن جسے کالج کی بہتری کا کوئی خیال نہ ہو، وہی لائبریری میں بیٹھا رہے گا اور کتابیں لکھے گا۔ ہماری طرح ہر اتوار کو بھی پرچیزنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں حاضر ہونے کے لئے کالج آنا پڑتا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا —— اچھا اس وقت مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے جانا ہے!"

"کیوں خیر تو ہے؟" پرنسپل نے پوچھا

"جی ہاں! خیریت ہی ہے۔ ایک دوست کی بیٹی کا بیاہ ہے۔ اُس کے ہاں جانا ہے۔"

"بیٹھئے نا۔ میں سمجھا۔ کوئی خاص بات ہے۔ ایک گھنٹہ دیر ہوئی تو کیا ہوا۔" پرنسپل نے سگریٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

وِشسٹ جی نے سگریٹ نہیں لیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہا۔" آپ کا کہا سر آنکھوں پر۔ میں گھنٹہ بھر دیر سے ہی جاتا۔ سُنا ہے کہ شاید نارائن جی بھی وہاں آ رہے ہیں!"

"نارائن جی، خود آئیں گے!" پرنسپل شیش ناگ کرسی سے اُچھل پڑا۔

"جی ہاں! یہی سُنا ہے۔" وِشسٹ جی نے کہا۔" سوچتا ہوں، اُن سے چند ایک باتیں کہہ ڈالوں۔"

"جائیے۔ جناب جائیے!" پرنسپل دروازے تک اُس کے ساتھ ہو گیا اور دروازے پر پہنچ کر دھیرے سے کہا —— "اگر کہیں موقع ملا تو نارائن جی سے میرا تذکرہ ضرور کیجیے گا۔ اور کہنا کہ کالج اب بالکل اچھی طرح سے چل رہا ہے۔ ہڑتال یا گڑبڑ وغیرہ

وششٹ جی اکیلے ہی صاحب کے پاس چلے آئے۔ جہاں "مخلوط تعلیم" کے موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔ وششٹ جی بول پڑے ۔ "شکر کیجیے کہ اس کالج میں مخلوط تعلیم کا طریقہ رائج نہیں ہے ورنہ یہاں بھی نہ جانے کونسی قیامتیں رونما ہوتیں!"

شہر کے اس بڑے کالج میں وشوامتر نے سات برس گزارے۔ اس دوران اس کی تین کتابیں اور چھ ریسرچ پیپر چھپ گئے۔ جب ایک پروفیسر نے اس بات کا تذکرہ وششٹ جی سے کیا۔ اس نے کہا ۔ "ارے صاحب! آزاد انسان ہے۔ فرصت ہی فرصت۔ کتابیں نہ لکھے گا تو اور کیا کرے گا؟ میری طرح پریشان ہوتا تو پتہ چل جاتا! پو پھٹتے ہی بائیسکل پر سوار ہو کر نارد جی کے ہاں جانا پڑتا ہے۔ کسی دن نہ گیا تو سمجھو روٹھ گئے۔ سورج ڈھلتے ہی بھاردواج جی کے ہاں، تو کہیں کپل جی کے ہاں۔ اور کبھی یوگی والمیکی جی کے پاس جانا پڑتا ہے۔ جس کسی کے درشنوں کو نہ گیا، وہی ناراض! ویسے انھیں مجھ سے بہت انس ہے اور مجھے بھی ان کے سنگ رہنے میں سکون سا مل جاتا ہے۔ لیکن کتابیں لکھنے کی فرصت بالکل ندارد!

جب پروفیسر وشوامتر کی چوتھی کتاب چھپ کر آگئی۔ وہ ایک کاپی ساتھ لے کر پرنسپل شیش ناگ کے پاس چلا گیا۔ پرنسپل نے مبارک باد دی۔ لیکن جوں ہی وشوامتر وہاں سے لوٹے، وہ اپنے آپ سے سوچنے لگا ۔ "اسے کہتے ہیں کام کرنا اور پیسے بنانا ۔۔۔۔ نہ جانے کتنی رقم ان کتابوں اور مضامین سے کمائی ہوگی؟ مجھے دیکھو، میں پرنسپل ہوں ۔ پرنسپل۔ نام بڑے درشن چھوٹے! بہت بڑا نام، لیکن آمدن کل ملا کر اس کے نصف بھی ہوتی ہوگی۔ اس پر اتنی ساری پریشانی۔ اتنے بڑے کالج کا بوجھ سر پر! اڑھائی ہزار لڑکے کالج میں پڑھتے ہیں۔ اور ایک لڑکا سمجھو، توپ کا ایک ایک گولہ۔

بھگوان جسے سچّی عظمت بخش دے، اُسے کس طرح خبط یا کسی کا بیر رہے گا۔
وِشِسٹ جی اُس وقت سب کی نِگاہوں کا مرکز بن چکے تھے۔ لیکن اُن کے دُشمن
اپنے دوست وِشوامتر کو تلاش کر رہے تھے ؂

—————— کشمیری سے ترجمہ: محمد یوسف ٹینگ

کی بات تو اب ہے ہی نہیں ۔"

"جناب! میں اُن سے سب کچھ کہوں گا۔ کیا مجھے بھی سکھانے کی ضرورت ہے؟"

وِششٹ جی بائیسکل پر سوار ہوا۔ اور چل دیا۔

وِشوامتر سے کسی نے کہا کہ چار ماہ بعد شیش ناگ ریٹائر ہو رہے ہیں۔ اور کالج میں وہی ایک سینیئر پروفیسر ہے۔ کیوں نہ وہ بھی پرنسپل کے عہدے کے لئے کوشش کرے!

وِشوامتر کو یہ مشورہ اچھا لگا۔ اُس نے درخواست لکھ ڈالی اور اس میں اپنی تمام ڈگریوں، تصانیف اور اُن پر کیے گئے تبصروں کا ذکر کیا۔ ساتھ ہی اُن انعامات اور اکرامات کا بھی تذکرہ کیا جو اُسے اب تک ملے تھے۔

سٹاف رُوم میں جب یہ بات ایک پروفیسر نے وِششٹ جی سے کہی، وہ ہنس پڑا۔ دوسرے دن صبح سویرے سائیکل پکڑ لی اور نارد جی کے پاس پہنچ گیا۔ بائیسکل وہیں چھوڑ کر نارد جی کے ہمراہ ٹیکسی میں بیٹھ کر بھاردواج جی کے ہاں پہنچے۔ بھاردواج کے ہاں اس وقت کپل جی اور یوگی بھی براجمان تھے۔ وہ نارد جی اور وِششٹ جی کی آمد کا مقصد بھانپ گئے چند لمحے ست سنگ کرکے پانچوں اُٹھے اور بھاردواج کی کار میں سوار ہو کر نارائن جی کے پاس پہنچ گئے۔

ریٹائر ہونے سے دو دن قبل شیش ناگ کو نارائن جی کا یہ حکم نامہ ملا کہ وہ اپنا چارج وِششٹ جی کے سپرد کر دیں۔ آرڈر پڑھ کر شیش ناگ نے وِششٹ جی کو گلے لگایا اور کہا:

"واقعی آپ ہی میرا چارج سنبھالنے کے قابل ہیں۔ میرے بعد آپ ہی اس دھرتی سے بھی بھاری اس کالج کے بوجھ کو اُٹھا سکتے ہیں۔"

جو پروفیسر وہاں موجود تھے، اُنھوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور جو وِششٹ جی کے زیادہ ہی خیرخواہ تھے، اُنھوں نے پھول برسائے۔

ہوئی دہکتی آنکھیں —— یہ میرا ہم عُمر بن بُلائے مہمان کی طرح منہ صبح میرے مطالعہ کے کمرے میں آنکلا تھا —— میری کتابوں، کاپیوں، افسانوں اور ناولوں سے چن چن کر ورق پھاڑ رہا تھا۔ اور مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک تلخ مسکراہٹ بکھیرتا ہُوا سامنے کے دروازے سے باہر چلا گیا۔ نہ دُعا نہ سلام —— میں بُت بنا اُسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا ہی رہا —— اُس کی جانب ایک نظر اور دوسری اپنے بالمقابل قد نما آئینے کی طرف —— ایک نگاہ اُس پر، اور دوسری آئینے میں سے جھانکتی ہوئی پرچھائیں پر —— دوسری نظر اُس پر، اور پھر دوسری نظر آئینے کے عکس پر —— "بالکل مجھ جیسا، یہی شبیہہ، یہی خد وخال، یہی ناک، یہی بھنویں ....."

میں ششدر ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالتا اور دوسری آئینے پر۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں اپنے چہرے کو بھی ٹٹول رہا تھا۔ نمایاں ناک کو دباتا ہوا، دھنسی ہوئی آنکھوں پر اُنگلیاں پھیرتا ہوا، ماتھے کی شکنیں گنتا ہوا، پلکوں کو ٹٹولتا ہُوا —— یہی ناک نقشہ، آنکھوں کے گرد یہی ڈورے، ماتھے پر یہی جھریاں۔ ہاں یہی قد و قامت، اسی طرح لحیم و شحیم —— بالکل میری تصویر —— اور یہ میرا ہم شکل میری طرف دہشت بھری نظریں ڈالتا ہوا بتدریج پیچھے لوٹتا گیا —— میں اپنے خیالات کے تانے بانے میں اُلجھا ہوا ایک ایک کر کے اپنے تین بھائیوں کی شکلوں کا جائزہ لیتا رہا۔ ان میں سے ایک بھی میرے قد، میری شباہت اور میرے ناک نقشے کا نہیں —— !

"تم کون ہو —— ؟" میں بے اختیار ہو کر پکار اُٹھا۔ اُس نے ایک طویل قہقہہ بلند کیا —— "تم کون ہو؟ تم کہاں رہتے ہو —— ؟"

"کب ملو گے اور کہاں ملو گے؟ ——" میں اس بھاگتے ہوئے ہم شکل سے سینکڑوں بار استدعا کر رہا تھا۔ لیکن وہ ایک ایک قدم پیچھے لوٹ رہا تھا۔ میں اُٹھنے ہی والا تھا

ظلمات کے مسافر

غلام نبی گوہر

سال ہا سال اس سفر میں گنوائے — جس کے ہر موڑ پر نت نئے وسوسے اور گمان — ہر قدم پر گہرے غار اور گڑھے — ہر نقشِ پا پہ زہریلے سانپوں کے مسکن کی دھرتی، جس کا نہ کہیں آغاز ہے نہ کہیں انت — اگر کچھ ہے تو بس یہی ایک خلا — خلا کی انھیں بے کراں وسعتوں سے تو اُس نے مجھے متعارف کرایا تھا۔ بالکل یہی بے برگ و ثمر دُنیا، جس پر ایک دہشت ناک سنّاٹے کی دبیز چادر مسلّط ہے اور جس میں حدِ نظر تک گہری کھائیاں نگاہ کی مرکز ہیں — پتھر، اور قبریں — کچھ ٹوٹی پھوٹی اور کچھ نیچے دھنسی ہوئی کچھ پُرانی اور کچھ تازہ —

برسوں گزر گئے جب وہ میری شکل و صورت کا، بالکل مجھ جیسا، میری ہی طرح پستہ قد اور لحیم و شحیم — گوری رنگت کی طرف مائل — جھڑے ہوئے بال، اندر کو دھنسی

اُف اس تلاش میں مجھے جن دِقتوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا، اُنھیں افسانوں کے مجموعوں میں بھلا کیسے پیش کیا جا سکتا ہے؟ اگر میں اس چوٹی سے اُترا تو میں، ان مُشکلات کو ناولوں اور داستانوں کے ذریعہ واضح کرتا۔

لیکن ..... لیکن میں کہہ رہا تھا، میں جیسے تیسے اُس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا جسے اُس دِن ــــ آج سے ہزاروں سال پہلے ــــ میرے اُس ہم شکل نے مجھے سارے حساب چکانے کے لئے کاغذی نشان دہی کراتے کراتے دِکھائی تھی ــــ یہی تو ہے وہ جگہ ــــ یہ میرے پہلو کے نقشے، میری دیوار پر کی کاغذی کائنات پر یہ جگہ اُس طرف واقع ہے ــــ ٹھیک شہادت کی اُنگلی کی سیدھ میں ــــ وہ تو آج بھی میری نظروں میں سمایا ہوا ہے۔ لو وہ میرا ہم شکل میرے مطالعے کے کمرے کے دروازے پر دیوار سے لٹکا ہوا ہے ــــ نقشے کی جانب اشارہ کر رہا ہے ــــ

وہی مٹّی کے تودے، وہی پرانی ٹوٹی پھوٹی بوسیدہ اور منہدم قبریں ــــ ہر قبر پر انسانی ڈھانچوں کے سائن بورڈ ــــ مگر یہ کیا، میں تو ان میں سے کسی ایک عبارت کو بھی پڑھ نہیں سکتا ــــ!! نہ کشمیری، نہ فارسی، نہ ہندی، نہ سنسکرت، نہ انگریزی اور نہ فرانسیسی ــــ میں ہر قبر پر جا کر جستجو کرتا ہوں۔ لیکن انسانی گوشت کی کہیں بُو تک نہیں ــــ! ہڈیوں کے ان ڈھانچوں میں بدبُو تک بھی نہیں ــــ چوٹی کے گھسے ہوئے سرے پر وہ قبر غالباً دھنس گئی ہے اور قبر پر

نہ جانے کب، کا نصب شُدہ انسانی ڈھانچہ ــــ ڈھانچے کی پسلیوں پر غالباً کشمیری میں لکھا ہوا ــــ "اگر میرے ساتھ حساب چکانا ہے تو نیچے اُتر جاؤ ــــ!" میں نے جبراً و قہراً یہ ڈھانچہ اُوپر اُٹھایا لیکن یہ جیسے قبر کی گھاس پر ساکت ہو گیا۔ میں نے ڈھانچے کو دوسری جانب گھما دیا ــــ

میرے پیروں تلے دھرتی چیخنے چلّانے لگی۔

کہ اُس کے پیچھے بھاگ کر اُس کا دامن یا گریبان پکڑ سکوں۔ مگر ڈور میٹ میرے پیروں سے تارکول کی طرح چمٹ گیا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود بھی جب میرے پاؤں حرکت نہ کر سکے تو اُس نے ایک بار پھر حقارت بھری نظروں سے مجھے گھور کر قہقہہ بلند کیا ——— اور تیزی سے باہر نکلنے لگا۔ باہر نکلتے نکلتے وہ اپنے آپ کے ساتھ بڑبڑانے لگا ——— "میرے ساتھ اگر حساب چکانا ہے۔ تو میں اُس پہاڑ کی چوٹی پر ملوں گا۔ اُن دھنسی ہوئی قبروں کے بیچ میں ——— اُس پرانی اور بوسیدہ قبر میں ——— !" یہ اپنی دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کے ساتھ میرے عقب میں دیوار پر لٹکا ہوا نقشے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ جو سامنے لٹکا ہوا تھا ——— میں نے مڑ کر دیوار پر لٹکے ہوئے نقشے کو دیکھا جس پر صرف پہاڑوں کے نشان ——— پربتوں کی چوٹیوں کے عکس ——— ندی نالوں کے بل کھائے ہوئے پُر پیچ موڑ ——— کاغذی کائنات کے ان بیابانوں میں میری ساکت نگاہیں منجمد ہو کر رہ گئی تھیں ——— اسی پلک جھپکنے میں میرا یہ ہم شکل مکان سے باہر نکل گیا تھا۔ آنگن کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے شیشے سے میں نے دیکھا کہ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا جا رہا ہے جیسے صحن کے قطعہ اراضی کو اپنے لمبے لمبے قدموں سے ناپ رہا ہو ——— میں بے ساختہ چلایا تھا ——— میں نے کہا سنو! تمھارا نام کیا ہے ——— ؟"

"تم ——— ؟"

اُس نے صحن کا صدر دروازہ بند کرتے ہوئے نکلتے وقت نہایت اعتماد سے ہانک لگائی تھی۔ تب سے میں اس نقشے کی مانند اپنی دیوار کا نقشہ اپنے پہلو میں لئے اپنے اُس ابدی ساتھی کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں ——— مرغزاروں ——— صحرا صحرا ——— دریا دریا اُسے میں نے ڈھونڈا ——— کھیتوں ——— کھلیانوں ——— شاداب وادیوں ——— اُجاڑ ویرانوں میں اُسے کھوجتے کھوجتے میرے پاؤں لہو لہان ہو گئے۔

شخص کی طرح ایک۔ میمنے کی مانند ہر جائز و ناجائز سزا بھگتنے کو تیار۔ اسی نے میری دونوں آنکھیں کھرچ کے باہر نکال دیں۔ میرے پپوٹوں سے خون کے فوارے پھوٹنے لگے۔ تھرتھراتے ہاتھوں سے میں اُس کے چہرے کے گرد ہاتھ پھیر رہا ہوں۔ میں نے بغور محسوس کیا۔ ـــــ احساس کی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اپنی ہی خالی آنکھوں کے نیچے میری دو آنکھیں لگا کر کہیں جانے کے لئے پر تولنے لگا ـــــ مگر کس طرف ـــ؟ یہ میں دیکھتا، لیکن کن آنکھوں سے ـــ؟

ـــــــــــــــ کشمیری سے ترجمہ: نعیم اختر اندرابی

جیسے کولھو کا بیل دھرتی کے نیچے آکر مستی میں ناچنے لگا ہو۔ اس ہنگامے میں قبر پر کا
ہزاروں خروار ملبہ گرد و غبار کی صورت میں اُڑ گیا اور قبر کے اندر سے سفید کفن نمودار
ہوگیا ـــــ یہ کفن میرے نیچے ہزاروں گز ہے اور میں اس سفید سفید کفن کے نیچے
آتا جا رہا ہوں ـــــ جتنا نیچے میں اتر آیا، اتنا ہی یہ کفن مجھ سے دُور بھاگا جا رہا
ہے۔ جیسے تیسے میں نے کفن کو جا لیا اور دہشت زدہ ہاتھوں سے اس کا گریباں چاک
کیا ـــــ! اُجاڑ اور سُنسان فضا کفن کی چاک کی آواز سے گونج اُٹھی ـــــ
کفن کے دو ٹکڑے کر کے میرے ہاتھ ایک بار پھر ساکت ہوگئے ـــــ یہی گورا گورا
دُودھیا بدن، گورے سینے پر یہی نرم نرم، کالے کالے بال ـــــ چھوٹی موٹی دُودھیا
رانیں، یہی، نمایاں ناک، یہی بھوری بھوری مونچھیں، بے ترتیب بھنویں، بھوری پلکیں،
اور پلکوں کی چھاؤں میں بند آنکھیں ـــــ میں نے اپنے اس ہم شکل کے دونوں
پپوٹے آہستہ آہستہ اوپر اُٹھانے چاہے لیکن کسی نے جیسے کرید کر آنکھوں کی پتلیاں
باہر نکال دی تھیں ـــــ اب وہاں صرف دو خالی گڑھے رہ گئے تھے ـــــ
اس ہم شکل لاش میں حرکت سی پیدا ہونے لگی اور میرا ہم شکل اُٹھ کھڑا ہوا ـــــ
مادر زاد ننگا! اُس کے مفلوج ہاتھوں میں جُنبش پیدا ہوئی ـــــ وہ اپنے
دونوں اکڑے ہوئے منجمد ہاتھوں سے میرے چہرے کو ٹٹولنے لگا ـــــ وہ اپنی نرم و
ملائم اُنگلیاں گھما گھما کر میری آنکھوں کو ٹٹول رہا تھا ـــــ جیسے اُسے کوئی کھویا
ہوا خزانہ مل گیا ہو ـــــ! ہم شکل لاش اپنی بے کراں مسرت کا اظہار کرنے
لگی۔ اسی شادمانی میں اُس نے اپنا دایاں ہاتھ برق رفتاری سے تار تار کفن کے
سرہانے مٹی کے ایک بڑے تودے کی طرف بڑھایا۔
دوسرے ہی لمحے اُس کے ہاتھ میں ایک زنگ آلودہ خنجر لہرا رہا تھا ـــــ
وہ میری دو پتلیوں کو کھرچنے لگا۔ میں دہشت زدہ تھا ـــــ کسی مفلوج ـــــ

بھول جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ تہوار ہو یا کوئی اور دِن ــــ صبح سویرے ہمارے گھر آ جاتا ہے۔ مگر دیکھ ری ــــ کسی نے گھر گرہستی بھی چھوڑی ہے کیا ــــ تو ہی سوچ۔ ــــ پورے تیرہ دِن گھر کی اور دیکھا بھی نہیں اس نے۔ نہ دفتر کا ہوش، نہ گھر اور بال بچّوں کی خبر ــــ سب کچھ بھول بھلا کے اس وقت تک ہمارے گھر جما رہا۔ جب تک شادی بخوبی انجام پائی۔ لڑکی کی شادی جو تھی نہ۔ ہم نے بھی سارا اسی پر چھوڑ دیا تھا۔ ــــ رسوئیوں کو برتن، مسالا وغیرہ دینا ہوتا ــــ تو دوارکا ناتھ سے لو۔ پنڈت نے کمہاروں سے ڈھوبریاں لانے کو نہیں کہا ہے۔ اس وقت کہاں ملیں گی اور دیگیں وغیرہ چاہئیں رسوئیوں کو ــــ دوارکا ناتھ جانے اور اس کا کام ــــ! میرے ہاتھ تہوار والی دھوتی نہیں آ رہی ــــ دوارکا ناتھ سے کُنجی لو...... سبھی ٹرنکوں کی کُنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ دعوت میں سالن، سبزی یا بھجی پہنچنے میں ذرا دیر کیا ہوئی کہ دوارکا ناتھ نے جھٹ معذرت کی۔ لڑکے والے ناراض ہو گئے ــــ دوارکا ناتھ معاملہ سلجھانے آ گئے۔

اسی دوران رُخصتی بھی تو تھی۔ دلہن کو رُخصت کیا۔ سبھی تھکے ہارے بے خبر سو رہے تھے۔ دو[2] بجے ہوں گے۔ میں یار چلی آئی کہ ایک نظر سب کچھ دیکھ آؤں۔ پار والوں کا کمرہ بھی تو ہمارے ہی قبضے میں تھا اور یہاں بستر وغیرہ رکھا تھا ــــ کیا دیکھتی ہوں، دوارکا ناتھ بے سُدھ۔ ننگ دھڑنگ پڑا ہے۔ وہ آلتی پالتی مارے کپڑوں سمیت سو گیا تھا۔ میری آنکھیں اس بات پر ڈبڈبا گئیں کہ اس بچارے کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ سبھی مزے سے لحاف اُوڑھے خرّاٹے بھر رہے ہوں گے اور یہاں اس بچارے کا یہ بُرا حال ہے۔

نہیں بہن، میں تو یہ برداشت نہ کر سکی۔ تُو تو جانتی ہے کہ میرا دل پرائے کے دُکھ درد سے بھی کباب ہو جاتا ہے۔ میں نے اس پر لحاف ڈال دیا اور اسے بچّے کی طرح اپنی آغوش میں بھر لیا۔ اری ہاں ــــ اتنا مورکھ سمجھتی ہے تو مجھے؟ بجلی تو

ہنومان مندر

رتن لال شانت

"یہی تو بیماری ہے تجھے۔ یہاں پہنچتے ہی تیرے قدم سُست پڑ جاتے ہیں۔ صرف ایک ہی بات یاد رکھی ہے تُو نے ——— دیر ہو گئی، دیر ہو گئی۔ کبھی تو وقت پر آتی۔ چل، اب دوسری گلی سے چلی جانا۔ کیا ہوا اگر آج دو چار قدم زیادہ ہی چلی تو — سُن، پھر افسوس ہو گا نا... ... ارے رہنے بھی دے نا! تُو کون سا چودھویں کا چاند ہے کہ دُولھے میاں اپنی نظریں فرشِ راہ کیے تیرے ہی انتظار میں ہوں گے۔ یہ بھی تو پتہ نہیں کہ دفتر سے لوٹے بھی ہوں گے یا نہیں — پھر ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ارے کس غم میں گھلی جا رہی ہے تُو؟ ——— نیچے ہیں تو کیا ہُوا؟ تجھے اپنی زندگی انھیں پر وار دینی ہے کیا؟

یہ حال ہے دوارکا ناتھ کی ہمدردی کا۔ اس "پرائے" کے رویے نے مجھے اپنوں کو

اگر بتی دے دے ڈھونڈ کے ـــــ پھر میں دُھوپ، اگر بتی ڈھونڈ کر لا دیتی ہوں اور وہ جلاتے ہیں ـــــ تجھے تو ہنسی آ رہی ہے ... ... اگر میں ڈھونڈ کر نہ دوں، ان کے ہاتھ کہاں آئے گی ـــــ! اس گھُپ اندھیرے میں بالکونی پر پڑی لکڑیوں پر جو بھی ہاتھ لگے سو غنیمت۔ ایک پھٹا پُرانا بوریا بچھانے کو رکھا ہے، وہ بچھاتے ہیں اور دھوپ سُلگتے رہتے ہیں ـــــ ہاں، تو ہنستی چلـ ـــ میں تو دِل جلی ہوں۔ کون مرد کہے اِسے، وہ تو مٹی کا مادھو ہے۔ مجھ پر تو کچھ اثر ہی نہیں ہوتا ـــــ میرا سینہ پتھر ہو گیا ہے۔

وہاں کہاں جا رہی ہے تُو ـــ؟ اس گلی کو جا کے پھر آگے دائیں کو چلی جانا ـــ نہ جانے کتنی بار یہاں سے گزری ہوگی! میں ہی نادان ہوں۔ ارے اس طرف کہاں جا رہی ہے ـــ میری باتیں تیرے دِل کو لگتی ہوں گی ـــــ دیکھ تُو تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ تجھ سے کب کوئی بات چھپائی ہے میں نے ـــــ ہاں، زبان کو مُنہ میں ہی رکھنا، کسی سے کہنا نہیں۔

پربت ـــ؟ ناری اس دن پربت نہیں جاتا ـــ تو پھر ـــ مجھ سے تو کبھی بھی کچھ نہیں کہا۔ میں تو اس سے چوری چھپے ہنومان مندر آتی ہوں۔ اگر کسی شام موقعہ ملا تو ـــ بھگوان بھلا کرے دوار کا ناتھ کا۔ اُن دِنوں بدلی پر خود لداخ گیا ہوا تھا۔ دیکھ ری ـــــ ہماری شادی کو ابھی تین ہی سال ہوئے تھے۔ پہلے ہی برس بھائی اس سے لڑ جھگڑ کر الگ ہو گئے۔ اُسی کا بھلا ہو ـــــ جب اُس نے دیکھا کہ ہم بپتا میں ہیں، حصہ سب سے کم مِلا ہے اور اُن لوگوں کی آنکھوں کا پانی مر گیا ہے ـــــ یہ نہیں سوچا کہ سبھی بھائیوں میں یہ غریب ہے۔ اس کی مدد کی جائے ـــــ اس پر طرہ یہ کہ اس کی بدلی لداخ ہو گئی ہے۔ اُن دِنوں ہمیں یا تو بھگوان کا آسرا تھا یا پھر دوار کا ناتھ کا ـــــ میری دو لڑکیاں تھیں، بہت اُداس

پہلے ہی بند کردی میں نے ... ...

ہونہہ ـــــ تو تو کچھ زیادہ ہی ڈرپوک ہے۔ یہاں کون سُن رہا ہے ـــــ؟ تجھے تو سُسرال والوں نے کچھ زیادہ ہی دبا کے رکھا ہے ... ... تونے دوار کا نام کی یاد دلادی نا ـــــ اسی لئے کہہ دیا، نہیں تو کیا میں ایسی ہوں۔ میں تجھ پر واری ـــــ زبان کو منہ میں ہی رکھنا ـــــ کسی سے کہنا نہیں۔

جوں جوں عمر بڑھتی ہے زنجیریں بھی بڑھتی جاتی ہیں ـــــ چار چار جوان بچے ہیں میرے بھی ـــــ اُف بھی نہیں کرپاتی۔ اس ایک چھوٹے سے کمرے کا کیا ہوگا ـــــ ایک طرف ہم سو جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ چارپائی پر ـــــ اب تو ہی بتا ـــــ اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی بالکونی اور ٹھاکر دوار ہے۔ بالکونی پر لکڑیاں، اپلے وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ ٹھاکر دوار کو پرنام ـــــ اور رسوئی کو تو چھوٹا تو نہیں کیا جاسکتا نا ـــــ اب بتا، جگر کباب نہ ہوگا کیا ـــــ؟ مگر میں کر بھی کیا سکتی ہوں!

دیکھ تو پھر پریشان ہوگئی۔ نہیں ری۔ کیا بچّوں کو بھی ہاتھ پیر پھیلانے نہ دے گی ـــــ خود بھی تو کچھ کام کاج کرنے دے انھیں۔ پھر کب سیکھیں گے یہ؟ کیا ہوا اگر تھوڑی بہت دیر ہو بھی گئی تو ـــــ روز ہی تو وقت پر پہنچ جاتی ہے تو ـــــ کہا نا کہ اسے دیکھ کر جگر کباب ہوا جاتا ہے لیکن کیا کیا جائے۔ اگر آدمی خود کوشش نہ کرے تو کچھ بھی نہیں ہوتا ـــــ اری مرد تو وہی ہے جو کوشش کرے۔ ہاتھ پیر مارے ـــــ سوچ سمجھ کر کوئی ترکیب نکالے، نہیں تو وہ کسی گنتی ہی میں نہیں ـــــ

اری ہنستی کاہے کو ہے ـــــ؟ میری باتیں بھلی لگتی ہیں تجھے ـــــ؟ میں جانتی ہوں!

اُن کی نیند بس چار بجے ٹوٹتی ہے۔ عادت جو ہوگئی ہے۔ بڑی دیر سے اُن کا یہ معمول رہا ہے۔ ایک دو دن ناغہ کرکے مجھے جگا دیتے ہیں ـــــ اُٹھ، آگ سُلگا ـــــ نند، آج ٹھاکر دوار میں بچار ابھی نہیں پھیرا ہے ـــــ اُٹھ، دھوپ،

بہت زیادہ پسند تھا۔ تُونے بھی تو بچپن میں کبھی یہ کھیل کھیلا ہو گا۔ گڈے لڑکیاں ہی بنتی تھیں یا لڑکے بھی سنگ ہوتے تھے تمھارے۔۔۔؟ ہمارے ہاں تو خوب جوڑے ہوتے تھے۔

مجھے خود پتہ نہیں کہ کیوں پسند تھا ___ ؟ میں ٹوٹھ کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس جایا کرتی تھی ___ ڈاکٹر میرا بھائی بنتا تھا۔ اُس سے کہتی کہ میرے پیڑا ہوتی ہے۔ ٹوٹھ بھی یہی کہتا تھا۔ وہ ہماری نبض پر اُنگلی رکھ کر کہتا کہ جاؤ شادی کر لو ___ پیڑا جاتی رہے گی۔۔۔ ۔۔۔ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے بالکونی کی اور چلے جاتے۔

"جاموں سے باہر ہوئی جا رہی ہے تُو ___ یہ ہنسنے کی بات نہیں۔ تیری بات نے بچپن کی یاد دِلا دی۔ ہم نے تو جوانی وار دی اپنی ___ اس سے کیا ہُوا، دِل جلتا ہے نا آخر۔۔۔

بالکونی تو سُسرال میں بھی ہے۔۔۔

جب شب کی سیاہی دُور ہونے لگتی ہے اور نیلا آسمان دِکھائی دینے لگتا ہے، پرندوں کی چہچہاہٹ بوریے کے تکیے پر لگے کانوں میں آتی ہے ___ دِل یک لخت، بیٹھ سا جاتا ہے۔ نہ جانے خیالوں کے کِن صحراؤں میں کھوئی ہوتی ہوں۔ وہ نہ جانے کب کے جاگ چکے ہوتے ہیں اور زور زور سے رام نام جپتے رہتے ہیں، تا کہ بچے کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں ___ اور میری نیند ٹوٹتی ہے۔ کروٹ لے کر اُٹھتی ہوں۔ اپلوں سے بھری بوریاں پھر اپنی جگہ رکھ دیتی ہوں ___ سر بھاری ہوتا ہے، چکراتے چکراتے نیچے آجاتی ہوں اور سر دبانی کی دھار سے تن کی اگنی ٹھنڈی کر لیتی ہوں۔۔۔ ۔۔۔ اُن کی پُوجا کے بول کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح دِن بھر تیرتے رہتے ہیں، تیرتے ہی چلے جاتے ہیں۔۔۔ بستر میں لیٹے بچے سانپوں کی طرح کُنڈلی مارے اور پھن پھیلائے، لگتے ہیں ___

نا یاد دِلا مجھے ___ رہنے بھی دے۔ مندر والا کوئی بھجن گا۔ میں بھی ساتھ گُنگناتی

ہوا کرتی تھی۔ تو یہی ڈھارس بندھاتا تھا — دیکھ نا اگر خود لداخ چلا گیا تھا تو کیا مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا —؟ ڈر گیا ماں باپ سے — اُن سے الگ ہو کر بھی — یہی باتیں جب یاد آتی ہیں تو تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ گھر دوار کا ناتھ کے سپرد کر دیا اور یہ بات واضح بھی کر دی۔ انھیں دِنوں اس نے مجھے بھگوان کے نام سے آشنا کیا۔ خود ہنومان جی کا بھگت ہے۔ بیوی بچوں، سبھی کو اسی راستے پہ لے آیا ہے۔ پہلی بیوی سے کوئی بچہ نہیں ہوا۔ اور وہ بچاری اسی غم میں پرلوک سدھار گئی۔ دوسری شادی کی لیکن ہنومان بھگتی کی جوت جلائے رہا۔

میرا بیڑا بھی ہنومان جی ہی پار لگا دیں گے — نہیں تو ہی بتا نا، اب تو تجھے بھی وہاں جاتے دو مہینے ہو گئے۔ ملتی ہے نا شانتی وہاں —؟ پنجابیوں کے مندروں کی تو بات ہی اور ہے — نہ پانی اُتارنا، نہ دیواروں پر ٹیکے لگانا اور نہ پھول چڑھانا — چاروں طرف سنگِ مرمر بچھا ہے۔ دِل خوش ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو میں دریا والے حصے میں بیٹھتی ہوں۔ دوار کا ناتھ برسوں سے وہیں بیٹھتا آیا ہے۔ اس کی یہاں بڑی عزت کی جاتی ہے۔ تو دیکھتی ہے نا — سبھی پنجابی بھجن اسے یاد ہیں۔ میں ہی مورکھ ہوں — "اوم جگدیش ہرے" کے سوا عمر بھر ایک شبد بھی یاد نہ کر پائی۔ اگر ہوا تو اسی کی بھگتی سے میرا بیڑا بھی پار ہو جائے گا —

تجھے پھر ہنسی آ رہی ہے۔ تو نے کہاں تک پڑھا ہے؟ کیوں نہیں پڑھا؟ یہ بات تو ہے کہ تیری یادداشت خوب ہے۔ میں تو مورکھ کی مورکھ ہی رہی۔ میں نے تو گڑا گڈی کا کھیل کھیل کر اپنا بچپن بتایا ہے۔ ہمارے مکان کی اُوپر والی منزل کا کمرہ بہت بڑا، بہت کشادہ تھا اور ہم بھی وہاں خوب اُودھم مچاتے رہتے تھے۔ صبح بھی وہیں اور شام بھی — سارے محلے کے لڑکے اور لڑکیاں اکٹھی رہتیں۔

"کیا جلدی ہے تجھے؟ سن، پھر میں بھول جاؤں گی۔ گڑے گڈی کا کھیل مجھے

موٹروں میں ہی جاتے ہیں۔ رتن دیپ تو یہاں جلاتے نہیں، دُودھ یہاں چڑھاتے نہیں۔
یہاں صرف پُجاری کو دکھشنا دینی ہوتی ہے۔ اس کے لئے کچھ پیسے دے دیا کرو۔ وہ کہاں دیئے ؟ بس ہنگامہ برپا کر دیا۔ مجھے دینے کو اس کے پاس کبھی بھی کچھ نہ تھا۔
کیوں نہ کہوں ؟ دل جو جلا ہے میرا۔ اگر یہاں بھی یہی پجاری دوار کا ناتھ نہ ہوتا تو بھری سبھا میں شرمندہ ہونا پڑتا۔ میرے ساتھ گھر آیا۔ وہاں خوب برسا اس پر۔ کہا، تجھے خبر نہیں کہ تیری پتنی ایک انمول رتن ہے — تو اس کی قدر و قیمت نہیں جانتا —
میرا رُواں رُواں جھوم اٹھا۔ تب سے کبھی بھی میں اس سے ایک دھیلا بھی نہیں مانگتی، اُسے تو لت پڑ گئی ہے۔ پربت جاتا ہے۔ وہاں بھی ایک پیسہ نہیں خرچ کرتا۔ اِدھر سے بھی ننگے پیر، اور وہاں سے بھی ننگے پاؤں آجاتا ہے۔ جوتے پھٹ جائیں گے نا — !
کوٹ کو اب تیرہ ۱۳ سال ہو جائیں گے۔ وہی شادی کے کپڑے چلا رہا ہے۔ گھر آیا، کوٹ کیل پر ٹانک دیا اور "لوچھ" پہن لیا۔ صبح کو "لوچھ" نکالا، کوٹ پہن لیا۔ بچوں کے موزے پھٹ جاتے ہیں۔ وہ تلوے ٹھیک کر کے اور ٹانکے لگا کے پھر اتنی دیر چلا لیتا ہے۔
میں تو ایسا نہیں کر سکتی نا۔ میرا تو اچھے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ یہی مندر آنا — اُسی دن دوار کا ناتھ نے یہ دھوتی لے دی تھی مجھے۔ مندر آتے ہوئے یہی پہن لیتی ہوں۔ ... ... جب بڑا ٹیکہ لگاتی ہوں تو دوار کا ناتھ میرے چہرے سے اپنی نظریں ہی نہیں ہٹاتا۔ کہتا ہے، یہ پنجابنیں تجھ پر وار دوں ——————
تو ہی بتا، کیوں نہ اس پر واری جاؤں ؟ "
"اری ٹھہر نا اب۔ چل میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔ تو اتنی چھوٹی بھی تو نہیں کہ کوئی اُٹھا کر لے جائے تجھے۔ تیرے بال بھی تو میری طرح پکنے لگے ہیں ... ... اری میں کیوں، بال کیوں نہیں رنگ لیتی — ؟ اب تو کہے گی — مجھ سے کس نے کہا — ؟
میری ایک سہیلی تھی بچپن کی —— جواہرہ —— وہ بھی ہمارے ہی محلے میں رہتے تھے۔ پھر وہاں سے راج باغ چلے گئے۔ اب مزے میں ہیں۔ اتنی دولت تجھے بھی مل

رہوں گی۔ لَے تو میں بھی سیکھ گئی ہوں۔ سارا تو یاد نہیں۔ ہاں اتنے سے ہی من کو خوشی

اور شانتی سی مِل جاتی ہے......

..... "نہ پونچھ میرے آنسو۔ انھیں بہنے دے، خود ہی سُوکھ جائیں گے۔"

تیرے گلے میں تو سرسوتی ہے۔ سارے بھجن اور لیلائیں یاد ہیں تجھے۔ یہاں بھی

پنجابیوں کے ساتھ ساتھ گاتی جا رہی ہے۔ ان میں شردھا ہے۔ کِس بھاوَنا سے آرتی

اُتارتی ہیں۔ اسی لئے تو بھگوان انھیں دیتے بھی ہیں۔ ہم نردھن تو کم ظرف ہیں!

میں تو یہاں کا حال دیکھ کر حیران ہو جاتی ہوں۔ یہ ہماری طرح پھٹے پُرانے کپڑے

اور چیتھڑے پہنے تھوڑے ہی مندر جاتے ہیں۔ بھگوان کو بھی گندگی ناپسند ہے۔ دیکھ

تو کِس طرح سج دھج کر آیا کرتی ہیں یہاں۔ کیا کپڑے پہنے اور زیورات سے لدی ہیں،

کیا چمک ہے! چہروں سے تو جیسے شنگرف ٹپکتا ہے ان کے۔ تُو یہ تو نہیں سمجھ

بیٹھی ہے کہ یہ خوب صورت ہیں۔ وہ تو تیری میری جُوتی بھی نہیں ہیں۔ دوارکا ناتھ

نے ایک دِن مجھ سے کہا ہے کہ ہم کشمیری عورتیں دُنیا میں سب سے خوب صورت ہیں،

ہاں، یہ بات ہے کہ یہ تنومند ہیں ـــــــــ مکھن جیسے بچّے اور دُودھ جیسے پتی

ساتھ ہوتے ہیں ان کے ـــــــ!

"چل اب واپس چلیں ـــ اب تُو اس سڑک سے جا۔ شام ہو گئی۔ گلی میں گِر پڑے گی

کہیں یا کہے تو میں ساتھ چلتی ہوں ـــ اری نہیں۔ مجھے دیر نہیں ہوئی۔ اسے تو ان

باتوں کا غم ہی نہیں۔ وہ تو ہمسایوں کے ہاں بیٹھا حُقّہ گُڑگُڑا رہا ہوگا۔ یہ حُقّہ تو میری

جوانی کھا گیا۔ دیکھ تو ـــــ کیا نحوست ٹپکتی ہے۔ اسّی سال کا بُوڑھا دِکھتا ہے،

..... اپنے ساتھ مجھے بھی بُوڑھا بنا دیا۔

پائی پائی کا حساب لیتا ہے مجھ سے۔ کیا کہوں، کہنے کی تو بات نہیں ـــ میں نے کہا

تھا کہ ہنومان مندر جاتی ہوں۔ یہ ایسا ویسا کوئی مندر تھوڑے ہی ہے۔ کھیر بارہ یا ملہ یار ہوتا

تو کوئی بات نہ تھی۔ یہاں تو بڑے بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ موٹروں میں آتے ہیں۔ اور

کھٹی تلاؤ

تاج بیگم رنیزو

"اے نبا! ذرا اسے چکھ لو" رحمان راتھر نے چینی کی پیالی میں تھوڑی سی چائے انڈیل کر نمبردار کی طرف بڑھا دی۔ نمبردار لیٹا ہوا تھا۔ وہ دور آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پیالی دیکھ کے وہ چونک پڑا۔

"اری بے شعور کمیں کی، میکے میں تو بڑی بدھو رہی ہے۔" نمبردار نے طنزیہ انداز میں کہا اور اردگرد بیٹھے ہوئے تین چار مزدوروں نے زور سے قہقہہ مارا۔

"میرے میکے نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ اپنا تو پیٹ پالنا ہے تمہیں، دوسروں کا درد سر مول لینے کیا فائدہ؟" رحمان راتھر نے زنانہ آواز میں کہا۔

"کون سا درد سر مول لیا ہے میں نے؟ تیری ماں نے تو تجھ کو پاؤ بھر بھات پکانا بھی نہ سکھایا ہے۔" نمبردار نے کہا ـــــ

جائے! ایک دن مندر جا رہی تھی کہ ایک موٹر میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ موٹر میں جو آبرہ تھی اور مجھے پکار رہی تھی۔ میں تو ہکا بکا رہ گئی کہ اس نے مجھے کیسے پہچان لیا ــــ؟ وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔ اگر تو دیکھے گی نا ــــ تو سمجھے گی کہ کل کی دلہن ہے۔ بڑے بھاگ ہوتے ہیں ان کے۔ لکھ پتیوں کے ہاں بیاہی گئی ہے۔ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ بیچاری نے بڑی عزت کی میری۔ میرے بھی جیسے بچپن کے دن کچھ دیر کے لئے لوٹ آئے۔ بالوں کی جڑیں پکی دیکھیں تو میں نے کہہ دیا۔ وہ ہنس دی اور خضاب دکھایا مجھے۔ ایک بوتل مجھے بھی دے دی۔ خوشبو کی دھاریں پھوٹتی ہیں اس سے ــــ کل آنا، میں دکھاؤں گی۔

ہم تو کم بخت مورکھ ہیں ــــ ہمیں تو کسی چیز کی خبر ہی نہیں۔ یہ پنجابنیں حوریں نہیں ہوتیں ــــ!

اب تو ہی بتا ــــ اگر یہاں نہ آیا کرتی تو بچپن کی یہ سہیلی کہاں ملتی ــــ؟ اسی لئے تجھے بھی ہنومان مندر لے آئی۔ سچ مچ ہی یہاں من کو شانتی ملتی ہے۔ نہیں تو گھر بار اور ملہ یار کے مندر ہیں ــــ پہلے کیچڑ سے اٹی گلیاں سر کرو۔ پھر بھیڑ بھاڑ اور دھکم پیل میں گم ہو جاؤ۔ اگر کسی کے ہاتھ چپل لگا تو وہ وہی اڑا لے گا جس کا جو جی چاہے، کرتا ہے۔ اب یہاں دیکھو۔ سب الگ تھلگ ہیں۔ یہ پنجابیوں کی آرتی بھی خوب ہے۔ اس کے ساتھ من کے تار بج اٹھتے ہیں۔ دوار کا ناتھ گنگناتا ہے اور میں اس کا ساتھ دیتی ہوں۔ اس کی طرح تنگ نہیں آتی۔ جس دن دھوپ نہ جلی پا میں رسوئی میں بیچارا پھرنے سے رہی ــــ دن بھر بڑبڑاتا رہتا ہے۔

سچ پوچھے تو اس نے میرا تن بدن جلایا ہے ــــ یہی ہنومان جی مجھ پر دیا کریں ــــ اچھا ری، اب تو جا ــــ تجھ پر بھی دیا کریں۔ جا اب راستہ بالکل سیدھا ہے۔:

ــــــــــ کشمیری سے ترجمہ: محمد احمد اندرابی

ٹھیکے داروں کے ساتھ اینٹیں اور گارا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں اور شام ہوتے ہوتے تقریباً سارے مزدور کھٹی تالاب میں جمع ہو جاتے ہیں۔ تب چھ چھ کا گروپ بنا کر ڈیرا جماتے ہیں اور چولہا بنا کر آگ جلاتے اور چاول پکاتے ہیں۔

مزدور ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں، ہر ٹولی چار پانچ آدمیوں پر مشتمل ہے، یہ لوگ اپنے اپنے چولہوں کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ جیسے ساگ اور آلو نہیں۔ بلکہ متنجن اور پلاؤ تیار کیا جا رہا ہو۔ بعض مزدور پانی لا رہے ہیں۔ اور بعض آٹا گوندھ رہے ہیں۔ بعض تراموں میں چاول چن رہے ہیں اور بعض بازار سے سودا سلف لے کے آ رہے ہیں۔ بعض آگ بھڑکا رہے ہیں اور اس طرح کھٹی تالاب میں چولہوں کا چراغاں دور دور سے نظر آ رہا ہے۔ یہاں آدمیوں کا میلہ لگتا ہے۔ ننگے پھٹے کپڑے پہنے ہوئے، میلے کچیلے، دھوپ سے تپے ہوئے اور فاقہ کش!

بعض لوگ صاف لباس پہنے ہوئے بھی نظر آتے ہیں، صاف و شفاف لباس پہنے ہوئے لوگ بھی مسجد میں داخل ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ ویسے تو یہ صرف ننگے لوگوں کی بستی ہے، یہ لوگ زمین کے اسی ٹکڑے پر کھانا پکاتے اور چولہا جلاتے ہیں۔ بس کھاتے پیتے اور آرام کرتے ہیں۔

آج شام کھٹی تالاب میں ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ ایک مزدور زور زور سے بازو ہلا رہا تھا اور غلط سلط اردو بول رہا تھا۔ "ہم کیا کھائے گا۔ سیٹھ اپنا سر، تم وقت پر پونا دیگا۔ ہم بوکھا مریں گا کہ نہیں۔" "ارے بات تو سنو رمضانا" سیٹھ صاحب نے نرمی سے جواب دیا۔

"بات کیا سنیں گا سیٹھ، ضرورتوں کی اتنی مانگ تھی کہ ہم نے تن کے کپڑے بھی بیچ ڈالے، روز بولتا پونا ملیں گا۔ ہم کدی نہیں آئیں گے کام پر، جب تک پونا پونا نہیں دیں گا۔"

"ارے رمضان پرے، تمہیں کیا ہو گیا، اپنے مالک سے اس طرح کا برتاؤ نہیں کرنا چاہئیے"

ایک مزدور نے رمضان پرے سے کہا ——

"ارے بھئی کیا ہو گا۔ اس نے ہمارے جگر کو پارہ پارہ کیا ہے۔ دو سو روپے اس کے پاس پڑے ہیں، تم ہی بتاؤ ہم کھائیں گے کیا؟"

لیجئے میرا اور میرے میکے والوں کا نام، میں تمہارے منہ میں جلتی ہوئی لکڑی ٹھونس دوں گی

ان ڈارتے مسکراتے ہوئے جلتی ہوئی لکڑی چولہے سے نکالی، نمبر ڈار نے چھلانگ ماری اور

بری طرف ہولیا۔ مزدوروں نے بے ساختہ قہقہہ مارا۔

یہ مزدوروں کا ایک ڈیرا تھا۔ جو دن بھر تھکے ماندے محنت مزدوری کر کے کھٹی تالاب کے

ن میں چولہا جلا کر چاول، سبزی اور چائے تیار کر کے یہیں ننگی زمین پر کھلے آسمان کے نیچے

اوڑھے ہوئے نیند کی وادی میں کھو جاتے ہیں۔ ان کا گھریلو سرمایہ فقط المونیم کے ایک

پتیلے، ایک ہانڈی، لکڑی کا کف گیر اور المونیم کی ایک ترامی[1] ہے۔ جب یہ لوگ صبح ہوتے

مزدوری کرنے کے لئے نکل پڑتے ہیں تو اپنا سارا سامان کھٹی تالاب کے کسی دکاندار کے ہاں رکھتے

ہیں اور لوٹنے پر واپس لے آتے ہیں۔

وہاں کشمیری مزدوروں کے مختلف ڈیرے ہیں۔ جموں والے اس جگہ کو "تالاب کھٹیکاں" کہتے

ہیں اور کشمیری مزدوروں نے اس جگہ کا نام کھٹی تلاؤ رکھا ہے، یہ جامع مسجد کے نزدیک ہی کنال

بھر زمین ہے جس کے چاروں طرف لکڑی کی دیوار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جموں میں نلکے لگنے سے

پہلے یہاں ایک بڑا تالاب تھا جس میں بارش کا پانی جمع رہتا تھا۔ اور یہ پانی تین چار محلے والے

استعمال کرتے تھے۔ نلکے لگنے کے بعد اس تالاب کو آہستہ آہستہ مٹی سے پر کیا گیا اور

سرکار نے اس کے چاروں طرف لکڑی کی چھوٹی دیوار کھڑی کی۔ یہی جگہ کشمیری مزدوروں کا کھٹی

تلاؤ ہے۔ اس احاطے کے چاروں طرف سڑک ہے، اور سڑک کے چاروں اور دکانیں، ہوٹل، ٹی

سٹال، نانبائیوں کی دکانیں، سبزی فروش، قصاب اور میوہ فروش ہیں۔ بھکاری

مرد، عورتیں اور بچے، اور ان کے ایک طرف ایک بہت بڑی مسجد، جامع مسجد!

دن بھر تمام مزدور مزدوری کرتے ہیں۔ لکڑی کی منڈیوں اور آڑھت کی دکانوں پر کام کرتے ہیں،

---

[1] ایک قسم کی تھالی جو مسلمان گھرانوں میں استعمال ہوتی ہے۔

میں، تب سے کشمکش بھی پیدا ہو گئی۔ کبھی وہ کھینچے اور کبھی یہ" سفید داڑھی والے مزدور نے جواب دیا۔

"چھوڑو، ذرا یہ حقہ رمضان پرے کو دے دو۔ اس نے کچھ کم ہی دھینگا مشتی کی ہے "سیٹھ کا تو بہانہ ہی ہے۔ اصلی ماجرا تو بتا نہیں سکا۔" ایک کمسن مزدور نے مسکراتے ہوئے کہا ۔۔۔۔۔

"ارے کیا ہو گیا ہے۔ تمہیں کیا کہتے ہو تم۔"

"ارے چھوڑو یہ تو سیٹھ کو بھی معلوم ہے"

"بتاؤ نا کیا؟ تمہیں میری قسم"

"بتا دوں سیٹھ اجازت ہے۔"

رمضان پرے یکایک ہنس پڑا۔ حقہ کا کش لگاتے ہوئے اس نے ایک مزدور سے کہا۔

"سنو بھئی صمد! کیا تمہیں جموں کی آب و ہوا راس نہیں آتی ہے؟

میں تمہارے کان کھینچ لوں گا۔" کم سن مزدور کو دوسرے سب مزدوروں نے گھیر لیا۔

بولو بھئی بولو۔ جب تمام مزدور اس پر جنگلی کوؤں کی طرح جھپٹ پڑے، تو اس نے کہا:

"بھئی بات تو کچھ بھی نہیں۔ سیٹھ سے کوئی یہ کہہ رہا تھا۔ "رمضانا گھر بہت یاد آتا ہے سیٹھ نے کہا۔" آہو جی یاد کیوں نہیں آتا۔ پھر کریں گا کیا۔"

کمسن مزدور نے ایک نے چھیڑی۔ تمام مزدوروں نے زور کا قہقہہ مارا، رمضان نے کہا ۔۔۔۔۔ "اے جوان مرگ کہیں کا۔ تو میرا ازلی دشمن ہے۔"

"کھٹی تلاؤ کے ایک طرف ایک چھوٹا شیڈ ہے۔ جہاں گھاس فروخت کی جاتی ہے۔ اس شیڈ میں گھاس کاٹنے کی ایک مشین ہے۔ لالہ دیوی داس اس کا مالک ہے۔ کل ہم گھاس خریدنے کے لئے گئے۔ لالہ وہاں نہ تھا۔ صرف ہم تین کشمیری مزدور وہاں تھے۔ ایک مشین سے گھاس کی کٹائی کرتا تھا۔ دوسرا اٹھا لیتا اور تیسرا لے جانے کے لئے تیار تھا۔

"تو بھی بھی آہستہ آہستہ سے بولو۔ اس طرح رعب جمانے سے کیا ہوگا۔

"ارے بھئی آپ سمجھاؤ نا اس کو، بل مل جائے گا۔ تو اس کا حساب چکا دوں گا۔ کام بند تو نہیں ہونا چاہیئے۔"

اتنے میں لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا، کیا معاملہ ہے؟ رمضان پرے، کیوں اتنا غصہ ہو رہا ہے؟ یہ معلوم ہوا کہ رمضان پرے دوسرے بیس آدمیوں کی طرح اس ٹھیکے دار کے ہاں مزدوری کر رہا ہے اور کسی جگہ پل تعمیر کر رہا ہے، انجینیروں نے ٹھیکے دار کا بل پاس نہیں کیا تھا اور ٹھیکے دار کا بل پاس نہیں کیا تھا۔ اور ٹھیکے دار کے پاس رمضان پرے کی جماعت کو دو سو روپے باقی رہ گئے تھے، اسی وجہ سے انہوں نے کام پر آنا بند کیا تھا۔ ٹھیکے دار بے بسی کے عالم میں تھا۔ میں نے رمضان پرے کو سمجھایا۔ لیکن وہ غلط سلط اردو بول کے کچھ گالیاں اپنے آپ کو دے رہا تھا۔ اور کچھ سیٹھ کو، آخر میرے طے ہو پایا کہ ٹھیکے دار فی الحال رمضان پرے کو ایک سو روپے دے گا۔ اور باقی پیسے بل آنے پر۔ رمضان پرے کا غصہ اب بھی تھم نہیں پایا تھا۔

"ارے او رمضان پرے کو ٹھیکے دار سے حساب چکانا ہے۔ ٹھیکے دار کو انجینیئر سے، انجینیئر کو افسر سے، افسر کو بڑے افسر سے اور بڑے افسر کو نہ جانے کس سے حساب کی ہی تو دنیا ہے بھئی چلو چلتے ہیں۔ میں رمضان پرے کو پکڑ کے اپنے ڈیرے پر لے گیا۔ چولہا تپ رہا تھا۔ ہانڈی ابل رہی تھی۔ رمضان پرے کے دوسرے ساتھی چولہے کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے، میں نے کہا ذرا اس حقے میں تھوڑا سا تمیا کو ڈال دو، ارے سنو سیٹھ کے برتاؤ نے اس میں تلخی پیدا کر دی ہے۔"

"کیا وہ ادھر ہی گیا تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟"

دوسرے مزدور نے پوچھا!

"ارے چھوڑ دو اس نے ابھی ایک سو روپیہ دینا مان لیا ہے۔ بل آنے پر باقی پیسے بھی چکائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"بھئی چھوڑ دو! یہ کونسی نئی بات ہے جب سے مزدور اور ٹھیکے دار عالم وجود میں آئے

کپڑے وغیرہ کھالیتی ہیں۔ ان کے کھانے پینے کی کسی کو بھی فکر نہیں۔ مگر تو بھی ان کا نام "گاؤ ماتا" ہے۔ اس لنگڑے مزدور نے گائے ماتا کو دیکھا اور دوسرے سے کہنے لگا۔ "ارے جمال! ایک عرصے سے ہم نے کوئی اچھی سی ضیافت نہیں کھائی۔

"ہم کیا کریں گے۔ اس کا علاج کیا ہے۔" جمال نے کہا ______

"علاج بھئی علاج تو وہاں سڑک پر چل رہا ہے۔" لنگڑے نے راہ چلتی کسی گائے کی طرف اشارہ کیا۔ اور ابھی صبح "گاؤ ماتا" کی جے کا نعرہ بلند ہوا، مگر ان لوگوں کو شاباش جنہوں نے ملزم کو پکڑ لیا اور خود امن قائم رکھا۔

پولیس نے ملزم کو پکڑ لیا۔ اور کھٹی تلاؤ پہلے کی طرح شاداب ہو گیا۔ دن دو دن کا ہنگامہ دور ہو گیا۔ دکانیں کھل گئیں، ہوٹلوں میں گہما گہمی پیدا ہو گئی۔ چولہے پھر سے روشن ہوئے۔ کھٹی تلاؤ اپنے رنگ میں دوبارہ تبدیل ہوا جب سے پولیس نے اپنی کارکردگی کم کر دی۔ تو کھٹی تلاؤ میں اور بھی گہما گہمی پیدا ہو گئی۔ جو مزدور جموں سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ واپس لوٹنے لگے۔ کشمیر میں موسم بہار کی آمد تھی اور ان لوگوں کے دلوں میں گھر لوٹنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی، کچھ تو امرتسر سے آرہے تھے اور کچھ جالندھر سے، کھٹی تلاؤ میں آج کل عید سی ہے حجامت کرنے والوں کے ارد گرد چہل پہل ہے، کچھ لوگ داڑھی بنا رہے ہیں اور کسی کے بالوں کی کٹائی ہو رہی ہے۔ بہت سارے لوگ مسجد کے تالاب میں نہا رہے ہیں۔ کچھ لوگ توی کے کنارے کپڑے دھو رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے شاید اس سیزن میں پہلی بار نہایا تھا۔ مردہ جسم میں جان سی آگئی ہے۔ بہار کی خوشگوار ہوا نے ہر طرف رنگ سا بچھا دیا ہے۔ ان ڈیروں پر بڑی چہل پہل تھی۔ مٹی کی ہانڈیوں اور المونیم کے برتن جیسے ہنس رہے تھے، ٹین کے صندوق، چلمچیاں اور نئی دریاں دکھائی دے رہی ہیں، میں ایک لمحے کے لئے کھڑا رہا اور یہ آواز سنی۔

"ارے یہ سامان کہاں سے خریدا،" ایک مزدور نے دوسرے سے پوچھا جو ہاتھ میں صندوق تھامے ہوئے تھا۔

رسول ڈار نے جواب دیا۔ "وہ آج مصروف ہیں۔ کیا کوئی کام ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں من بھر گھاس چاہیئے۔"

"جناب لے لیجیئے، آپ کے ہاتھ کس نے روک لئے ہیں۔" اس نے ایک من گھاس تول دی اور پیسے لے لئے، دوسرے مزدور نے کندھے پر اٹھا کر ہمارے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے کہا ارے رحمان اتھ سر تو کس طرح لالہ سے بغیر پوچھے گھاس بیچتے ہو۔ نہیں جناب اس بے چارے کو تو خبر بھی نہیں ہوتی ہے کہ ہم ہی گھاس لاتے ہیں، کاٹتے ہیں۔ تولتے ہیں اور بیچتے بھی ہیں اور شام ہوتے ہی حساب لگا کر پیسے لالہ کو دیتے ہیں۔ وہ بے چارہ ہم پر بھروسہ کرتا ہے اس کی طرف سے خدا ہی حاضر ناظر ہے۔ بھئی اعتبار بھی تو کوئی چیز ہے۔ ہم لالہ جی کے پاس چودہ سال سے کام کرتے آئے ہیں، ہر سال جاڑے کے موسم میں ہم اسی کے پاس مزدوری کرنے آتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "کیا اسی طرح باقی ہٹوں پر بھی کام ہو رہا ہے۔" "جی ہاں"

ایک دن صبح ہوتے ہوئے ہی کھٹی تلاؤ کے نزدیک ہی شور بلند ہوا۔ دیکھنے کے بغیر ہی میرے پاؤں تلے زمین کھسک سی گئی۔ میں نے لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ ایک نوجوان اپنے کندھے پر ٹوکرے میں گائے کا سر لئے تھا۔ سر کے ارد گرد پھول کی مالائیں تھیں۔ چاروں اور نعرے گونج رہے تھے، "گاؤ ماتا کی جے" لوگوں کے چہرے خونیں تھے، تمام دکانیں بند ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ کھٹی تلاؤ میں کسی نے گائے کی ہتیا کی تھی۔ سیکنڈوں میں ایک بڑا جلوس نکلا۔ شہر کے تمام لوگ اور لیڈر موقعہ پر ہی پہنچ گئے، ہر ایک نے لوگوں کا غصہ اور رنج دور کرنے کی کوشش کی۔ سارے شہر کو ایک جھٹکا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر ایک یہی کہہ رہا تھا کہ نہ جانے کیا انجام ہو گا۔ لیکن جموں کے لوگوں نے فراخ دل ہونے کا ثبوت دیا۔ ہندو اور مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ ملزم کو فوراً پکڑ لیا جائے۔ سرکار نے بھی ملزم کو پکڑنے کی ہدایات جاری کیں، چنانچہ ہوا بھی یہی۔

کہا جاتا ہے کہ یہاں ایک پرانی مسجد ہے۔ اس میں ایک لنگڑا، اپاہج اور دو اور آدمی ڈیرا جمائے ہوئے ہیں۔ جموں میں بہت ساری آوارہ گائیں ہیں۔ جو جگہ جگہ پھر کر کاغذ پھٹے ہوئے

لکیریں اور نقطے

ڈاکٹر شنکر رینہ (مرحوم)

بہت دنوں سے میری نظر ہی دھندلا گئی ہے۔ شوخ رنگوں کی پہچان ہی نہیں کر پاتا ہوں۔ جیسے سب کچھ بے رنگ بن چکا ہے۔

یہ ایک احساس،

جس نے برس ہا برس سے میرے اندر ہی اندر ایک کھلبلی مچا رکھی ہے۔

میں اسے آج بھی بھلا نہیں سکتا!

ابھی ابھی میں ایک بار پھر جھوٹ بولا ہوں۔

میرے خیال میں عظیم کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ مجھے جھوٹ بولنا ہے۔ نہیں تو کلثوم بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔ کلثوم کو پورا وشواس ہے کہ عظیم کو سُلانے کے لئے میں جس مارفین کا استعمال کرتا ہوں، اُس سے وہ ٹھیک ہو چکا ہے!

"ارے بھائی آج پیسے کی کیا قدر ہے۔ بڑی مشکل سے ساڑھے بارہ روپے میں خریدا ہے"

"ارے بھائی کچھ بزازی کا سامان بھی خریدا،"

"نہیں کیا خریدتا۔ کافی مہنگائی ہے۔ تھوڑی سی چھینٹ خریدلی۔"

"ارے واہ! یہ کھیش کس نے خریدا ہے۔"

"ارے بھائی نئی چوک میں تو کافی مقدار میں ملتے ہیں۔

"صمد پرے ذرا میرے ساتھ آؤ، میں بھی چھوٹی سی دری خریدلوں۔"

"رحمان راتھر بھائی ذرا دو پیالے قہوہ تیار کرنا یہ احد بٹ تو امرتسر سے آیا ہے۔"

"تم نے صابون خریدلیا بچیوں کے لئے، وہ منتظر ہوں گے۔

ایک طرف دو نوجوان لباطی کی دکان کے پاس باتوں میں مشغول تھے، ایک نے کہا۔

"ارے میں نے چوڑیاں خریدلیں۔ دوسرا بولا۔

"ارے رحمانا لپ اسٹک ہاتھ میں لے لو۔" تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خدا قسم راجہ اگر لپ اسٹک لگائے گا تو جنگلی سینا شرمائے گی۔ لپ اسٹک ہاتھ میں لے لی۔ ایک سرد آہ بھری، اسی کے ساتھ گیت کے بول اس کے ہونٹوں پر تیرنے لگے ؎

دہ لے کو ستوڑ یے پوژی مائے ترأ دنیری یے
(اے رے لجیلی غزالہ دھوبن سے چپی آ)

(کشمیری سے ترجمہ: پریمی رومانی)

میرے وارڈ کے اس کنارے کے مریض بہت ہی گمبھیر ہیں۔ پتہ نہیں کہ گھڑی بھر میں کتنے چلے جائیں گے۔ ابھی ٹھنڈے آنسو ہوا کے ساتھ مِل جائیں گے۔ اور آنسوؤں سے بوجھل ہوا کا مزہ نمکین بن جائے گا۔ میرے ہونٹ سُوکھ چُکے ہیں۔ آج میں وارڈ سے نکلوں گا ہی نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ جیسے میں اکیلا ہی موت کے ساتھ پنجہ لڑا رہا ہوں — میں جانتا ہوں کہ اس مقابلہ میں اُسے کون ہرا سکا ہے۔ اور اگر میں اس درد اور ان آنسوؤں کو ختم کر سکا۔ میں موت سے اُس کا بڑھاپا چھین لوں گا۔ تاکہ موت ایک کثیف رُوح بن جائے۔ جیسے کسی کی بددُعا لگی ہو۔

دُور مکانوں کے اُس پار پر وتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ شکھر مالائیں جیسے آکاش کو چُوم رہی ہیں۔ ایک ...... دو ...... تین ...... چار ...... پانچ ...... دس۔ اس کے بعد گنتی کھو جاتی ہے۔ میں کبھی بھی ان کی گنتی نہیں کر سکا ہوں۔ آج یہاں زندگی اور موت کے قریب رہ کر مجھے لگتا ہے کہ میری راہوں میں قدم قدم پر دُور دُور تک یہی شکھر مالائیں پھیلی ہوئی ہیں ——— ہزاروں۔ اتنی کہ جن کی میں گنتی نہیں کر سکتا۔

مجھے کچھ حرارت کا سا احساس ہو رہا ہے۔ کیونکہ مجھے اندر گلے میں بھاپ اُٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ میرے اندر ہی اندر بائیں چھاتی کے نیچے کچھ بج رہا ہے۔ باہر بھی خاصی تیز دھوپ ہے ...... ایسی تیز کہ مٹی تپ رہی ہے۔ کھڑکی کی چوکھٹ کے باہر پھولوں کے پودے تک سُوکھ چکے ہیں۔ پتوں کو بھی دھوپ کھانے لگی ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ آج پانی برسے گا۔ میں جانتا ہوں۔ میں موسم کی ہر تبدیلی کو محض سُونگھ کر ہی جان لیتا ہوں۔

عادت جو ہوئی!

میں جانتا ہوں۔ آج پانی برسے گا۔ ورنہ اگر ان پھولوں کو وارڈ کی آنسوؤں بھری ہوا لگ گئی تو اس نمکین پانی سے ان کا رنگ ہی بگڑ جائے گا اور یہ سُوکھ جائیں گے!

آج نہیں تو کل ــــ بے وقوف کہیں کی!

جھوٹ کا یہ ویوہار

لیکن خود میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ سچ بھی آخر ہے کیا؟ کئی بار میں نے اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا ہے۔ جن کے بارے میں کہا، بچ جائیں گے، مر گئے۔ اور جن کے بارے میں پتہ تھا مر جائیں گے، بچ گئے۔ جو چیز خود اپنی سمجھ میں نہ آ سکے، وہی معجزہ کہلاتی ہے!

میں ایک بار پھر جھوٹ بولوں گا۔ تاکہ عظیم بچ جائے! میں جانتا ہوں کہ اگر رحیم ڈار مر بھی جائے تو کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر عظیم مر گیا تو اُس کے بال بچے بے سہارا ہو جائیں گے!

میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میں اپنے بارے میں زیادہ سوچا کرتا ہوں۔ اور سوانگ خاموشی کا ہے۔ اندر ہی اندر کُڑھنے گھُلنے کا۔ لیکن کوئی کہاں تک اندر ہی اندر کڑھتا رہے؟ میرا تو کلیجہ ہی پھٹ پڑے گا کسی دن!ــــ"

آج میں پھر اپنے دل کی دھڑکن صاف صاف سُن رہا ہوں۔

لُپ ڈُپ، لُپ ڈُپ، لُپ ڈُپ!

آج میں اس قدر بے قرار کیوں ہوں؟ لیکن شاید میں ہمیشہ ہی بے قرار رہا ہوں!

وارڈ کے اندر کی کھڑکی سے میری نظر دُور تک جاتی ہے۔ دُور تک نظر صاف جاتی ہے، دُور سے مکانوں کی قطار نظر آتی ہے۔ قطار اُوپر قطار۔ بھیڑ بھاڑ اور شور شرابہ! زندگی کی گونج۔ مجھے یہ شور بہت اچھا لگتا ہے۔ کیونکہ میں بھی اسی کے ساتھ ہی پیدا ہُوا تھا۔ لیکن آج یہ احساس پھونک پھونک کر مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میں اس شور سے بالکل الگ ہوں۔ بالکل اکیلا۔ ساتھ رہنے سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی بھی کسی کے من کی بات جان نہیں پاتا۔

پاس ہی ایک سنگ تراش پتھروں سے لوحِ مزار تراش رہا ہے۔ ایک ... ... دو ... ...
تین ... چار ... پانچ ... اور اس کے بعد میری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اور میں
کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ لوحِ مزار کس کے اوپر رکھ دئے جائیں گے؟ اور میری آنکھوں کے
سامنے راجی، نوری، رحیم ڈار اور عظیم ابھرتے ہیں۔ اور میری ریڑھ کی ہڈی تک ٹھنڈی ہونے
لگتی ہے۔

سوچتا ہوں کہ ان باتوں پر سوچنا ہی چھوڑ دوں۔ اب تک ان پر سوچتا رہا۔ لیکن کچھ بھی ہاتھ
نہیں آیا۔ میرا دل بھاری ہو گیا ہے۔

پانی برسنے لگا ہے اور ہر چیز سے دھول دھل چکی ہے۔ لیکن میرے اندر کی سلگتی ہوئی آگ
پھر بھی بجھے گی نہیں۔ مگر میں پھر بھی خوش ہوں۔ برستے پانی کے شور میں وارڈ کے اندر کی "ہائے
ہو" اور کراہٹیں دب گئی ہیں۔ کاش یہ پانی بس ایسے ہی برستا رہے!

ایک بار پھر میں وہ دور کی تربتیں دیکھ رہا ہوں۔ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ اب وقت
کم رہ گیا ہے۔ مجھے اپنے کاندھے بوجھل سے لگتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تربت مدتوں
سے میرے اوپر بیٹھی ہوئی ہے۔ جانے میں کیونکر سانس لے سکتا ہوں۔ شاید میں خواب دیکھ
رہا ہوں۔ لیکن میں تو خواب دیکھنا ہی بھول چکا ہوں۔ اس آنسوؤں سے بوجھل ہوا نے
جانے کب میرے خوابوں کی رنگینی ہی چھین لی ہے! میرے خواب بے رنگ ہو چکے ہیں۔ مگر ان
سوچوں کا کیا کروں جو کیچڑ کے چھینٹوں میں بھی دھنک کے رنگ بھرتی ہیں۔

پانی بے تحاشا برس رہا ہے۔

تربتیں دھل رہی ہیں۔

ان پتھروں کے آر پار پانی کی نمی جا سکے گی کیا؟ ایسا ہو تو میں بھی کچھ ٹھنڈک پا لوں!
وارڈ کے اندر کراہٹیں بڑھ رہی ہیں۔ اور میں یوں ہی وارڈ کے اندر جاتا ہوں۔ لوحِ مزار اب
بھی میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کن پر آ بیٹھیں گے۔ کچھ عجیب سا لگ

میری نظر اُٹھ اُٹھ کر اس باغ کی طرف جا رہی ہے۔ یہ باغ مجھے عجیب سا لگ رہا ہے اس درد، تکلیف، ان آنسوؤں اور چیخوں کے اتنا نزدیک یہ خوب صورت پھولا ہوا باغ۔ لگتا ہے۔ میں ہنس پڑوں گا!

آج میرے وارڈ کی حالت بہت گمبھیر ہے۔ جانے کیوں مجھے لگتا ہے، آج یہاں کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا! جانے کتنوں پر خاک گرے گی۔ وارڈ سے راجی ایک بار پھر گُلِ جعفر کی طرف نفرت سے دیکھ رہی ہے۔ ہمیں بھی یہ جعفر بہت ہی وزنی۔ ہوا کا ہلکا سا جھونکا آتا ہے اور یہ اپنے سر جھلانے لگتے ہیں۔ راجی کا کہنا ہے کہ پھولوں کا سر جھلانا منحوس ہوتا ہے۔ شاید ہو!

راجی خود بہت ہی بیمار ہے۔ لگتا ہے، بچے گی نہیں! لیکن میں پھر ایک بار جھوٹ بولوں گا۔ سچ بھی کہتا لیکن اُسے وشواس ہو گا کیا؟ یہ کوئی مرنے کی عمر ہوتی ہے؟ لیکن وہ خود بھی جانتی ہے۔ پچھلی بار میں نے اُسے خبردار کیا تھا کہ اُسے دل کا روگ ہے! اور اگر اُس نے پھر بچہ جنا۔ تو وہ خود بچے گی نہیں۔ کیونکہ وہ اس صدمے کو سہہ نہ سکے گی۔ لیکن وہ مانتی جب نا؟ اب بھی نہیں مانتی۔ بچے کو مار کر اُسے بچایا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ تو اپنی ضد چھوڑتی ہی نہیں!

میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں ایک بار پھر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگتا ہوں۔ لیکن راجی کی مورت بار بار میری آنکھوں کے آگے گھومنے لگتی ہے۔ اپنی اُکھڑی ہوئی سانسوں کو دوبارہ سنبھالنے کے بعد وہ کیسے پریم اور اُتساہ کے ساتھ اپنے مرد کے ساتھ باتیں کرنے لگتی ہے۔ جیسے اُسے کبھی کوئی روگ تھا ہی نہیں۔ انسان کے اندر پریم کا ایک ایسا ساگر لہک رہا ہے جسے کوئی دبا نہیں سکتا۔

آکاش پر بادل چھانے لگے ہیں۔ سب کچھ شیتل ہونے لگا ہے۔ پیڑوں کو ہوش سا آ رہا ہے۔ پھولوں نے گردنیں اونچی اُٹھائی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں، دُور قبرستان کے

آتی ہے۔ وہ اُن کی اپنی بیوی ہے۔ ایسی باتیں کرتے ہوئے انھیں ہمیشہ اپنی تکلیف بھول جاتی ہے۔

مظفر کے بیڈ کے پاس کھڑی میڈیکل کالج کی ایک لڑکی اُس کا معائنہ کر رہی ہے۔ لڑکی بہت ہی خوب صورت ہے اور مظفر اُسے باتوں میں لگا چکا ہے اور کبھی کبھار اُسے ہنسا بھی رہا ہے۔ رام جو اور رحیم ڈرائیور کو یہ سب عجیب سا لگ رہا ہے۔ انھوں نے کئی بار مجھ سے پوچھا ہے کہ یہ لڑکی صرف مظفر کو ہی دیکھنے کیوں آتی ہے۔ میں ان سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ مظفر جان بوجھ کر انھیں باولا بنائے جا رہا ہے۔ اور جانے کیوں یہ سوچ کر مجھے خوشی سی ہوتی ہے۔

رحیم ڈرائیور اور رام جو کا درد ایک بار پھر بڑھ چلا ہے۔ اور مجھے ایک بار پھر تربتیں نظر آ رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے مظفر کی ایک جان ایک تربت کے نیچے دبی ہوئی ہے۔

ایسے میں وارڈ میں ٹرولی آتی ہے۔ ٹرولی کے پہیوں سے ایسی چیخیں اُبھرتی ہیں، جیسے کوئی بچہ روندا جا رہا ہو۔ مریض کا منہ دیکھے بنا ہی جیسے میں سونگھ لیتا ہوں کہ یہ نہیں بچے گا۔ آزمائی ہوئی بات ہے نا۔ اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے بارے میں بہت زیادہ سوچتا ہوں۔

ٹرولی کے اوپر لال کمبل کے نیچے پڑے ہوئے مریض کے جسم میں کوئی حرکت نہیں۔ اُس کے منہ پر موت کی زردی بکھر چکی ہے۔ لگتا ہے کہ جیسے لال کمبل نے اُس کا سارا خون چوس لیا ہے۔ سارے ماحول پر کانٹوں دار جال سا بکھر جاتا ہے۔ ساری نظریں میری اور اٹھتی ہیں۔ نبض ٹٹولتے ٹٹولتے مجھے ایک بار پھر اپنی مجبوری کا احساس جکڑ لیتا ہے، مریض جوان ہے۔ جیسے بھری جوانی میں میٹھی نیند سویا ہوا۔ میں اُس میں آکسیجن بھرنے لگتا ہوں۔ اور وہ اول جلول بولنے لگتا ہے۔ شاید کسی کو پکار رہا ہے! سوچتا ہوں کہ اُن باتوں میں کوئی مطلب تلاش نہ کروں۔ اور اسی لیے باہر کی طرف نظر اٹھاتا

رہا ہے مجھے۔ اتنا شور ہو کر بھی ایک عجیب سی چُپ محسوس ہو رہی ہے۔ سارے بیڈ بھرے پڑے ہیں۔ لیکن ماحول پھر بھی کچھ خالی خالی سا لگ رہا ہے۔

رام جو روز ہی کی طرح آج بھی مجھے آتے دیکھ کر رحیم ڈار کے ساتھ باتیں کرنے لگتا ہے:

"یہ بھی کوئی بچے ہوئے۔ میں گرا۔ تو پھوٹے مُنہ پوچھتے بھی نہیں۔" رحیم ڈار نے پلٹ کر جواب دیا۔

"مجھ سے کیا کہہ رہے ہو بھائی۔ میں خود اپنوں سے مایوس ہوں۔"

رام جو کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ اس بوڑھاپے میں مجھے وہ ایک چیل کی طرح نظر آرہا ہے۔ میں اُس کے پاس جانے سے گھبراتا ہوں۔ میں ہی کیا، سب خوف کھاتے ہیں اُس سے۔ اور اُسے شکایت ہے کہ کسی کو اُس کے ساتھ ہمدردی نہیں۔ اُس کے پاس جا کر مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ کاش میں اس کے ساتھ کوئی ایسی بات کر سکتا جس سے اُس کی تسلی ہوتی۔ لیکن مجھ سے کچھ کہا ہی نہیں جاتا۔ اور وہ اُلٹا مجھ سے کہتا ہے:

"اس سے مرنا کہیں اچھا ہے!"

اور میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ سخت اور ناقابلِ برداشت درد میں مبتلا ہے۔ اُس کی بات کو ٹالنے کے لئے میں اُس کا چارٹ اُٹھا کر دیکھنے لگتا ہوں۔ اور وہ کہتا ہے:

"میرے لئے انڈا اور کلیجی تجویز کیجئے۔ میری تو ساری شکتی ہی ختم ہو چکی ہے۔"

یہ کہتے کہتے اُس کی سانس سمٹنے لگتی ہے اور اُس کی رگیں تن جاتی ہیں۔ اور لگتا ہے کہ یہ تو گیا۔ وہ تڑپنے لگتا ہے اور مری مری آنکھوں سے میری اور دیکھتا ہے ——

"میں پہلے کی طرح سانس لینا چاہتا ہوں!"

میں اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے نکلتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں۔ آگے چل کر میں سُننے لگتا ہوں۔ رام جو، رحیم ڈار کے ساتھ مل کر مظفر کی بُرائی کرنے لگتا ہے۔ انھیں اس بات کا یقین نہیں کہ جو عورت مظفر کو دیکھنے

رہا۔ مجھے لگتا ہے کہ آنسوؤں کی جگہ اُس کی آنکھوں میں اُبلا ہوا تیل ہے۔ یہ تیل بھی بس چپک چکا ہے آنکھوں کے ساتھ۔ مجھے آنسو اچھے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان میں بہاؤ ہوتا ہے۔ اور یہ بہہ کر آنکھوں سے درد کی کالک دھو لیتے ہیں۔ مجھے ایک بار پھر احساس ہوتا ہے کہ یہ عورت بہت ہی تکلیف سے گذر رہی ہے۔

رام جو بیڈ سے اُٹھ کر عورت کے پاس جاتا ہے؛ اُسے تسلی دینے کے لئے۔ لیکن وہاں پہنچ کر وہ بھی گُنگ ہو جاتا ہے۔ اُس کا اس طرح تسلی دینے کے لئے اُٹھنا بھی عجیب سا لگ رہا ہے۔ وہ یُوں ہی اُس کی عُریاں بانہہ تھام لیتا ہے، جب کہ اس کا کوئی موقع محل ہی نہ تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کچھ سمٹ سی گئی۔ جیسے زمین میں دھنس گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ رام جو جُوں ہی اس کی بانہہ چھوڑ دیتا ہے، بانہہ میں تیل پڑ چکا ہوتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ رام جو کے ہاتھوں میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی؟ عورت پر جیسے سکتہ سا گر جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی ہچکیاں اور تیز ہو جاتی ہیں۔ سوچتا ہوں کہ اپنے کانوں کو اپنے ہاتھوں سے بند کر دوں۔ لیکن نبض پر ہاتھ رکھتے رکھتے ہی میں باہر کی اور جھانکنے لگتا ہوں۔ بارش لگاتار برس رہی ہے۔ جیسے آبشار گر رہا ہو۔ باغ میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ میری آنکھوں کے آگے جیسے دُھندلاہٹ سی آگئی ہے! ایک پھُول بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ صرف کانٹے ہی کانٹے۔ جانے میں کیوں سوچ رہا ہوں کہ اس بارش کے ساتھ کہیں آکاش بھی زمین پر آن گرے۔ اور ان کانٹوں پر گر کر تار تار ہو جائے! میں باہر کی اور دیکھنے کی جُرأت نہیں کرتا۔ میں آکسی جن کا دباؤ بڑھا رہا ہوں۔ مریض کے ہونٹوں پر تھرتھراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔

عورت میری اور رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ بہت ہی خوب صورت ہے؛ ہلکے آکاشی رنگ کی دھوتی بارش سے اُس کے جسم سے چپک چکی ہے۔ اور اس کے جسم کے خطوط نظر آرہے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے باہر والے کانٹے پھر اُبھرتے ہیں۔ سوچتا ہوں

ہوں۔ باہر سے ایک عورت روتی پیٹتی اندر آتی ہے۔ شاید اس مریض کی بیوی ہے!
میری آنکھیں ایک بار پھر چُندھیانے لگتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے کسی نے پھولوں
سے لدی پھندی شاخ سے میرے چہرے پر چوٹ ماری۔ وہ بہت ہی حسین ہے۔ مجھے
لگا جیسے سارے وارڈ میں کھڑکیوں کے پٹ اپنے آپ کھُل گئے۔ بستروں پر پڑے ہوئے
مریضوں میں ایک بار پھر سنسناہٹ سی پیدا ہوگئی ہے۔ عورت سامنے آکر مریض سے چمٹ
جاتی ہے۔ اُسے احساس ہی نہیں کہ ایسا کرتے کرتے وہ مجھ سے بھی چمٹ رہی ہے۔ وہ
میرے اتنا نزدیک آچکی ہے کہ اس کے بدن کی گرمی مجھے بھی محسوس ہو رہی ہے۔ میرے ہاتھوں
کی حرکت تیز ہونے لگتی ہے۔ مریض کے انجکشن لگاتے ہوئے اُس کی رگ ہی میرے ہاتھ نہیں
آرہی ہے۔ چار بار سوئی چبھونے پر بھی۔ حالاں کہ میں اندھیرے میں بھی یہ رگ قابو میں
کرنے کا عادی ہوں۔ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ آکسیجن کھول کر میں ایک بار پھر اُس کی
طرف دیکھتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے چہرے پر درد کی کالک پُتی ہوئی ہے!
میں تمنا کرنے لگتا ہوں کہ کاش مجھے سب کچھ دُھندلا دُھندلا سا نظر آجائے! رحیم ڈار بھی
اپنے درد کو بھلا چکا ہے۔ وہ سانس روکے اور ٹکٹکی باندھے ہوئے اس عورت کو دیکھے
جا رہا ہے۔ جمپر میں سے ہی اُس کی باڈی اور چھاتیوں کا اُبھار نظر آرہا ہے۔ جمپر کے اندر
سے اس کے بدن کا اُجلاپن چمک رہا ہے۔ میں رحیم ڈار کی طرف دیکھتا ہوں۔ لگتا ہے،
میں ہنس پڑوں گا۔ مظفر کچی نیند سے جاگ پڑا۔ مریض کو یوں ہی دیکھ کر وہ عورت
کی طرف دیکھنے لگا، بڑا اُداس اُداس سا!

مریض اب تک ہوش میں نہیں آیا ہے۔ میں آکسیجن کا دباؤ بڑھا رہا ہوں۔ وارڈ میں
سب لوگ چپ ہیں۔ صرف اُس عورت کی ہچکیوں کی آواز ماحول میں تیر رہی ہے۔ حیرانی
صرف یہ ہوتی ہے کہ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ اُس کی آنکھیں
بہت خوبصورت ہیں۔ پپوٹے بوجھل ہیں۔ لیکن آنکھوں سے کوئی بھی قطرہ نیچے نہیں ڈھلک

"میری محبت کی طرح۔ میری نبض آگے پیچھے ہو سکتی ہے لیکن میری محبت آگے پیچھے نہیں ہوگی!"

وہ قہقہہ لگا کر ہنستی ہے۔ مریض اُس کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

رحیم ڈار اور رام جو لحافوں کو سر کے اُوپر کھسکا لیتے ہیں اور مظفر کروٹ بدل کر رہ جاتا ہے۔

"یہی تو خرابی ہے تم میں۔ صبر نہیں کرتے۔ یہ گھر نہیں ہے۔"

"نہیں ہے؟"

"یہی تو تیرے اور میرے بیچ فرق ہے۔"

عورت ہونٹ پونچھ لیتی ہے۔

"میں ایسے نہیں سوچ سکتا۔"

"کبھی نہیں؟"

"بہت ہی کم۔"

"تم کتنی اُونچی عورت ہو۔"

"کہاں۔ میں تو سیدھی سادی ناری ہوں۔"

"ہاں میری سگریٹ تو سلگا دو۔ ہاں ذرا سی باؤلی ہو۔"

سگریٹ پیتے پیتے اُس کے ہچکی سی لگ جاتی ہے اور گردن لڑھک جاتی ہے۔ ماحول پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ میں دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہوں۔ اسی وقت بجلی کا کوندا لپک کر کھڑکی کے شیشوں سے اندر آیا ہے اور سب گھبرا کر جاگ پڑتے ہیں۔ مریض کی نبض رکنے لگی ہے۔ میں اُس کا بلڈ پریشر بڑھا رہا ہوں۔ آکسیجن کا دباؤ تیز کر رہا ہوں۔ اُس کی سانس پھر سے چلنے لگتی ہے۔

نرس یہ خبر دینے آتی ہے کہ راجی کے بچہ ہوا۔ مگر وہ بالکل بے ہوش ہے۔ میں اُس کے

اُس سے بھی کہوں۔ لیکن میں گُنگ ہوں اور صرف اُسے دیکھے جا رہا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مظفر بہت دیر سے مجھے گھور تا رہا ہے۔ اور میرے منہ پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے کہ میرے خیالوں میں کہیں ایک دراڑ ہو چکی ہے جس سے اندر جھانک کر لوگ جانتے ہیں کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ اور پھر میں دوبارہ سوچنے لگتا ہوں۔

مریض ہوش میں آنے لگا ہے۔ وہ کروٹ بدل کر جیسے نیند سے جاگتا ہے۔ اور عورت کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟"

"ایسے ہی، تم کیسے ہو اب؟"

میں ٹھیک ہوں۔ میری تو سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ ہُوا کیا تھا۔ مجھے اب بھی درد ہو رہا ہے"

عورت اب بھی ہچکیاں لے رہی ہے۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟ ڈاکٹر نے کچھ کہا کیا؟ انھیں عادت ہے۔ خواہ مخواہ بیمار کو ڈراتے رہتے ہیں۔"

عورت کو ہنسی آنے لگتی ہے۔ مجھے مریض کی بات سچی لگ رہی ہے۔

رات آگے بڑھنے لگی ہے۔ بارش رُک گئی اور آسمان صاف ہو گیا ہے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے بادلوں نے چاند کو نگل لیا۔ اور سب کچھ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ باہر جیسے ہر طرف دُھواں ہی دُھواں پھیلا ہوا ہے۔ ادھ جلی لکڑی کا سا دُھواں۔ دھوئیں کی چادر۔ ہر طرف چپ۔ میں اپنی چپ سے کانپتا ہوں۔

"میری سگریٹ تو جلاؤ۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ میری نبض دیکھو۔ لگتا ہے قرار میں آگئی ہے نا؟"

عورت اُس کی نبض دیکھتی ہے۔

مجھے تمھاری نبض بہت اچھی لگتی ہے۔ ایک ہی رفتار سے چلتی ہے۔

میں ایک بار پھر اپنے آپ ہی ہنسنے لگتا ہوں۔

رات ڈھلنے لگتی ہے۔ ہلکی ہلکی سی روشنی ہر چیز سے گلے ملنے آ چکی ہے۔ شنکر مالائیں بھی روشن ہو رہی ہیں اور مجھے ایک بار پھر تُربتیں نظر آ رہی ہیں۔

بارش سے بوجھل ہوا باؤلی سی ہو گئی ہے۔

نرس دوڑی دوڑی آتی ہے۔

"مریض کو جانے پھر کیا ہو گیا۔ وہ بولتا ہی نہیں۔ شاید مر گیا ہے!"

میں نرس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا۔

صرف ہونٹوں کے کناروں میں مُسکراہٹ بھرتا ہوں۔

دُور اُدھر اب شنکر مالائیں پُوری طرح روشن ہو چکی ہیں۔ آکاش آئینے کی ایک چادر کی طرح صاف نظر آ رہا ہے جس میں اپنی پیاری دھرتی کی صورت دیکھ لیتا ہوں۔ سونے کے تار جیسی چمک دار لکیریں اور بندیوں جیسے نقطے!

——————— {کشمیری سے ترجمہ: علی محمد لون}

بھی انجکشن لگا رہا ہوں۔ لیکن وہ دھیرے دھیرے ڈوب رہی ہے۔ بچّے رو رو کر شور مچا رہا ہے۔ یہ شور میرے کانوں میں ہی اٹک کر رہ جاتا ہے۔

"میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

مریض ایک بار پھر ہوش سنبھال رہا ہے۔

عورت مجھ سے پوچھتی ہے:

"انھیں یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

کہتے کہتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میری آواز خواہ مخواہ کھردری اور لہجہ تیز ہو گیا تھا،

میں ایک بار پھر اپنے کمرے کی طرف جا رہا ہوں۔ پانی پھر سے برسنے لگا ہے۔ چنار کے پتّوں سے آندھی میں عجیب سی آواز آ رہی ہے؛ جیسے راجی کا بچّہ اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہو۔ زبردست بارش ٹین کی چھت سے ٹکرا رہی ہے۔ لگتا ہے، جیسے شکر مالاؤں سے چٹانیں لُڑھک کر نیچے آ رہی ہیں اور آتی ہی رہیں گی۔ مجھے نیند ہی نہیں آ رہی۔ میں اندھیرے میں ہی باہر کی اور دیکھتا ہوں۔ کچھ ٹٹولتا ہوں۔ پربت، شکر مالائیں، مٹی اور اینٹوں سے بنے ہوئے گھروں کی قطاریں۔ قطار اوپر قطار۔ اور اُدھر کونے میں پتھروں سے تراشے ہوئے ڈھیر۔

سب کچھ چُپ ہے۔ آج میں سچ مچ چاہتا ہوں کہ یہ چُپ ٹوٹ جائے تاکہ دماغ میں اُٹھنے والے یہ چٹان بھی ٹوٹ جائیں!

مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں ہوا میں تیر رہا ہوں۔ کھڑکی باہر۔ کھڑکی کی چوکھٹ کے اوپر۔ یہ چوکھٹ مجھے عجیب لگ رہی ہے۔

چوکھٹ کے اِدھر زخم ہیں۔ درد ہے، اور چوکھٹ کے اُدھر کھلی اور وسیع دنیا ہے، ہنسی، پھول اور فاختائیں۔

ایسے۔ مثلاً:۔

تارا دیو ژھسٹرس فلمز کے ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھے پروڈیوسر نے ۵۵۵ سگریٹ کا دُھواں میرے چہرے کی اور اُچھالا۔ پھر پوچھا:۔

"تو ــــ اس کے بعد؟"

میں نے ڈسٹری بیوٹر کو دیکھا۔ اُس کے مُنہ سے رال ٹپک ٹپک کر گر رہی تھی۔

مجھے وہ کرسی میں لٹکتا ہوا دِکھائی دیا۔

میں سکرین پلے کا دوسرا سین بتانے لگا ــــــ

"ہمارا ہیرو پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے۔ عدالتی حکم کے بموجب اُسے سُورج ڈوبنے سے پہلے ہی سرِ عام پھانسی کی سزا دی جانی ہے۔ لوگوں کا اژدھام ہے اور پھانسی ملنے میں بس کچھ ہی منٹ باقی ہیں۔ اسی جمِ غفیر میں ایک لڑکی کہ جس کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی بھیگی ہیں۔ جس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ بھیڑ بھاڑ میں چیر کر آہستہ آہستہ اپنے قدم پیچھے کی طرف اُٹھاتی ہے اور لوگوں کے اس ہجوم سے آزاد ہو کر بھاگ جانا چاہتی ہے۔ اس میں یہ تماشہ دیکھنے کی تاب نہیں۔ اس کا دِل ڈوبا ڈوبا سا لگتا ہے اور اس میں کھڑے رہنے کی بھی طاقت نہیں۔ جیسے کسی نے اس کی ٹانگوں پر لاٹھی کا بھرپور وار کیا ہو!

سُورج اب ڈوبنے ہی کو ہے اور پھانسی میں دو منٹ باقی ہیں۔

جج صاحب ہیرو سے پوچھ رہے ہیں ــــــ

"تمھاری کوئی آخری خواہش ہو تو بتاؤ۔ مثال کے طور سگریٹ وغیرہ کی طلب؟"

ہیرو جواب دیتا ہے۔ "جی ہاں!"

"کون سی خواہش ہے؟" جج صاحب سوال کرتے ہیں۔

"میں اس ماب (MOB) سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اور ایک لڑکی کو

کوہِ قاف پر پری جنّ اور ہیرو

فاروق مسعودی

ایک زمانہ تھا کہ کوہِ قاف پر ایک پری تھی اور ہیرو کا اسی سے پیار ہوا۔ پری تھی خوب صورت، زُلف کالے شہار، پیشانی مانندِ ماہتاب، چہرہ جون آفتاب، ابرو کمان آنکھیں مثلِ گُلاب، ہنس جیسی لمبی گردن اور سینہ اناّرِ دلپستان اور ناف کے نیچے تھے دو طلائی مینار، جن کی پچھلی طرف گھنے گُل لالوں سے ڈھکا ہوا گوہر یک دانہ تھا۔ لالے کسی بھی علی بابا کے سِم سِم سے کھُلتے نہ تھے۔

اور چابی کسی مٹکے کے اندر جِنّ نے چھُپا کر رکھ دی تھی۔

پری اور ہیرو کے اس عشق کی کچھ وہی گت بنی جو عجب ملک، نوش لب، شیرین فرہاد اور لیلیٰ مجنوں کے عشق کی عام طور پر سُننے میں آتی ہے۔ میں کوئی طلسمِ ہوش رُبا سُنانے کا ماہر نہیں۔ لہذا میں یہ کہانی کچھ اپنے ہی انداز سے آپ کو سُناتا ہوں۔ بھلا کیسے؟

ایک اُتھل پتھل تھی۔ طوفان تھا۔ بھگدڑ تھی۔ لوگوں کے دلوں میں شکوک تھے؛ ان کی سوچوں پر گرد تھی۔ کون لیڈرا ہے، کون جنگجو۔ کون فتح کار کہلایا۔ اور کون آزادی کا پیامبر بنا؟ ان سوالات کے کسی کے پاس جواب نہ تھے۔ جو کچھ بھی تھا۔ طلاطم، قتل، لوٹ مار اور خون خرابہ۔ فقط آگ تھی۔ اور یہ سب جیسے ہمارا اپنا تھا۔ ہمارا ورثہ تھا۔

قبائلی پھر بھی آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔ وہ عورتوں سے ان کے کانوں کی بالیاں چھینتے رہے۔ ان کے سروں سے "ڈیجہ ہور" اُتارتے رہے (یقین صرف آنکھوں دیکھی ہی پر کرنا)۔ اب آخری لوکیشن ہے بارہ مولہ۔

اُس نے پردے کھول دیئے اور ہر طرف لالی پھیل گئی۔ کھڑکی سے پرے دُور پہاڑوں کے پیچھے سورج ڈوب رہا تھا۔ منظر اُسے بہت ہی پیارا لگا۔ اور لال تھا اس کا اپنا رنگ۔ اُسے یہ فلم شارٹ سا دکھائی دیا۔ اور لال تھا اس کا اپنا رنگ۔ لال رنگ سورج کا تھا لال پانی کا رنگ تھا جس میں ڈولتے شکارے بھی لال تھے۔ لال پھول تھے۔ اور لال تھا اس کمرے کا قالین۔ لال زندگی کا رنگ تھا اور لال تھا خون کا رنگ۔

(اور لال تھا پری کے گوہر بیک دانہ کا رنگ)

وہسکی کا آخری پیگ حلق سے اُتار کر اُس نے ویٹر کو آواز دی ــــــ

ایم بیسی ہوٹل کا ویٹر آواز سُن کر اُوپر چلا آیا اور سرپر لال فیلٹ سجائے کمرے میں داخل ہوا۔ جیب سے سَو رُوپے کا نوٹ نکال کر اُس نے ویٹر کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ویٹر نے نوٹ لینے میں پس و پیش کیا۔ لیکن "ٹپ" کہہ کر اُس نے ویٹر کو مطمئن کیا۔ اس کے بعد پھر وہی پُرانا سوال ـ "لڑکی ملے گی یہاں ؟"

ویٹر جیسے اس سوال کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ یُوں تو اس کی پیدائش سے لے کر آج تک، ہر وزیر صرف یہی ایک سوال دہراتا چلا آیا تھا ــــــ "یہاں لڑکی ملے گی ؟"

"ہاں!" ویٹر کا جواب تھا۔

بلانے کی آرزو رکھتا ہوں۔"

جج صاحب اپنے دیگر افسروں کے ساتھ صلاح و مشورے کے بعد ہیرو کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی آخری خواہش کو پورا کر دے، لیکن اس شرط پر کہ بات اور بلاوا دونوں کا انداز مہذّب ہو۔ ہیرو کو یہ شرط منظور ہے اور وہ یوں لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے:۔

"حضرات! مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ میں بے قصور ہوں۔ بے گناہ ہوں۔ میں صرف کاغذ، نب، فونٹین پین اور عدالتی قوانین کی سازش کا شکار ہوا ہوں۔ میرے پاس اپنی بے گناہی کا ایک ثبوت ہے اور وہ ہے — وقت — آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ میں بے گناہ تھا — الوداع! میرے بھائیو۔"

ہجوم پر سناٹا طاری ہے۔ لوگ آپس میں نظریں ملانے کی جرأت نہیں کرتے۔ دل ہلا دینے والی اس خاموشی میں وہ لڑکی کہ جس کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی بھیگی ہوئی ہیں، آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی جا رہی ہے اور اسی لمحے ہیرو پکار اٹھتا ہے:—

"شکتی!"

شکتی کے اٹھتے قدم ایک دم رک جاتے ہیں۔ اس کی ہچکی بندھ جاتی ہے۔

"شکتی۔ اگر تو اس ہجوم میں موجود ہے اور اگر ابھی بھی تیرے دل میں میرے لئے محبّت ہے تو آگے بڑھ! سارے پردے پھاڑ کر میرے سامنے آ۔ اور اگر تمھیں مجھ سے محبت نہیں، تو غم نہ کر۔ ویسے میں چاہتا ہوں کہ کاش تو آتی!" لوگ حیران ہیں۔

اتنا کہہ لینے کے بعد ہیرو کا گلا بیٹھ جاتا ہے۔ اس سے آگے وہ کچھ بھی کہہ نہیں پاتا — لڑکی روتے روتے سامنے آتی ہے۔

ہیرو کی نظریں جوں ہی شکتی سے ملتی ہیں، وہ چلّا اٹھتا ہے —

"شکتی!"

اور جج صاحب اعلان کرتے ہیں کہ پھانسی میں صرف ایک منٹ کا وقفہ ہے۔

اُنھوں نے شیروانی کو پکڑ کر تختۂ دار پر لٹکا دیا ہے۔

شیروانی نے ان کو غلط راہ بتائی تھی اور انھوں نے کارتوسوں سے شیروانی کے سینے کو چھلنی کر دیا ہے۔

شیروانی نے ماں کے لئے اپنی جان دی ــــ

اس اُتھل پُتھل میں ابھی بھی لوگوں کے دِلوں میں شکوک تھے۔ ان کی سوچوں پر گرد تھی۔ کوئی بھی کسی کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا۔ کون لُٹیرا ہے، کون جنگجو۔ کون فتح مند ہے، کون آزادی کا پیامبر اور کون شہید کہلایا۔ ان سوالوں کے کسی کے پاس جواب نہ تھے۔

جو کچھ تھا، صِرف لوٹ مار، قتل، خون خرابہ اور آگ!

اور یہ سب کچھ جیسے ہمارا اپنا تھا۔ ہمارا ورثہ!

سُورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ شکارے میں بیٹھے بیٹھے اُس نے ویر سے دریافت کیا۔ "اب کتنی دُور ہے؟" اُسے سیاہی سے نفرت تھی اور اسی لئے بے چین تھا۔

"بس اب پہنچ ہی گئے۔" اور ناؤ اُس نے گاف گراؤنڈ کے گھاٹ پر روک دی۔

وہ ویر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

چلتے چلتے دونوں اُوپر بنڈ تک آگئے۔

وہاں کچھ بھی دِکھائی نہ دیا۔ کالی گہری سیاہی میں اُس نے ویر سے دریافت کیا:

"کہاں ہے وہ لڑکی؟"

ویر نے چپ سادھ لی۔

ویر نے اُس کی گردن اُڑا دی۔

اگلی صبح پولیس نے بغیر سر کے، لاش اپنے قبضے میں کر لی۔

سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی ــــ

سری نگر میں قتل کی واردات۔

ویٹر نے اُسے پیچھے پیچھے چلے آنے کا اِشارہ کیا۔ اور وہ اپنا بٹوہ کھوجنے لگا جس میں ابھی بھی لگ بھگ ایک ہزار رُوپے کے نوٹ تھے۔

میں نے اگلا سین شکتی پر کلوز کیا، اور سگریٹ سُلگا دی۔ ۵۵۵ سگریٹ کا دُھواں جو پروڈیوسر نے میرے چہرے کی اور اُچھالا تھا۔ وہی دُھواں میں نے واپس اُس کی طرف پھینکا اور ڈسٹری بیوٹر کو دیکھنے لگا۔ اب کے وہ کچھ زیادہ کرسی میں لٹکا ہوا ہے،

اُس کے مُنہ سے ٹپ ٹپ گرنے والی رال اب میرے پیروں تک آ گئی ہے۔

اپنا سارا زبانی جمع خرچ اکٹھا کر کے میں نے ہیرو پر استعمال کرنا شروع کیا۔

شکتی کو دیکھتے ہی ہیرو چلّا اُٹھتا ہے ـــــ "شکتی!"

شکتی ہیرو کے گلے لگ جاتی ہے۔ روتے روتے دونوں کی آواز رُندھ جاتی ہے۔

جج صاحب اعلان کرتے ہیں کہ پھانسی میں صرف ایک منٹ کا وقفہ ہے۔

ہیرو، شکتی کے کان میں کہتا ہے ـــــ

"شکتی! میرے ساتھ شادی کر سکو گی؟ ابھی، اسی وقت!"

"ہاں ـــ ہاں ـــ ہا ـــ ں۔"

شکتی دھاڑیں مار کر رو دیتی ہے۔ (گگھی)

ہیرو شکتی کی ادھ کھلی چھاتیوں کے بیچ دانت پیوست کر دیتا ہے۔ کرسی میں لٹکا ہوا پروڈیوسر اب قرینے سے بیٹھ جاتا ہے اور اپنی رال پونچھ ڈالتا ہے۔

پروڈیوسر کی اور ایک نظر دیکھ لینے کے بعد میں پھر سے گویا ہوں ـــــ

شکتی کی چھاتیوں کے دونوں اُبھاروں کے بیچ خون ٹپ ٹپ گر رہا ہے۔ ہیرو اسی خون سے اپنا انگوٹھا تر کر کے شکتی کے ماتھے پر ٹیکہ سجا دیتا ہے۔ پھر اسی خون سے شکتی کی مانگ میں سُہاگ بھر دیتا ہے۔

قبائلی اب واپس بارہ مولہ تک آ گئے ہیں۔

اور خوش ہو کر ڈسٹری بیوٹر کو ایک عدد گالی ہیرو کی اُمّی جان کے نام عنایت کر بیٹھا۔

کوہِ قاف پر سات سمندر کھیلتے ہوئے ہیرو نے اپنی پیٹھ جنّ کی اور پھیر دی۔ وہ آنکھیں بند کیے پیٹھ پیچھے گھنٹی اُچھال کر یوں فخر سے چلّایا:—

"ایم گول!"

جنّ نے جو دیکھا تو ہیرو کا پاؤں لکیر پر پایا۔ دوزخ میں بھی اور جنت میں بھی!

جنّ نے ہیرو کے چوتڑ پر زور کی لات رسید کی۔ اور کہا:—

"مر گئے تم۔"

پھر یوں ہوا کہ نا رہا ہیرو اور نا ہی یہ کہانی۔ رہ گئی تو پری۔ اس کی کوکھ سے جنّ کی اولاد ہوئی۔ جہاں تک جنّ کا سوال ہے وہ کوہِ قاف کی اُونچی چوٹی پر بیٹھا سلاجیت کھا رہا تھا۔

————— {کشمیری سے ترجمہ: بشیر اختر}

میری سگریٹ اب بجھ گئی تھی!

پروڈیوسر نے ایک سگریٹ مجھے اور دوسری ڈسٹری بیوٹر کو پیش کی۔ تیسری اپنے ہونٹوں تلے دبا دی۔ اتنا کرکے وہ مجھ سے گویا ہوا:

"تو ـــــ اس کے بعد؟"

میں سگریٹ سلگانے کی خاطر لائیٹر تلاش کرنے لگا۔ پروڈیوسر نے لائیٹر کی مدد سے پہلے اپنی سگریٹ سلگا دی۔ پھر میری اور اس کے بعد جلتا ہوا لائیٹر ڈسٹری بیوٹر کی اور لے گیا۔ ڈسٹری بیوٹر اس آنچ پر اپنی سگریٹ سلگانے کے لئے تیار نہ تھا۔

وہ پروڈیوسر سے کہنے لگا:

"ایک ہی آنچ پر تین سگریٹ سلگائے نہیں جلتے۔ آپس میں نفرت بڑھ جاتی ہے۔"

اس نے اپنی ہی ماچس جلا کر سگریٹ سلگا دی۔

پروڈیوسر نے مجھ سے سوال کیا ـــــ

اگلا واقعہ تو آپ نے دہرایا ہی نہیں اب تک!"

ڈسٹری بیوٹر اپنی رال پونچھ کر میری طرف کہنے لگا:

"ایک دکھ بھرا گیت نالہ و فریاد ـــ" اتنا کہہ لینے کے بعد وہ مجھ سے پوچھنے لگا:

"کیوں ٹھیک ہے؟"

میں نے حامی بھر دی اور ساتھ ہی کہا:

"اور گیت کے فوراً بعد ہیرو پھر زندہ ہوگا۔"

پروڈیوسر کے بشرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ کہنے لگا:

"شاباش! ـــــ ہم ہیرو کو مار نہیں سکتے۔ ہیرو کے لئے زندہ رہنا لازمی ہے، کسی بھی حالت میں! نہیں تو فلم فلاپ۔"

ڈھنڈرس فلمز کے ایئرکنڈیشنڈ آفس میں، میں نے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے اور

ایک بوسیدہ رجسٹر ہے جس پر ہر آنے والا اپنا نام لکھتا ہے ——— یہ وِزیٹرس

(Visitors) رجسٹر ہے۔ اس کی پُشت کے ساتھ مضبوط دھاگے سے بندھا ہُوا

ایک بال پین ہے جو کونٹر کی چکنی سطح سے پھسل کر اب ہوا میں لٹک رہا ہے۔ کونٹر سے

چند قدم دُور سامنے کی دیوار کے ساتھ بچھی ادھ میلی چٹائی پر، بہت سارے آدمیوں کے

سر رکھے گئے ہیں۔ یہ جان دار ہیں! ان کی پتلیاں گھُومتی ہیں، پلکیں جھپکتی ہیں،

ہُونٹ ہلتے ہیں، بس ایک کمی ہے کہ ہُونٹ ہلنے پر آواز نہیں نکلتی ——— ایسا لگتا

ہے کہ یہ سر کاٹ کر نہیں بلکہ احتیاط سے اُٹھا کر لائے گئے ہیں۔

خود میں کونٹر کے پیچھے بیٹھا اِردگرد کے ماحول کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں

ابھی ابھی جنا ہوں! ——— نہیں، شاید میری نیند ابھی ابھی ٹوٹی ہے۔ جانے

کتنی دیر سویا میں! شاید ایک جنم ——— ایک جگ یا پھر ایک پل۔ کچھ بھی ہو، میرے

جنم لینے سے پہلے ——— نہیں میرے سو جانے سے پہلے بھی یہ نمائش چل رہی تھی۔ اور

اب بھی چل رہی ہے۔ تب بھی سُرخ مخمل والی خوب صورت چوکی پر پوتھی کھولے

رشی والمیکی لکھ رہے تھے اور اب بھی لکھ رہے ہیں۔ میں تب بھی گھٹنوں کے بل چلنا

سیکھ رہا تھا۔ اور اب بھی سیکھ رہا ہوں ——— کوئی غیر معمولی بات نہیں، سبھی

بچّے ایسا ہی کرتے ہیں! میں مادر زاد ——— بالکل ننگا ہوں، بچّہ ہوں۔ اس لئے نہ

میں شرماتا ہوں اور نہ ہی نمائش دیکھنے والے معزّزین مجھے دیکھ کر جھجک یا ٹھٹھک

جاتے ہیں ———

——— والمیکی جی لکھتے ہیں ———

——— "مریادا پُرشوتم بھگوان رام بچپن میں ہی . . . . . "

کونٹر کے پیچھے کی تنگ سی جگہ نیم تاریک ہے۔ ہال کی روشنی کی کوئی بھی کرن اس

حصّے کو مُنوّر نہیں کرتی۔ ہاں البستہ جگمگاہٹ کا تھوڑا سا عکس ضرور پڑ رہا ہے۔

رِشی والمیکی لکھ رہے ہیں

ہردے کول بھارتی

رِشی والمیکی لکھ رہے ہیں۔

"پرشورام کا دَور ختم ہو چکا ہے، اور اب مریادا پُرشوتم بھگوان رام کا اُجلا مُسکراتا جُگ ہے۔ بیلنی کا قبیلہ اب آسُودہ حال بن چکا ہے۔ ماریچ کو مُکتی مِلی ہے۔ دھوبی مریادا پُرشوتم کی شرن میں آکر رام بھگت، بن گیا ہے . . .

آج ایک عظیم الشان نُمائش کی افتتاحی تقریب ہے۔ بڑے سے ہال کو نہایت ہی خوب صُورتی اور قرینے سے سجایا گیا ہے۔ ہال کے اندر خوب چہل پہل ہے۔ سارا ہال روشنیوں سے جگمگا رہا ہے۔ روشنیوں کی اس چکاچوند میں ہر چہرہ خوب صورت اور ہر جسم گداز لگ رہا ہے۔ ہال کے داخلی دروازے کے ٹھیک سامنے ایک لمبا صاف سُتھرا چکنا کونٹر (Counter) ہے۔ کونٹر کے ایک سرے پر مُڑے تُڑے کونوں والا

میں ہاتھ پاؤں مارتے کچھ تھک سا گیا ہوں۔ میرا ابھرا ابھرا ملائم جسم پسینے سے کچھ زیادہ ہی چکنا ہو گیا ہے۔ تبھی تو ہر پھسلن پر کوئی نہ کوئی کاغذ کا پرزہ میرے جسم کے ساتھ چپک جاتا ہے!

مجھے یہاں سے کوئی ہٹاتا کیوں نہیں؟"

شاید یہ جگ (یگ) مجھ سے مطمئن ہے!!

ہال سے تالیاں پیٹنے کی آواز آتی ہے۔ پھر لمحہ بھر کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے، اور اس کے بعد ہلکی ہلکی موسیقی پر ایک آواز ابھرتی ہے ——

——"میں مورکھ کھل کامی . . . . . ."

سامنے سروں کی دکان کا مالک گیت کی لے کے ساتھ آہستہ آہستہ سر ہلاتا ہے، پالتھلین میں رکھے گئے سر بھی لے کے ساتھ ہل رہے ہیں —— بس ایک میں ہوں کہ جو گیت کی لے پر اپنا سر ہلا نہیں پا رہا۔ بچہ ہوں۔ اعصاب پر کنٹرول کرنا ابھی نہیں سیکھا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں۔ پھسل کر گر پڑتا ہوں۔ ایک اور لیبل چپک جاتا ہے۔ لکھا ہے —— "کیپ اوے فرام لائٹ۔" (Keep away from Light)

رشی والمیکی جی لکھ رہے ہیں ——

——"مریادا پرشوتم بھگوان رام کی تمازت اور تمکنت سے من کے اندھیارے . . ."

ہال کے اندر اب گیت تھم چکا ہے۔ ساتھ ہی سروں کا ہلنا بھی بند ہو گیا ہے۔ سروں کی دکان کا مالک بیٹھی سے اٹھ کر ہال کی طرف جانے لگا ہے۔ لیکن ایسا کرنے سے پہلے وہ سروں کو گنتا ہے۔ پھر میری طرف مڑ کر دیکھتا ہے۔ وہ شاید یہ اطمینان کرنا چاہتا ہے کہ میں گھٹنوں کے بل چلنا سیکھ تو نہیں گیا ہوں؟ لیکن مجھے پھسلتا گرتا دیکھ کر وہ مطمئن سا ہو جاتا ہے اور ہال کے اندر داخل ہوتا ہے —— میں ایک بار

میرے نیچے کاغذ کے بے شمار پُرزے پڑے ہیں۔ شاید نمائش میں رکھی گئی تمام چیزوں کے پارسل کونر ٹکے پیچھے اسی نیم تاریک جگہ پر کھولے گئے ہیں۔ میں گھٹنوں کے بل چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تو چکنے کاغذ کے پُرزوں پر گھُٹنے پھسل پھسل جاتے ہیں اور میں مُنہ کے بل گر تا ہوں۔ میری برہنہ چھاتی پر کاغذ کا ایک پُرزہ چپک جاتا ہے۔ یہ کسی پارسل کا لیبل ہے۔ لکھا ہے —— ہائی لی اِنفلیم ایبل۔ (Highly inflamable) —— میں سنبھل کر پھر بیٹھتا ہوں۔ سامنے چٹائی پر رکھے انسانی سروں کے پاس ایک آدمی آ کر رُک جاتا ہے۔ ایک نظر سروں کو دیکھتا ہے؛ پھر کچھ سوچ کر پاس پڑے بریف کیس کو کھولتا ہے۔ اس میں سے پالیتھلین کے کچھ تھیلے نکالتا ہے اور پھر بڑے ہی احتیاط سے سروں پر پڑے گردے کو رُومال سے جھاڑ پونچھ کر ایک ایک کر کے اُنھیں پالیتھلین کے تھیلوں میں رکھ کر قرینے سے سجاتا ہے؛ پھر کہیں سے ایک خالی پیٹی لا کر اُس کو اُلٹا کے رکھ دیتا ہے۔ اُس پر ایک سفید چادر بچھا دیتا ہے اور بریف کیس ایک طرف رکھ کر اس پیٹی پر ایسے بیٹھتا ہے جیسے سروں کی اس دُکان کا وہی مالک ہے!

ہال کے اندر زور کا قہقہہ پڑتا ہے۔ میں باورا بچّہ مچلتا ہوں اور پُوری قوّت کے ساتھ پھر گھُٹنوں کے بل چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر پھسل کر گرتا ہوں۔ پھر کاغذ کا ایک پُرزا —— ایک لیبل میرے چکنے ننگے بدن کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ لکھا ہے: —— ہینڈل وِتھ کیئر! (Handle with care) سروں کی دُکان کا مالک میری اور دیکھتا ہے، مُسکراتا ہے اور بے خیالی میں پالیتھلین کے تھیلوں میں رکھے گئے سروں کے اُوپر سے ایسے ہاتھ گھُماتا ہے جیسے مکھیاں ہٹا رہا ہو!

رِشی والمیکی پنا پلٹ کر لکھتے ہیں ——

—— "مریادا پُرشوتم بھگوان رام کی مُسکان سے ہی . . . . . ."

نہیں پاتا۔ کیونکہ اُسی وقت دوسرا آدمی مجھے گود میں اُٹھا کر اُس طرف لے جاتا ہے جہاں کچھ دیر پہلے رِشی واکمیکی جی بیٹھے تھے۔ یہ جگہ اب خالی ہے۔ وہ آدمی مجھے اُسی خالی جگہ پر بٹھا دیتا ہے۔ اب سُرخ مخمل والی خوب صورت چوکی میرے سامنے ہے جس پر کھُلی پوتھی ہے۔

—— اور اب میں لکھ رہا ہوں۔

—— پُرشوتم رام کا دَور ختم ہو چکا ہے۔ اب مریادا پُرشوتم بھگوان رام کا اُجلا مُسکراتا جُگ ہے .... مارتیج کو مُکتی مِلی ہے ......!"

{کشمیری سے ترجمہ}

پھر پھسلتا ہوں۔ ایک بار پھر گرتا ہوں۔ ایک اور کاغذ کا پُرزا ـــــــ ایک اور لیبل میرے جسم کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ لکھا ہے ـــــــ "دِس سائڈ اَپ" ـــــــ

(This side up)

اندر گہما گہمی میں کچھ ٹھہراؤ سا آ گیا ہے۔ صرف سرگوشیاں سی ہو رہی ہیں۔ ضرور دُکان کے مالک نے اندر کسی اہم بات کا انکشاف کیا ہے۔ میرا اشتیاق مجھے پھر اُکساتا ہے اور میں اندر جھانکنے کی چاہ میں پھر چلنے کی کوشش کرتا ہوں اور اس کوشش میں جانے کتنی بار میں پھسل کر مُنہ کے بل گرتا ہوں اور کتنے ہی لیبل میرے جسم پر چپک جاتے ہیں!

ـــــــ اب میرا سارا جسم لیبلوں سے ڈھک گیا ہے۔ میں لیبلوں کا مجسّمہ بن گیا ہوں۔ میری اپنی ملائم چکنی چمڑی کہیں نظر نہیں آ رہی ـــــــ

ـــــــ رِشی والمیکی لکھ رہے ہیں ـــــــ

ـــــــ "پرن کُٹیر میں مُرگ چرم پر بیٹھے بھگوان رام نے اپنی کھڑاؤں بھرت جی کو دیتے ہوئے ... ..."

دُکان کا مالک ایک اور آدمی کو ساتھ لئے ہال سے باہر آ رہا ہے۔ کونٹر کے قریب پہنچ کر وہ دونوں مجھے نہارتے ہیں۔ میری لیبلوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہیں۔ پھر دُکان کے مالک کے ہاتھ میری گردن پر آ کر رُک جاتے ہیں۔ وہ نہایت ہی احتیاط کے ساتھ میری گردن کے اِرد گرد ایسے ہاتھ پھیرتا ہے جیسے میرے سر کو الگ کر رہا ہو۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ دُکھ بھی نہیں ہوتا۔ اپنا آپ ایک دم ہلکا سا محسوس کرتا ہوں۔ لگتا ہے جیسے اب میں چل سکوں گا۔ ہال کے اندر داخل ہو سکوں گا۔ وہ جیب سے پالیتھلین کا ایک تھیلا نکال کر اُس میں کوئی گول سی چیز اس انداز سے رکھ دیتا ہے جیسے یہ کوئی بہت ہی قیمتی شئے ہو ـــــــ یہ شاید میرا ہی سر ہے۔ میں ٹھیک سے دیکھ

گھوما کیئے۔ یہ جان کر ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔ ہاں! تو کتنی دفعہ اُس آبشار کے مدھُر، رس بھرے اور شیتل اَن گنت سُروں کے ساتھ ایک ہم نے باہم محبت کی درد بھری داستان سُنائی۔ ایسے راحت فزا شیتل لمحے۔ میرا دِل بیٹھا جاتا ہے۔ لوگ کیا کہتے تھے، اُس کا کوئی خیال، ہم کیا کرتے تھے، اُس کی نہ کوئی پروا۔ بچپن کا معصوم جنوں، وہ دشتِ خود فراموشی کے چکّر، ڈھونڈے بھی وہ سماں کہاں مِل سکتا ہے۔ جوانی، دیوانی ہے۔ اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ میں بوڑھا ہو چُکا ہوں۔ میرا بدن مُضمحل ہو چُکا ہے۔ میں بالکل بے کار ہو چلا ہوں، یا خدا نخواستہ میرا اعصابی نظام چل بیٹھا ہے۔ میرے اعضا اگر شل ہو بھی جائیں، محبت کی شیتل یادیں مِٹ نہیں سکتیں۔ میرے بوڑھے ہونے سے میری آنکھوں کی تِرشنا دُور نہیں ہو سکتی۔ محبت کی راہیں بھلائی نہیں جا سکتیں۔ جب کبھی میری نظر کو دھوکا لگتا ہے یا مجھے مُغالطہ ہوتا ہے، میرے قدم رُک جاتے ہیں۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ کہیں "وہ" تو نہیں؟ سوالات میرے ہونٹوں پر آ آ کر رُک جاتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہ پوچھوں، ٹھہر تو ذرا۔ اپنا نام تو بتا؟ سراب، سراب ہی ہے، جہاں شرمندگی اور ندامت کے بغیر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ محبت بھی ایک سراب ہے، ایک مُغالطہ!

بہت دِنوں سے میں ایسی ہی پرچھائی کے پیچھے لٹّو ہو ہو کے بھاگ رہا ہوں۔ نظروں کا تانا بانا جوڑ رہا ہوں۔ وہ بھی چلی آتی ہے، اور میں بھی لچ لجا کر اپنی راہ لیتا ہوں۔ کئی دِنوں سے میں وقت پر گھر سے دفتر نکلتا اور واپس آتا ہوں تاکہ دُور ہی سے اُس کے درشن کروں اور نظروں، نظروں ہی سے آداب بجا لا کر چل دوں۔ دیوانگی! اسے کہے کون؟ —— بھولا پن۔ سُنے کون؟ —— چلتی ہوگی تو ڈوپٹے سے امرت بھری شراب کی، چھاتی کی کٹوریاں اس انداز سے ڈھانپ لے گی، جیسا کہ وہ کہنا چاہتی ہو کہ جی بھر کے دیکھ لے —— یاد رکھ! تمھارے دِل کے ارمان دِل ہی میں رہیں گے۔ سکندر بھی آبِ حیواں کی تمنّا لئے اس دُنیا سے چل بسا۔ دیوانے! میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ تمھاری

مُغالطہ

رُوسُل یونپُر

ملے! تو جگہ جگہ ۔۔۔ گھڑی گھڑی ۔ سوتے بھی، جاگتے بھی ۔ خواب میں بھی، بے خوابی میں بھی ۔ نا ملے! تو کہیں نہیں، کبھی نہیں ۔ اتھاہ بہانہ جو، زندگی کو بھی کسی رنگ میں نہ پا سکا ۔ یہیں کہیں، میری اور اُس کی آنکھیں چار ہوئی تھیں ۔ ہاں! یہیں کہیں ہماری مُڈ بھیڑ ہوئی تھی ۔ اسی دوراہے ۔ ہاں! اسی چوراہے پر میری سیمابی نظر اُس کے پیچھے پیچھے ہولی تھی ۔ یہیں میرا بھولا بھالا من نہ جانے کیوں متوالا ہوا تھا ۔ اسے روکوں بھی کیسے ۔ مُس مین چھایا کا دامن تھام تھام کر دیوانہ بنا دیا ۔ اسی موڑ پر، میرا ہاتھ تھام کر وہ مجھے دریا کے کنارے پر لے آئی تھی ۔ اسی جگہ پر "میں" اور "وہ" دِلستا یار ہوئے تھے ۔ کتنی بار کاندھے سے کاندھا ملائے ہم یہ دو قدم چلے ۔ کتنی دفعہ ہم نے اس درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں محبت کے چھلکتے جام لنڈھائے ۔ کتنی بار، مستانہ وار، چھپتے چھپاتے اس باغ میں

شاید شرماتی ہو گی! میں بھی کہنے کی جسارت نہیں کرتا۔ میرے بھی لب نہیں ہلتے۔ ممکن ہے کہ ایسا کبھی ہو، اور میں جرأتِ رندانہ کر بیٹھوں۔ ہو سکا تو کہہ دوں: "تیرے قربان! تیرے صدقے! تیرے روم روم پر واری!"

کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اُسی طرح دیوانہ وار.... کل کی دُلہن جیسی، ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائے، شباب کا نشیلا جوبن لیئے مجھ سے ملنے آئے اور میں اُسے گلے لگانے کے لئے آگے بڑھوں۔ کیا معلوم کہ میری ہی کسی بات سے اُس کے محبت بھرے کومل دِل کو ٹھیس پہنچی ہو۔ نہیں، وہ ایسا کبھی نہیں سوچے گی! وہ میری بہکی بہکی باتوں کی طرف کبھی نہیں جائے گی۔ اپنے ہاتھ سے اُس کا نازک نقرئی ہاتھ زور سے پکڑ کر میں اُسے اپنی ساری پریم کتھا سناؤں گا۔ میرا سارا وجود کانپ اُٹھے گا۔ میں بہک جاؤں گا۔ جذبات کی رَو میں بہہ جاؤں گا۔ سب کچھ کہہ کر بھی کچھ نہ کہہ پاؤں گا۔ اندر ہی اندر سے جیسے آتش فشانی لاوا کھولنے لگے گا۔ اپنے آپ کو بھول جاؤں گا۔ میں اُس کے بوسے لوں گا، اُس کا روم روم چوموں گا۔ ہونٹوں سے ہونٹ لگائے محبت کی میٹھی، امرت بھری، مدھ بھری آتشیں شراب پیتا رہوں گا۔ سب کچھ بھول جاؤں گا۔ اُسی کو.... بس اُسی کو زور سے "یوں" باہوں میں لے لوں گا کہ کوئی بھی ارمان تشنۂ تکمیل نہ رہے، کوئی کسک باقی نہ رہے——

"کیسے عجیب ہو تم۔ میری جان نکلا چاہتی ہے۔"

"..منّے کو ذرا اُس کروٹ سرکاؤ تو"

{ کشمیری سے ترجمہ: محمد احسن احسن }

زندگی، تمھاری عزّت رائیگاں جائے گی۔ لمبے گھونگھر والے بال رُخوں سے ذرا ہٹا کر، لاپروائی سے کاندھوں پر سے شانوں کی طرف سنبھال کے رکھے گی اور امری سیب جیسے سُرخ گال اچھّی طرح نمایاں کر کے کہے گی کہ چل جا! لیکن زُلفوں کی گھنی چھاؤں میں نہیں لے لوں گی۔ چلیے تو میرے ارمانوں کے شیش محل چکنا چُور ہوں گے۔ کسی کو یُوں ہی دل دے بیٹھنا بھی کتنا پیارا اور سُندر ہے! آدمی کے قدم، کہاں نہیں ڈگمگاتے۔ نظریں کہاں نہیں بھٹکتیں!

وہ دو دن سے نظر نہیں آرہی ہے۔ یہ راہیں مجھے ویران سی لگتی ہیں۔ کیا معلوم کس حال میں ہوگی! خیریت تو ہے۔ یا شاید اُس نے راستہ ہی بدل دیا ہو؟ کسی اور گلی سے جاتی ہوگی؟ شاید کسی دوسری جگہ تبدیل ہوگئی ہو؟ کیا معلوم کہ اُسے ملازمت ہی سے برطرف کر دیا گیا ہو؟ ——— کس بات کا یقین کریں!

کیا سادھا کٹ بنایا ہے! قد بھی بالکل وہی۔ چہرے بُشرے سے ذرا پتلی لیکن چال ڈھال بالکل ویسی ہی ——— چنچلتا بھی وہی ——— ہنسے! جیسے گھٹاؤں کے دامن میں بجلی چمکے ——— نہ معلوم کس صنّاعِ بے مثال نے موتی جیسے چمکتے دانتوں کی دو لڑیاں جوڑ کے رکھی ہیں کہ دیکھ دیکھ کے بھی جی نہ بھر جائے ——— کئی بار سوچا کر پُوچھوں "یہ تو بتاؤ کہ تو ہنستی کیوں ہے، تجھے ہنسی کیوں آتی ہے؟" اگر کہے کہ تُو کون لگتا ہے میرا، تیرا میرا کیا کام؟ تو میری کیا گت بنے گی، میری حالت تو غیر ہو جائے گی ——— دیکھا جائے تو اصل میں میرا ہی دل بہلاتی ہے۔ یا شاید میرے ہی بھولے پن سے کھیلتی ہو ——— بے چارا! بھولا بھالا! عقل سے گیا گُزرا۔ بھٹکتا ہے تو بھٹکنے دے۔ میرا بھی کیا بگڑتا ہے۔" موتی جیسے دانتوں کی چمکتی لڑیاں ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رقصاں ہوتی ہیں ——— میرے دل میں ایک ہُوک سی اُٹھتی ہے۔ میرے بس میں ہوتا، تو میں اسے ضرور رام کر لیتا۔"

مالیت کا ساماں بھی تیار ہوتا ہے۔ سدھودھن کا خیال ہے کہ گوتم ان ملوں کا انتظام سنبھالے گا۔ وہ پروپرائیٹر بن جائے گا۔ اور جمشید نگر کے ساتھ ہی گوتم نگر کی بستی بسائے گا۔ ورنہ گوتم ہریجن بستی سے الیکشن میں کھڑا ہو جائے گا اور بعد میں منسٹر بن جائے گا۔ مگر دونوں منصوبے ادھورے کے ادھورے رہے۔ تالابندی کی وجہ سے ملیں بند ہو گئیں۔ اور ہریجنوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی برادری میں سے ہی کسی بھائی کو الیکشن کے لئے نامزد کریں گے۔ سدھودھن کوشش کئے جا رہا ہے۔ گوتم یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے وہ محلّے سے باہر آ گیا اور مٹرگشت کرنے لگا۔ پلنگ پر لیٹی یشودروازے کی اور ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے۔

گوتم کب لوٹ کر آئے گا۔ گوتم برابر آگے بڑھ رہا ہے۔ آفتاب کی تمازت میں دھیرے دھیرے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ گوتم کا جما ہوا پارہ بکھر رہا ہے۔ وہ چلے جا رہا ہے؛ اپنے گرد و پیش کو مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے۔

چھک ... چھک ... چھک ... چھک .....

یہ ریلوے سٹیشن ہے۔ کھچا کھچ بھری ہوئی ریلوں کا آنا جانا جاری ہے۔ بے شمار سائے ادھر ادھر رینگ رہے ہیں۔ کچھ ادھر ـــــ کچھ ادھر۔ لگتا ہے کہ کچھ سن سے ہو گئے ہیں۔ اُف، شور ... ... کتنا شور ہے۔ گوتم کے کان بہرے ہو گئے ... ...

دو سائے فسٹ کلاس کے ڈبے سے نکل آئے۔ پلیٹ فارم پر لنچ کیا ... ... روٹی کے ٹکڑے، کیلوں کے چھلکے اور آٹھ دس چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کو اٹھا کر نزدیک والی نالی میں پھینک دیا ... ... چالیس پچاس سائے ـــــــ ننگے بدن اور ننگے سر۔ کچھ چھوٹے، کچھ بڑے غلاظت کو پھیٹنے لگے۔ ایک دوسرے کو پسپا کر کے کیچڑ سے لت پت کیلے کے چھلکوں اور روٹی کے ٹکڑوں سے اپنا پیٹ بھرنے لگے۔ فسٹ کلاس سے نکلی ہوئی جوڑی ہنس رہی ہے۔ گوتم کا پارہ جم گیا۔ وہ سکتے میں آ گیا۔ اس نے آہ بھری؛

نروان

اوتار کرشن رہبر

وہ ... وہ ... وہ ... جسے شاید گوتم کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ کولتار بچھی ہوئی لمبی اور کشادہ سڑک کے بیچوں بیچ چل پڑا ... ... کالا بھجنگ کولتار۔ سڑک کولتار میں پگھل گئی تھی۔ اس کی پگھلی ہوئی چاندی میں ابال آگیا۔ اس کی باچھوں سے دودھ ٹپکنے لگا۔ وہ تیز تیز چلنے لگا اس بھارت ورش میں۔ وہ اپنے گرد و پیش کو گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس کی چاندی میں ایک کے بعد ایک ابال آرہا ہے۔ اس کے سیمابی من کی بے تابی برابر بڑھتی جارہی ہے۔

اس کا باپ سدرشن یا سدھودھن — خیر کوئی بھی نام ہو اس کا۔ خاصا دولت مند ہے۔ وہ ایک دو بڑی ملوں کا مالک ہے۔ جہاں دن بھر دھوئیں کے سمندر مرغولوں کی صورت میں نکلتے رہتے ہیں۔ دھوئیں کے ساتھ ہی روزانہ لاکھوں کروڑوں روپے کی

وہ ایمپلائمنٹ ایکس چینج کے دفتر کے نزدیک جا پہنچا۔ کتنے ہی قدم یک جا تھے۔ لاانتہا تھکے ماندے قدم۔ بنا پالش کے بوٹ۔ اپنے آپ کو رجسٹر کروا رہے تھے! ہاتھوں میں ڈگریاں لیے ہوئے۔ بال ایسے، جیسے خود رو جنگل۔ دل پتھروں کی طرح بھاری، روح ٹمٹماتے ہوئے چراغ ——— اداس اور بے رونق چہرے۔ اس نے ایک آہ بھرلی۔ غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے پھسل پڑا ہے۔ "یہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔" اس نے اپنے تھکے ماندے قدم آگے بڑھا دیئے۔ اس کے اندر کا سارا ایکھ پگھل کر رہ گیا۔ وہ محل کو بھول گیا۔ لیکن یشو کی پیالوں جیسی سرمئی آنکھیں اس کے من کی زنجیروں کو مقناطیس کی طرح اپنی اور کھینچ رہی تھیں۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کہاں جائے گا وہ؟ دائیں یا بائیں، آگے یا پیچھے؟ وہ مبہوت سا ہو گیا۔

. . . . یشو اسے پاس بلا رہی ہے۔ دل کو لبھانے والی سندر یشو ——— چھتر چھایا ——— یشو، جو اس کے بغیر ایک لقمہ بھی حلق سے اتار نہیں سکتی!

اس نے اپنا رخ محل کی طرف موڑ دیا۔ یشو کے ریشمی بالوں کا طواف کرنے کے لئے ——— ان کی خوشبو کو چکھنے اور اس کی خوشی میں اپنا سب کچھ جذب کرنے کے لئے ——— تاکہ گھڑی بھر کے لئے وہ اپنے آپ کو بھول سکے۔ گوتم چلتا اور چلتے جا رہا ہے۔ لمبی اور کشادہ کول تار بچھی ہوئی سڑک کے بیچوں بیچ۔ وہ ایک ڈسپنسری کے پاس پہنچا ——— ایک بچہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ جانے اسے کیا ہو گیا ہے ——— اس کی ماں مر تو نہیں گئی ہے؟ نہیں . . . . نہیں۔ ماں ہی تو اسے گود میں اٹھائے ہوئے ہے . . . . پھر کیا معاملہ ہے؟ اے ماتا جی، دودھ جو مانگ رہا ہے۔ کیوں گھونٹ بھر اسے پلا نہیں دیتی . . . .

"بھائی صاحب، آپ نے میرے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔" اس نے واپس کہا ——— "چھاتیوں میں دودھ ہونا بھی چاہیئے تھا!"

گوتم نے ایک نظر بچے اور دوسری نظر اس کی ماں پر ڈالی۔ ڈاکٹر، جو ایک اور مریض

"یہ سنسار دُکھوں کا گھر ہے۔" وہ کہنے لگا اور آگے روانہ ہوا۔

فسٹ کلاس میں بیٹھی ہوئی جوڑی ابھی بھی اُس کے من ہی من میں ہنس رہی تھی،

شاید ابھی ان کی شادی کو زیادہ دِن نہیں ہوئے تھے۔ اُسے لیشو یاد آ گئی۔ لیشو، جسے

اُس کے بغیر لمحہ بھر بھی چین نہیں آتا تھا۔

"لیشو راہ دیکھ رہی ہوگی۔" وہ سوچنے لگا۔ مگر یکایک اُس کی نظر ایک اُدھیڑ عُمر کے

انسان پر جا کر ٹھہری۔ نیلامی کوٹ، پاؤں میں گھسا پِٹا فلیٹ اور کریز کے بغیر پتلون

پہنے۔ یہ کیوں پاگل سا ہے؟ گوتم کے ذہن میں ایک سوال اُبھر آیا۔ وہ نزدیک سرک گیا۔

"ارے بھئی، اِسے کیا ہوا ہے؟" گوتم نے نزدیک کھڑے ایک شخص سے پوچھا۔

"یہ خودکشی کرنا چاہتا تھا۔" اُس نے جواب دیا۔

"پھر؟"

"مر نہیں گیا۔"

"کیوں مرا نہیں؟"

"اب تک تین بار زہر کھا چکا ہے۔"

"سچ!"

"پھر کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" اُس نے غصّے ہو کر کہا۔

گوتم کی بدھی جواب دے گئی۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھا۔ ایک بار پھر اُس نے سوال کیا:

"آخر معاملہ کیا ہے؟"

"بھائی صاحب یہی" وہ بول پڑا۔ "خالص زہر تو بازار میں ملنا بھی چاہیے۔"

گوتم نے آہ بھر لی۔ دم گھُٹ گیا اور کہنے لگا:

"یہ سنسار دُکھوں کا گھر ہے۔"

اُس کی آنکھوں کی روشنی دھیمی پڑ گئی اور آگے چل پڑا۔

وہ چل پڑا ــــ مگر اب اُس کے قدم محل کی طرف نہیں جا رہے تھے بلکہ مخالف سمت میں۔ تیز تیز اور نپے تلے قدم۔ آگے جاتے ہوئے، وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ کیا یشو اُس کے جگر کے ٹکڑے کو دُودھ پلائے گی؟ بجھے ہوئے چہرے کو ساتھ لئے وہ چلتا گیا۔ سڑک پر پھیلے ہوئے کول تار کو روندتا اور مروڑتا ہوا۔ ــ اپنے من کی چاندی کو گھلاتا ہوا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے دُور ایک پیڑ اُبھر آیا۔ بڑا اور تنا ور پیڑ۔ مگر اندر سے کھوکھلا۔ اُس کے من میں آیا کہ وہ تھوڑی دیر پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ستائے، بہت دِنوں سے وہ آنکھ بھی جھپک نہ سکا تھا۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔ یشو کی پیالوں جیسی آنکھیں اُس کے سیمابی من کو مرکوز ہونے نہیں دیتیں۔ سائیکل کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

"تار والا ــ" وہ خوش ہو گیا۔ "یشو دھرا کا تار"

اُس نے جھٹ پٹ تار کو کھولا اور توقف کئے بغیر پڑھنے لگا۔ وہ پڑھتا گیا ــــ

"ڈیر گوتم۔ جُگ جُگ جیو۔"

بھگوان کرے تمھارا مشن کامیاب ہو جائے۔ میرا ذرّہ بھر فکر نہ کرنا۔ میں نے مِل کے مینجر کے ساتھ بیاہ رچا لیا ہے۔"

تار گوتم کے ہاتھوں سے پھسل پڑا۔ اُس نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں اور تپسیا میں محو ہونے کی کوشش کی۔

تار والے نے سائیکل کو پیڈل مارا۔ سائیکل کے پہیئے لمبی اور کشادہ سڑک پر تیزی کے ساتھ گھومنے لگے اور پگھلے ہوئے کول تار پر دو سانپوں کے نشان دُور تک بڑھتے گئے۔

ــــــــ {کشمیری سے ترجمہ: موتی لال ساقی}

کا معائنہ کر رہا تھا، اُس نے گوتم پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔ گوتم ڈاکٹر کا مُنہ تکنے لگا۔

"بڑا بھولا بھالا لگتا ہے تُو۔" ڈاکٹر نے گوتم پر ترس کھاتے ہوئے کہا اور اپنے پیچھے شلف سے ایک جرنل نکال لیا۔

"غور سے دیکھ!" ڈاکٹر نے جرنل کو کھولتے ہوئے گوتم سے کہا — "اس ماں کو بھی غور سے دیکھ!"

"بڑی بھاری بھرکم اور طاقت ور ہے۔" گوتم نے خوش ہو کر کہا۔

"مگر کیا تم نے اس بچّے کو دیکھا... ؟"

"دیکھ تو رہا ہوں — یہ رو کیوں رہا ہے؟ ماں اس کو چھاتی کیوں نہیں دیتی؟" گوتم کے دل پر آرے جیسے چلنے لگے۔ وہ پوچھ بیٹھا — "اس کی چھاتیاں تو دُودھ سے بھری پڑی ہیں۔"

"ہاہاہاہاہا... ... ڈاکٹر کھِل کھِلا کر ہنس پڑا۔

"میں نے یُوں ہی نہیں کہا — بڑا بھولا بھالا لگتا ہے تُو۔"

"بتاؤ نا بھئی، ماں اسے چھاتی کیوں نہیں دیتی؟" گوتم نے لاچار ہو کر پوچھا۔

"کیسے چھاتی دے گی اسے؟ اس کے دُودھ میں تو زہر کی آلائش ہے۔"

"زہر؟"

"بالکل!"

"وہ کیسے ... ... ماں کا دُودھ بھلا زہر ہو سکتا ہے؟ نہیں۔ نہیں —" گوتم بڑبڑایا ——

ڈاکٹر نے ڈی، ڈی، ٹی پر نظر ڈالی۔ اور بیمار کا معائنہ کرنے لگا۔

گوتم نے آہ بھرلی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ بے تحاشا وہ کہہ اُٹھا:

"یہ سنسار دُکھوں کا گھر ہے!"

تھک ہار کر اُنھوں نے مشورہ کیا۔ بڑا پنچ لگا۔ ایک والنٹیئر آن نکلا۔ اُس نے اُونی پھرن پہن لیا۔ پاؤں میں کھڑاؤں ڈالی۔ دائیں ہاتھ میں عصا تھاما۔ بائیں ہاتھ میں چراغ لیا۔ گلے میں منکوں کی مالا ڈالی اور دوسرے دن برفیلے پہاڑوں کے اُس پار جا پہنچا ——— رستے میں اُس نے ایک دو منزلہ قلعہ دیکھا جس میں نہ کہیں کوئی دروازہ تھا اور نہ اندر جانے کا اور کوئی راستہ۔ وہ قلعہ کے اِردگرد گھومتا رہا اور آخر مایوس ہوکر گم سُم بیٹھا رہا۔ کرنا خدا کا کہ ایک پاسبان نمودار ہوا۔ اُس نے جب درویش صورت ایک آدمی، اُونی کپڑے زیبِ تن کئے سراسیمگی کی حالت میں دیکھا تو وہ ہکّا بکّا رہ گیا۔ اُس نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ تلوار میان میں رکھ دی اور اُسے پوچھ تاچھ کرنے لگا۔ صوفی صورت آدمی نے سب روداد بتائی۔ پاسبان کو اُس کی حالت پر رحم آیا۔ یا یوں کہیئے کہ اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ وہ اُٹھا اور اُسے تسلّی دے کر اصلی دروازے سے سردار کے پاس پہنچانا۔

سردار چوکی پر گاؤ تکیے سے پیٹھ لگائے بیٹھا حُقّہ پی رہا تھا۔ وہ رشیم خانے کے بوائلر (Boiler) کی طرح بڑی بڑی مونچھوں تلے تمباکو کے لمبے لمبے کش لگا کر فضا میں دھوئیں کے مرغولے بکھیر رہا تھا۔ وہ سر پر طِلائی ٹوپی پہنے اُس پر زرق برق سفید کپڑے کا تھان تہہ در تہہ باندھے، ماتھے پر بُلبُل کا سا پَروں کا پُھندنا پھیلائے بڑی آن بان سے اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ سردار کے گِرداگِرد نَو درباری، بالکل ایسے بیٹھے تھے جیسے سُورج کے گِرد زمین، چاند اور تارے ہوں۔ دوران ہی میں سے ایک درباری سردار سے ہنسی مذاق کر رہا تھا تو دوسرے درباری اُس کی فہم و فراست کی داد دے دے کر خوب ہنستے تھے۔

اندر آتے ہوئے جب سردار کی نظر صوفی منش آدمی پر پڑی، وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے اپنی دائیں جانب بٹھایا۔ کہتے ہیں کہ سردار نے آج تک کسی کی اتنی آؤبھگت نہیں کی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ سردار صوفی کیش آدمی کی ماں کے حُسن و جمال کا چرچا بہت پہلے سُن چکا تھا۔ اُسے یہ بھی دعویٰ تھا کہ اُس کا کوئی جدِ امجد

فلمی ٹریلر

بشیر اختر

بات زیرِ جبیں سجدہ گاہ رکھنے کی تھی اور نا ہی سوال تھا اس بات کا کہ گھوڑ سوار پر تلوار سے وار کرنے والے کو سزائے موت ملنی چاہیئے یا یہ کہ اُسے کالک لگا کر بازار میں گھما کر ذلیل کیا جائے۔ بہر حال اسی بہانے اُنھوں نے اُسے ماں کی گود میں سے گھسیٹ کر نیچے لایا اور اُس کی خوب خبر لی۔

اُس کے بعد جو بھی ماں کی آغوش میں رہا، وہ اپنوں کے ہی بیر کا شکار ہوا۔ اُسے بدنام کیا گیا کہ وہ کسی پرائی عورت کی اپسرائی، سحر انگیز آواز پہ جان دیتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے کہرام مچ گیا۔ کھوپڑیوں کے انبار لگ گئے۔ بڑے بڑے محل ڈھہ گئے۔ لوگوں کا جمِ غفیر دوڑ چلا اور اُس کی ٹانگیں کھینچنے لگا۔ وہ ماں کا لال بھی سخت جان نکلا۔ اُنھوں نے لاکھ جتن کئے۔ لیکن اُس کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی۔

چلی سبھی لوگوں نے سردار کے پاؤں پکڑے، سردار نے ایک نہ مانی۔ اس نے ساری سرداری بالائے طاق رکھی اور اسے زمین پر دراز کر دیا۔

اس دن اس نے پہلی بار پرائے مرد کو دیکھا۔

۲

ادنیٰ پیرہن زیبِ تن کئے، چوپارہ ٹوپی والا اسٹیج پر آیا۔ اس نے بڑے فخر و ناز سے قاصہ کا تعارف سامعین سے کرایا۔ اور شو شروع ہوا۔

فرہاد پر بنائی گئی اسلام آبادی بھرکی اگر زور سے ٹن مائیک ٹیبل پر چلائی جائے، وہ کیسی ناچے؟ اسی انداز سے وہ دھومانی، جوبن پہ آئی، جوانی پروانہ دار، رقص کناں عقبی دروازے سے ہال میں داخل ہوئی۔ اور دو چار گت بھر کر گورے چٹے، فرہنگی ٹوپی والے کی گود میں جا گھسی، فرہنگی ٹوپی والے نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور اس کا مرالیش ٹرے میں دبوچ لیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس کے بٹن ایک ایک کر کے کھول دیئے۔

یہاں تک فرہنگی ٹوپی والے کی دائیں جانب گوسائیں لباس پہنے ایک پیر مرد بیٹھا۔ یہ سب کچھ صبر و ضبط سے دیکھ رہا تھا۔ بٹن کھولنے کے اس کی نظروں نے جو کچھ دیکھا، اسے اس کے اوسان خطا ہوئے، وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور دوڑتا چلا آیا۔ گوسائیں کھدر پہنے پیر مرد کے اس کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی چوپارہ ٹوپی والے کے اشارہ سے وہ فرہنگی ٹوپی والے کی گود سے نیچے اتر آئی۔ اور اس جانب بیٹھے ہوئے سبز عمامہ باندھے ہوئے آدمی کی اور میز پر ہی سے اپنی ٹانگ لپاری۔ سبز پگڑی والے نے اس کا پیٹی کوٹ اوپر سرکایا۔ پھر اس نے اس کی ٹانگوں سے سیاہ نائیلان موزے ایسے اتارے جیسے کوئی قصاب مذبوح بھیڑ کی کھال اتارے، وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور بھری بھری گوری ٹانگوں کی نمائش کرنے لگی۔ پھر بھرے ہال میں آ کر دراز ہوئی!

اتنے میں گوسائیں کھدر پہنے پیر مرد کو موقعہ ہاتھ آیا۔ اس نے ذرا جھجک کر کسی کی پرواہ کئے بغیر چیل کی مانند، جھپٹا مارا اور اس کا پیٹی کوٹ بھی کام یابی سے اتار دیا۔

بھی کبھی دن اُس کی گود میں بیٹھا تھا۔ اُسے فقط حقِ شفعہ جتلانا نہیں آتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اُس کے بچّوں سے ڈرتا تھا۔ اُن کی فطرت تھی بھی بڑی عجیب۔ ابھی وہ باہم سر قلم کرتے اور ایک دوسرے کو جی بھر کر گالیاں دیتے۔ مگر جوں ہی اُنھیں کسی غیر کی پرچھائی نظر آتی، وہ یک آواز ہو کر اُس کا پیچھا کرتے اور جب تک دم نہ لیتے، جب تک نہ اُسے برفیلے پہاڑوں سے پرے ایسے بھگا دیتے کہ وہ لوٹ کر آنے کا نام بھی نہ لیتا!

آج جب سردار نے اُنھیں خود ہی کتّوں کی طرح دُم ہلاتے دیکھا تو اُسے اپنے بھاگ جاگتے دکھائی دیئے۔ عہد و پیماں باندھ کر سردار ہاتھی پر سوار ہوا۔ صوفی کیش آدمی نے دیّا جلایا اور اُس کے آگے آگے راستے کی سربلند چوٹیاں منوّر کرتا ہوا آگے بڑھا۔ سردار ہتھیار بند تھا۔ اُس نے سارا راستہ اپنے ہتھیار آزماتے ہوئے طے کیا۔ سربلند چوٹیوں کے درمیان خلیج کو وسیع کرتا اور کھائیوں کو برابر کرتا ہوا وہ آگے بڑھتا گیا۔ برفیلے کوہساروں کے آس پاس اُس نے ادرہی عالم پایا۔ سبھی اُس کے قدم چومتے۔ وہ انتظار کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ وہ ہانپ رہے تھے، لیکن ماں کی آغوش سے آج کا لاڈلا بیٹا چھین لینے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

سردار نے اُس پر دُور ہی سے نظر ڈالی۔ ایک ایک کر کے سب سے اُس کا حال دریافت کیا۔ جب اُس نے جان لیا کہ زور بازو اب کے چلنے والا نہیں، اُس نے ایک اور ترکیب نکالی۔ نہ معلوم اُس کا کون سا فسوں اُس پر کام کر گیا کہ وہ خود ہی ماں کی گود سے نیچے آیا۔ سردار نے اُسے زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اُسے دُور کسی صحرا میں بھیج دیا۔ کہتے ہیں کہ وہ پیاس کے مارے پانی کی ایک ایک بوند کو ترستا ہوا دم توڑ بیٹھا۔

سردار نے جب اطمینان کا سانس لیکر اُس کی ماں پر بھرپور نظر ڈالی۔ تو اُس پر شیطان کا غلبہ ہوا۔ ماں تھی بھی ایسی ہی۔ وہ! وہ کہتے ہیں نا کسی کو سندر کامنی صورت، موہنی مورت، پری رو، پری رخسار، بس سے شدید طور مضمحل بیمار کی نظر بھی اگر اُس کی جانب اُٹھے تو اُس کی گئی جوانی بھی لوٹ کر آ جائے، وہ سردار جو ٹھہرا، وہ اُس کے بے مثال حُسن و جمال کے آگے ٹھہرنے کی تاب کیسے لاتا۔ وہ اُس پر جھپٹ پڑا، اُس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، مگر کچھ نہ

میں، تاریکی اور پیاس

غلام نبی شاکر

ایک اجنبی گھر میں، جہاں مجھے کسی چیز کی پہچان نہیں، میں اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ خشک زبان اور تاریکی میں ڈوبا ہوا سب کچھ مجھے سوچنے کا احساس دلاتا ہے اور میری پیاس بڑھ جاتی ہے۔ اس تاریکی کے سینے میں، میرے ہونٹ کچھ تلاش کر رہے ہیں ——— لیکن میں ہوں کہ میرے ہاتھ کچھ بھی آتا نہیں!

"پیاس" ——— یہ لفظ میرے عمیق گہرے تہہ خانے سے اُبھرتا ہے اور معلوم نہیں میری کتنی نازک ترین خواہش کا اظہار کرتا ہے ——— لیکن تاریکی ——— یہ لفظ اور میری خواہش دونوں تاریکی کے سمندر میں کھو جاتے ہیں۔

میں پھر کچھ سوچنے لگتا ہوں۔

میں ——— کوئی ہوں ——— گہری تاریکی دیکھ کر مجھے اپنے وجود پر شک سا

ہر طرف تالیاں بجیں۔ فرش پر بچھائے مخملی قالین پر سرکاری ضرب کے کورے کورے کاغذی ورق ڈھیر ہوئے۔

چوپارہ ٹوپی والا دروازے پر کھڑا تھا۔ اُس کی نظریں جب سرکاری ضرب والے کاغذی اوراق پر پڑیں۔ وہ کھڑاؤں دروازے پر چھوڑے، پھرن کے آستین چڑھائے، صاحب سلام کئے اندر آیا۔ پھر اُس نے سرکاری ضرب والے کاغذ کے سبھی کورے کورے ٹکڑے سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر دیئے۔

رفتہ رفتہ سب ہانپنے لگے، رقاصہ حد سے زیادہ ناچنے کی وجہ سے، چوپارہ ٹوپی والا کورے کورے کاغذ کے ٹکڑے سمیٹے اور ایک میز چھوڑ کر دوسرا سونگھتے سونگھتے، باقی لوگ اُس وقت جب رقاصہ کمر لپیارے گئی اور گوسائیں کھدر والے نے بغلوں کے تلے انگیا کے ہک ڈھیلے کر دیئے اور چودھویں کے چاند کے مکھڑے سے بادل کی آخری پرچھائی بھی ہٹائی۔

اُس نے انگیا کے دونوں کٹورے، دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر چھاتی سے لگائے اور سبھی لوگوں کے سامنے سے گذری، ناچتے ناچتے انگیا کے سفید ٹکڑے اُس کی چھاتیوں کو احمد بازی گار[1] کی ڈفالی کی طرح بجانے لگے۔

ہال کے بالکل درمیان پہنچکر اُس نے چھاتیوں سے دونوں ہاتھ اُٹھا لیے، اور پھر بجلی کے سبھی قمقمے گُل کر دیئے گئے۔

(کشمیری سے ترجمہ: رسول پونپر)

---

[1] ایک مشہور اور کامیاب کشمیری شعبدہ باز کا نام!

—— پیاس ابھی بھی پیاس ہے اور تاریکی بدستور اپنا بھیانک جال پھیلائے ہوئی ہے۔

تاریکی کے بھنور میں دھیرے دھیرے اپنے وجود کے احساس سے فنا ہو کر میں تاریکی میں کھو جاتا ہوں —— بے حساب تاریکی —— لامحدود تاریکی۔

اے کاش، یہی تاریکی، میری پیاس بجھانے کا سامان ہوتی ——! میں اپنے شعور کے خزانے سے نکلے ہوئے لفظ تلاش کر رہا ہوں —— لیکن مجھے کہیں بھی لفظوں کے معنیٰ نہیں ملتے ——

پیاس —— میں —— یعنی میرا تن و توش اور یہ تاریکی —— میں ایک بھیانک، دائرے میں پھنس چکا ہوں۔

تاریکی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے —— یہ پیاس ہی تو ہے جس نے مجھے تاریکی سے واقف کرایا اور تاریکی مجھے میرے وجود کا احساس دلاتی ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں اور اپنے وجود کو میں اپنی مٹھی میں محسوس کرتا ہوں —— میں کوئی ہوں —— کون؟ مجھے یہ علم نہیں، اور شاید مجھے یہ کبھی بھی معلوم نہیں ہوگا کہ میں کون ہوں —— ایک وجود —— یا اس وجود کے پیچھے اور کوئی ——

میں وہی ہوں، جسے پیاس ہے —— میں وہی ہوں جو تاریکی کے بھنور میں پھنس چکا ہے۔ یعنی تاریکی اور تاریکی میں تاریکی —— بس بس، میں یہی کچھ ہوں —— یعنی ایک پیاس ——

اے کاش! یہی تاریکی، میری پیاس بجھانے کے لئے پانی ہوتی —— میں رات کے شوخ سینے کو چوستا ہوں۔ چوستا ہوں اور میرے پیاسے ہونٹ تشنگی کے زخم سہلا رہے ہیں —— اس لمحے میں، میں اپنی یادوں کے بھرے بھرے خزانے کی اوٹ میں بیٹھے پانی کا تصور کرتا ہوں۔ "پیاس" —— تاریکی میرے اس تصور کو یکایک گھیر لیتی ہے، اور میں

ہوتا ہے۔ (ہو سکتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں) صرف تاریکی ہے ــــــــ میں اپنا وجود تلاش کرتا ہوں۔ لیکن مجھے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا ــــــــ صرف تاریکی میرے گرد اپنے سیاہ اور بھیانک، پر پھیلائے ہوئی ہے۔

تاریکی ــــــــ میرا وجود کھو جاتا ہے ــــــــ اب میں سوچتا ہوں کہ یہ تاریکی کیا ہے؟ تاریکی تو تاریکی ہے، اِسے اور کیا نام دیا جا سکتا۔ یہ تاریکی ہے جو میرے گرد اپنا بھیانک جال پھیلائے ہوئی ہے۔

جب تاریکی تھی تو اُس وقت میرا کوئی وجود نہیں تھا۔ کیونکہ اُس وقت میں خود تاریکی تھا۔ یا یہ کہ اُس وقت میں تاریکی میں ایک احساس تھا۔ ورنہ تاریکی نے میرے گرد اپنا لامحدود جال پھیلایا ہے۔

اب میں تاریکی میں گھرا ہوا ہوں۔ لیکن تاریکی سے الگ، میرے ہونٹ جل رہے ہیں۔ میرے بدن سے شعلے اُٹھ رہے ہیں ــــــــ مجھے پانی چاہیے ــــــــ

دائیں بائیں دیکھ کر میں اپنے بازو اِدھر اُدھر ہلاتا ہوں ــــــــ اجنبی گھر میں پیاس ــــــــ میں کس سے کہوں؟ میں نے محسوس کیا کہ میرے سبھی حواس اپنی اپنی جگہ پانی کی تلاش میں ہیں۔

میری آنکھیں تاریکی میں اُٹھتی ہوئی لہروں کے سیمیں بدن سے محظوظ ہو رہی تھیں ــــــــ میرے کان پھوٹتے ہوئے چشموں کے شوخ نغمے سُن رہے تھے ــــــــ

میری ناک پانی کی جانی پہچانی بُو محسوس کر رہی تھی اور میرے ہونٹ رات کے سیاہ سیاہ سینے کو چوس رہے تھے۔

مجھے یہ احساس ابھی بھی ہتھوڑے برسا رہا تھا کہ میں ایک اجنبی گھر میں ہوں۔ پیاس کا لفظ، جو میرے شعور سے ہی ابھرا، وہ میرے احساس کی ڈھکی چھپی خواہش کا اظہار کر رہا ہے ــــــــ اے کاش! یہ سب کچھ سوچنے سے میری پیاس بجھ جاتی۔

میرے کانوں کی تاریکی، چشمے پھوٹنے کی صداؤں کا سوز بن کر مجھے بیدار کرتی ہے۔

—— میری آنکھوں کی تاریکی مجھے پانی کا تصور دلاتی ہے۔

میں تاریکی میں بازو ہلاتا ہوں —— اور اپنی ساری قوت سے بہتے ہوئے پانی

کا تصور کر کے تاریکی کی زنجیریں توڑتا ہوں۔

—————— {کشمیری سے ترجمہ: شمس الدین شمیم}

شاید مجھے کچھ محسوس ہوتا ہے ——— میں تاریکی کے جال سے کچھ لمحوں کے لئے جیسے باہر آتا ہوں اور رات کے سینے میں میرے کان چشمہ پھوٹنے کے مدھم مدھم گیت سُنتے ہیں ———

میری پلکیں بوجھل ہو جاتی ہیں ——— میں اپنے وجود کی ساری قوت کان میں جمع کرتا ہوں ——— میں نے کبھی سُنا ہے کہ یہ نغمہ، معلوم نہیں کتنی ساری کہانیوں کی یاد دلاتا ہے ——— کان میں پانی پھوٹنے کی آواز اور اس کے ساتھ ساتھ میرے کانوں میں ایک غیبی آواز گونجتی ہے ——— جیسے یہ پیاسا، تاریکی کے سمندر میں پانی کا طلب گار ہے!

تاریکی کے سمندر میں پانی کی تمنّا ——— یہ ایک ناپختہ تمنا ہے۔ میں اپنے آپ کو تنبیہہ کرتا ہوں ———

لیکن میرے وجود سے شعلے لپک اُٹھتے ہیں اور مجھے ادھ جلا کرتے ہیں ———

میں اپنی زبان خشک ہونٹوں پہ پھیر لیتا ہوں۔

پیاس ——— اے کاش ———!

تاریکی میرا گلا گھونٹ دیتی ہے ——— وہ میرے کانوں میں گھستی ہے، میری آنکھوں میں اپنی جگہ تلاش کرتی ہے۔

میں تاریکی میں اندھا، بہرہ اور گونگا بن کر کچھ دیکھنے کی سعی کرتا ہوں ———

میری آنکھیں تاریکی ہیں، میرے کان تاریکی ہیں، میری زبان تاریکی ہے ———

میرا سارا وجود تاریکی ہے ——— میں تاریکی میں ہوں اور تاریکی مجھ میں ہے ——— کیا معلوم کتنا وقت گذرا؟

میں نے پیاس محسوس کی ———

گلاس البم پر گرا۔ اُس نے البم کی گیلی تصویریں اپنے "پھیرن" کی آستین سے خشک کیں،

"ہُونہہ ——— یہ کیا؟ ان پر بھی تو جیسے نیل پڑ گئے۔"

"یہ آئینہ بھی تو دُھندلا سا گیا۔"

وہ بے قرار ہوا اُٹھا اور کچھ سوچنے لگا۔ اُسے اپنے سینے پر منوں بوجھ لگا۔ وہ یُوں ہی دفعتاً اپنے کمرے سے باہر نکل آیا اور رسوئی میں آ گیا۔

کمرے میں سبھی گھر والے اپنے ٹھٹھرے بدن، بے رُوح کانگڑیوں سے گرم کر رہے تھے۔ کمرے کا سکوت اُسے کھانے کو دوڑا۔ اور اُس کی بے قراری میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ چُپ کا یہ صحرا شہر کے بارونق بازار میں بدل جائے!

"یہ خطرناک بیماری ہے۔ اس سے کوئی کوئی ہی بچ نکل آتا ہے۔"

"میرے نصیب پھُوٹے ——— میرا سر تاج گیا۔ مجھے جُل دے گیا۔"

"تم سب کیوں چُپ ہو۔۔ سردی تو نہیں لگتی تمھیں؟"

میں کہوں ——— "بچا کیا ہے؟"

"بابا چلا گیا ——— مجھے ایسا لگتا ہے ہم اور بھی کنگال ہو گئے۔"

"ٹھیک کہتے ہو تُم ——— بالکل سچ۔۔ بابا گیا اور اپنے ساتھ سب کچھ لے گیا۔"

"میرا تو اُس کے بنا یہاں جی ہی نہیں لگتا۔"

ماں آنسو بہانے لگی۔

اُسے جیسے کسی نے گہری نیند سے جگا دیا ہو ——— اپنے کو سنبھالا اور اُس پر نظریں گاڑ دیں۔

"تیرے پاس کچھ پیسے ہوں گے ——— راشن کے لئے؟"

"مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو ———؟"

"ہُونہہ ——— نہیں۔ تجھے نہیں کہہ رہا ہوں۔ ... ..."

زندہ رہنے کیلئے ...

ناصر منصور

میلے، بے ترتیب اور اُلجھے ہوئے بال ــــ سُرخ اور میلی آنکھیں۔ سُوجھے ہوئے ہونٹ، جو نیل پڑ جانے سے اور بھی کالے ہو گئے تھے۔ چھیلا کھسوٹا ہوا چہرہ، جو کالے کالے کھرنڈوں سے اور بھی عجیب سا لگ رہا تھا۔

اُسے اپنے آپ پر قابو نہ رہا اور اُس نے آئینہ میز پر پٹخ دیا۔

"میرا تو حلیہ ہی بگڑ گیا ہے۔"

سیاہ، سُوجھے ہوئے، نیل پڑے ہونٹ ذرا حرکت میں آئے۔

"یہ کیا؟ ــــ یہ میں ہی ہوں!"

اُس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور اپنے بدن کا سارا بوجھ میز پر ڈالا ــــ میز کا توازن بگڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی میز کی پوزیشن بھی بدل گئی۔ میز پر رکھا پانی کا

نم ہوگئیں — اسی لئے شاید اُس نے دیوار کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ ماں نے بیٹی کو سینے سے لگالیا۔ دادی اِن سب سے بے نیاز، کھوئی کھوئی اور گم سُم سی لگ رہی تھی۔

"میں آخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ ماں کے ساتھ ہمارا سلوک ٹھیک نہیں۔"

میں تو اس سے ایسے ہی پیش آتا ہوں، جیسے مجھے آنا چاہیئے۔"

"یہ مجھے خوش نہیں دِکھتی۔"

"یہ عمر کا تقاضا ہے —— یہ ہے . . . . "

"پھر سوچ، تو کیا کر رہا ہے؟"

"میں ہر چیز سنبھال کر رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں مُنّے اور گڈّی کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری تمنّا ہے کہ ہم بھی زندگی میں خوشیاں دیکھیں۔ میرے یہ ۲ دو بچّے میری آنکھیں ہیں۔"

"کیا تم ان آنکھوں کو اندھا کر دینا چاہتے ہو؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو —— صاف صاف کہو —— تمھارا مطلب کیا ہے؟"

"مت روؤ —— میں بتاتا ہوں۔ پونچھ ڈال اپنے آنسو۔"

... میرا مطلب بھی وہی ہے جو تیرا ہے۔"

"ماں ہمارے لئے ہر ماہ ۲ دو ۲ دو سو روپے لائے گی۔ یہ بابا کی وِدھوا ہے۔"

یہ سُن کر بیوی حیران ہوگئی۔ وہ میاں کی طرف ایک بار بھی آنکھ نہ اُٹھا سکی۔

وہ یوں ہی لحاف کی اور دیکھنے لگی

—— لحاف پر اُس کے آنسو چمک رہے تھے؛

{کشمیری سے ترجمہ: محمّد احمد اندرابی}

"میں کہوں ـــــ ماں کہاں ہے؟"

"شاید دوسرے کمرے میں ہو!"

میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ سردیاں ہمارا پیچھا کب چھوڑیں گی!"

"میں کہوں ـــ ناتو منّے کے پاس "پھیرن[1]" ہے اور نہ گُڈّی کے پاس ـــــ سردی لگتی ہے انھیں۔"

"جانتا ہوں ـــــ ماں کے لئے بھی "پھیرن جوڑ" لاتے؟"

"اگر یہ ایسے ہی اُداس، بُجھی بُجھی سی رہی۔ یہ بھی نا چل ... ..."

"ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

میاں کا سانس پھول سا گیا۔

"بابا چل بسا، مگر ... ..."

"میرے سر تاج کو مار گیا۔"

"میری بانھیں خالی کر گیا۔"

مجھے کٹورا دے گیا ـــــ"

"آج ہم چھے[6] افراد کا راشن پانچ[5] ہی (کے لئے) لائیں گے۔"

"ڈیڈی ـــ اب ہم بہت سارا "بھات[2]" کھائیں گے نا۔"

"ہاں بیٹے!"

"دیکھ میں بابا کے برتن میں بھات کھاؤں گا ... اور تو گُڈّی ـــ؟"

گُڈّی نے اپنی معصوم نظریں دادی کے برتن پر جادیں۔ میاں کی آنکھیں شاید

---

[1] ایک طرح کا ڈھیلا ڈھالا کُرتا [2] خشکہ

نم ہو گئیں — اسی لئے شاید اُس نے دیوار کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ ماں نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ دادی اِن سب سے بے نیاز، کھوئی کھوئی اور گم مُسم سی لگ رہی تھی۔

"میں آخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ ماں کے ساتھ ہمارا سلوک ٹھیک نہیں۔"

میں تو اس سے ایسے ہی پیش آتا ہوں جیسے مجھے آنا چاہیئے۔"

"یہ مجھے خوش نہیں دِکھتی۔"

"یہ عمر کا تقاضا ہے ——— یہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ "

"پھر سوچ، تو کیا کر رہا ہے؟"

"میں ہر چیز سنبھال کر رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں مُنّے اور گڈّی کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری تمنّا ہے کہ ہم بھی زندگی میں خوشیاں دیکھیں۔ میرے یہ ۲ دو بچّے میری آنکھیں ہیں —"

"کیا تم ان آنکھوں کو اندھا کر دینا چاہتے ہو؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو —— صاف صاف کہو —— تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"مت روؤ —— میں بتاتا ہوں۔ پونچھ ڈال اپنے آنسو۔"

... میرا مطلب بھی وہی ہے جو تیرا ہے —"

"ماں ہمارے لئے ہر ماہ دو ۲ دو سو روپے لائے گی۔ یہ بابا کی وِدھوا ہے۔"

یہ سُن کر بیوی حیران ہو گئی۔ وہ میاں کی طرف ایک بار بھی آنکھ نہ اُٹھا سکی، وہ یوں ہی لحاف کی اور دیکھنے لگی

—— لحاف پر اُس کے آنسو چمک رہے تھے؛

{کشمیری سے ترجمہ: محمّد احمد اندرابی}

"میں کہوں ـــــ ماں کہاں ہے؟"

"شاید دوسرے کمرے میں ہو!"

میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ سردیاں ہمارا پیچھا کب چھوڑیں گی!"

"میں کہوں ـــ نا تو مُنّے کے پاس "پھیرن"[1] ہے اور نہ گُڈّی کے پاس ـــــ سردی لگتی ہے انھیں ـ"

"جانتا ہوں ـــــ ماں کے لئے بھی "پھیرن جوڑ" لاتے؟"

"اگر یہ ایسے ہی اُداس، بجھی بجھی سی رہی ـ یہ بھی نا چل ... ..."

"ایسی باتیں نہیں کرتے ـ"

میاں کا سانس پھول سا گیا ـ

"بابا چل بسا، مگر ... ..."

"میرے سرتاج کو مار گیا ـ"

"میری بانھیں خالی کر گیا ـ"

مجھے کنگڑا دے گیا ـــ"

"آج ہم چھ افراد کا راشن پانچ ہی (کے لئے) لائیں گے ـ"

"ڈیڈی ـــ اب ہم بہت سارا "بھات"[2] کھائیں گے نا ـ"

"ہاں بیٹے!"

"دیکھ میں بابا کے برتن میں بھات کھاؤں گا ... اور تو گُڈّی ـــ؟"

گُڈّی نے اپنی معصوم نظریں دادی کے برتن پر جادیں ـ میاں کی آنکھیں شاید

---

[1] ایک طرح کا ڈھیلا ڈھالا کُرتا [2] خشکہ

رنگا سیار جلتی لکڑی ہاتھ میں لے کر باہر چلا۔ میں نے بھی اپنا پوٹلا اُٹھایا اور پیچھے ہو لیا۔ "ایسی برف باری میں وہ ہمارا راستہ کاٹ سکتا ہے۔" قلندر نے عصا اُٹھایا، "جوان! تم یہ بوجھ نہیں اُٹھا سکتے۔ تم میں شوریدہ سری ہے۔" اور دروازے کی دہلیز پر کھڑا ہوا۔ جب ہم لکڑی بجھا کے واپس آئے۔ قلندر نے فرمایا ـــــ "اب اس جگہ فرشتے اُتر نہیں سکیں گے۔"

اندر گجری نے الاؤ کے پاس ایک کتّا اپنی باہنوں میں لے رکھا تھا۔ چونکہ ہم فرشتے تھے نہیں، اس لئے ہم اندر داخل ہوئے۔ کتّا بُری طرح بھونک رہا تھا۔

گجری نے ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگائی اور الاؤ کے ایک طرف ہوگئی۔ قلندر برابر کلماتِ مُقدّس پڑھتا جارہا تھا۔ رنگے سیار نے لکڑی جلائی اور ساری جھونپڑی کا معائنہ کیا۔ کتّا یُوں ہی بھونک نہیں سکتا۔ ہمارے بغیر کوئی اور اندر موجود ہے۔

میں نے گجری کی طرف دیکھا۔ قلندر اپنی چادر جھاڑنے لگا۔ اس نے اپنے اِردگرد لکیر کھینچ لی اور بیٹھ گیا۔ رنگے سیار نے گجری کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے انکار میں سر ہلایا۔

"پھر یہ کتّا ـــــ !"

"کیا ہم وہی ہیں جو پہلے تھے؟"

"ہم کون ہیں؟"

"جو سفر پر روانہ ہوئے تھے۔"

"سفر ـــــ کیا ہم عفریت کی تلاش میں ہیں؟"

"لیکن یہ میرا سوال نہیں ہے!"

"سُنو۔" قلندر نے کہا۔ "سوال اوّل ہے اور سوال ہی آخر۔ سوال کے باہر فقط ایک خلا ہے۔ ہم خود ہی سوال کا جواب ہیں۔ سوال مت پُوچھو، اگر یہاں رہنا چاہتے ہو ـــــ"

ذہن گجری کی حرکات وسکنات کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ قلندر کوئی ——

Epigram سوچ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں گجری کا جائزہ لے رہی تھیں،

رنگا سیار دونوں محاذوں پر مشغول تھا اور میں بظاہر کوئی پرانا اخبار پڑھ رہا تھا۔

لیکن اندر ہی اندر میں بھی گجری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس طرح ہم تین کو نوں

میں گجری کے ہی تین روپ تھے اور ساتھ ہی تین وقت تھے۔

"وقت ایک دریا ہے جس میں ہم اپنے اپنے چہرے دھو لیتے ہیں۔"

وقت وہ جنگلی ریچھ ہے جو ہمارے چہرے نوچ ڈالتا ہے۔"

"وقت ..."

ہم اچانک چونک پڑے۔ گجری دبے پاؤں جھونپڑی کے دروازے تک پہنچ چکی

تھی۔ وہ ہمارے سوچوں کا مرکز بنی ہوا رہے گی۔ وہ باہر نہیں جا سکتی ہے۔ ہم بغیر

ہتھیار ہیں اور باہر برف باری میں وہ ہماری کمزوریوں کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ ہم

اپنے اپنے ہتھیار نزدیک لائے۔ اسی دوران گجری ایک بہت بڑا برف کا تودا لے کر

داخل ہوئی۔ ہم دیکھتے رہے۔ اس نے برف پتیلے میں ڈال دی اور اس کے بعد چائے

بنانا شروع کی۔ الاؤ کی روشنی دیوار پر میرے بائیں طرف اور میرے سر کے ارد گرد رقص

کر رہی تھی۔

قبیلے کے سردار نے ناچنے کا حکم دیا اور سفید فام قربانی کے لئے مناسب جانور ہے؛

سیاہ فام غلمان سیاہ فام دوشیزاؤں کے کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچنے لگے۔

"اس سال بھی کھیت کنوارے ہی رہیں گے۔" قلندر نے چائے کا پیالہ لیتے ہوئے

بات کا سرا پکڑا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں، گجری پھر سے باہر چلی گئی تھی۔ باہر سے

رونے کی آواز آ رہی تھی اور ہم الاؤ کی گرمی میں موم کی طرح پگھل رہے تھے ——

فوٹوگرافر کے لئے یہ ایک بہترین SITUATION تھی۔

چھٹی بستی کا بند دروازہ

غلام محمد، اخگر

دَر ——— دَر ——— دَر ———

کھُلا، کھُلا، بند ———!

کھُلے دروازوں کے اندر جھانکنا اُس ٹکڑے سُورج کی ہر کرن کی تیسری آنکھ کی فطرت تو تھی ہی ——— وہ جب پانچویں بستی پر بھی پڑتی تو ہر دَر وا مِلتا۔ ہر کھُلے دَر میں ایک تقریباً ناممکن نظّارہ انتہا سے بغل گیر نظر آتا۔ اور وہ اپنے ہر دِن کے بدن کا سفر جاری رکھتے ہوئے سوچتی ——— "چھٹی بستی کا دروازہ اب وا ہوا ہوگا۔ اور میں اُس کے اندر بھی جھانک لوں گی اور ———!! ان پچھلی صدیوں کی عُمر کے ساتھ میں اپنی آنکھ کا ایک اور دیکھنا شامل کرکے اس کی حق دار ہو چُکی ہوں ———!"

اسی درمیاں آکر، شاید، پورہیس کی بھُول بھلیوں والی تنگ و تاریک اور

"مگر یہاں رہنا بھی تو ایک سوال ہی ہے۔"

"صحیح ہے۔ مگر ایک ایسا سوال جس کے جواب میں ہم دوسرا سوال نہیں پوچھ سکتے

دوسرا سوال سفر کا آغاز ہے۔"

لیکن سفر ہمارا مقدر ہے۔ تلاش ہماری ہستی ہے۔"

گھڑی سو بھی چکی، لیکن ہمارے ذہن پر سوال ابھی تک ایک سنگِ گراں کی طرح موجود ہے۔ کتا بھی گھاس پر سو گیا ہے۔ لیکن ہم ـــــ ہم برابر سوالوں کے گورکھ دھندے میں ہیں۔ مجھے یہ یاد نہیں، وہ تین تھے یا سات، یا گیارہ۔ لیکن وہ "ہیں"۔ اور کتا ان کی نگہبانی کر رہا ہے ـــــ ہمارا کتا محوِ خواب ہے اور ہم صرف تین ہیں۔ تین افراد تین کونوں میں۔ ہمیں اب آپس میں بات کرنا بھی یاد نہیں، ہم سب گریبان میں پتھر رکھتے ہیں۔ ہماری آنکھوں میں بے اعتباری چھائی ہوئی ہے۔

ہمارا اتفاق فقط فوٹوگرافر کی تصویروں میں وجود رکھتا تھا۔ ہم نے فوٹوگرافر کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ عفریت کی بیخ کنی سے پہلے ہم اُسے عفریت کی ایک تصویر کھینچنے کا موقعہ دیں گے۔ لیکن پل پار کرتے کرتے ہی وہ جھپٹ پڑا اور پہلا شکار لے گیا۔ فوٹوگرافر نے مجھ سے بھی ایک وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے والدِ مرحوم کی ایک تصویر کے نگیٹو کو ڈیولپ کر کے مجھے ایک شان دار تصویر بنا کے دے گا۔ لیکن فوٹوگرافر مر گیا وہ مر گیا اور اکیلا ہی مر گیا۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے اور اکٹھے مریں گے۔ کئی بار ہم نے جھگڑے بھی کئے اور پھر ساتھ میں سمجھوتے بھی کئے۔ لیکن وہ اب جو مر گیا ـــــ صرف ایک فرد مر گیا۔ کیونکہ ہر کسی کی موت ایک انفرادی مسئلہ ہے۔

رنگے سیار نے اپنے سامان کا جائزہ لیا ـــــ ہماری کئی حسین ENERGY LEVEL (انفرادی SITUATIONS ضائع ہو گئیں۔ ہم اپنی اپنی انفرادی میں سوچ رہے تھے ـــــ ہم سوچ رہے تھے ـــــ الاؤ کے شعلے اب مدھم پڑ چکے تھے۔

(کشمیری سے ترجمہ: شفیع شوق)

چھینی ہوئی آنکھ سے باری باری سُورج [شکرا اور سفید] کی اس بے پا نقوشِ قدم

کی مراجعت کی فصل کو اُگتا ہوا دیکھتی رہتی ہیں ــــــــ (میک بتھ کی پانچوں

جادوگرنیاں اب پتھرائی ہیں) ــــــ اور تب سے چھٹی بستی کا دروازہ بند ہے"

ایک کورے ایقان کی بے آواز صداؤں کے بدن کی دھکم پیل میں لوگوں کا پورا

ہجوم روز سویرے سفید جھیل کی جانب دوڑ پڑتا اور پھر شام سے پہلے اس ادھورے

سفر سے واپس لوٹ آتا۔ دوسرے دن وہ دُور کی آواز پھر گونج اُٹھتی اور لوگوں کا پورا

ہجوم پھر سورج ــــــ یعنی سُورج ــــــ کے بے پا نقوشِ قدم کی مراجعت

کی لکیروں پر چلتا سفید جھیل کے سفر پر روانہ ہوتا ــــــ

وہ شکرا سفید سُورج روز اس پورے ہجوم کے احاطۂ خیال میں داخل ہوتا۔ تاکہ

انھیں باور کرائے۔ لیکن چھٹی بستی کا دروازہ ہمیشہ کی طرح بند ملتا ــــــ!!!

اس طرح اس کا مُستقر اکیلی آنکھ کے بدلتے سُوراخوں سے لے کر بند دروازے تک کا

اعتراف تھا۔ جنت اور جہنم کے طفیل دباؤ سے پیدا ہوئے اعتقاد و ایقان کی وراثت

سے بے زار پورے ہجوم کے احاطۂ خیال میں پھیلی ساری صدیوں کی عمروں کا بوڑھا خدا

ہمیشگی کے استقرار کے استحقاق ــــــ (جسے کہ وہ قدرت کہلانا پسند کرتا

ہے) ــــــ کے باوجود پورے ہجوم سے کسی ایک بھی شکرے سفید سُورج کو اس

وراثت کے اپنانے پر مائل نہ کر سکا۔ چناں چہ نہ تو پانچ بستیوں کے کھلے در بھیڑے جا

سکے اور نہ ہی چھٹی بستی کا در ہی کھلا ــــــ

چھٹی بستی کا بند دروازہ ــــــ ہونے میں نہ ہونے کا ہونا ــــــ ادعا۔

ان پانچ پتھرائی بستیوں کے دشت کے حاشیے کا پھیلتا فراز جوں جوں چھٹی بستی

کے بند دروازے پر اس مستور سراب کی یلغار کرنے لگتا تو ایک صدائے بے آواز کی

سرحد معلق بازگشت سے اُبھر آتی۔

بو جھل دُنیا کی منادی کرتا جہاں میک بتھ کی پانچوں بُوڑھی جادُوگرنیاں اس ایک آنکھ

سے دیکھتی رہتیں ــــــ شاید ــــــ سُکڑے سفید سُورج کی تیسری آنکھ

کے پپوٹوں کے اندر کی طرف اُگ آنے والی پلکوں سے پُتلی پر پیدا شُدہ سفیدی کی جھیل

تک ان بے پا نقوشِ قدم کی فصل، ایک نقطۂ عنقا سے مراجعت کے سفر میں اُگ

آئی تھی۔

وہ سُکڑا سفید سُورج روز دُور کے سفر پر بے پا ہی چل پڑتا اور روز ان پانچ

بستیوں کے کھُلے دروازوں کی سماعت تک اس کے قدموں کی چاپ کی کوئی بھی صدا

نہ پہنچ پاتی۔ پھر پچھلی صدیوں کی عمریں اعتراف کی تباہی کی صلیبوں کے چھٹے شہر سے

مراجعت کے لمحے ان میں ایک نئی آنکھ کا ایک اور دیکھنا شامل کرکے حق دار ہونے کی

آرزو میں بند دروازے کی فضیلت کے اعتراف کا تنہا واقعہ بن جاتیں۔

وہاں نہ پہلی تھی نہ دوسری اور اگر تھی تو تیسری تیسری تھی۔ یعنی تیسری تیسری

تھی ــــــ اور وہ پانچوں باری باری اپنی ہتھیلیوں کی پھیلواں مچھلیوں کے

طفیل اس تیسری آنکھ کو اپنے دَر کے اندر رکھ کر سُورج، [سُکڑا اور سفید]

کے بے پا نقوشِ قدم کی مراجعت کی فصل کو اُگتے دیکھتیں۔ ان پانچوں پتھرائی

بستیوں کی اُس اکیلی آنکھ کا قصہ سُناتے ہوئے وہ کہیں کا کہیں نکل گیا تھا۔ میں انتظار

کے طلسم میں اُسی ساحرانہ بازیافت کی مُنڈیر پر سر رکھے براہ راست ظہور کی اُمید

کی شب گزارتا اور پھر سے طلوع ہونے والی پچھلی صدیوں کی عمروں کی سفید جھیل

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے گویا ہوئی ــــ "اُس پاتال میں روز شیشے کے گُل نرگس

اُگا کر گیریلو، نرساس کے سامنے رکھتا تھا ــــــ؟ اُسی طرح کھُلے دروازوں نے

اس سفید جھیل میں اپنی صورت دیکھ کر اس مستورِ شراب کی پذیرائی کی ــــــ

پتھرانے کے بعد ان مُورتیوں نے چھٹے دَر کی اکیلی آنکھ چھین لی اور تب سے وہ اس

چیتھڑے

غلام حسن تسکین

کمرے میں داخل ہوتے ہی میرا دم گھٹنے لگا۔ تمام کھڑکیاں کھولنے کے بعد بھی مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی ایسے کھڈ میں گر گیا جس میں ہوا کے داخل ہونے کا کوئی راستہ نہ ہو۔ چاروں طرف دیواروں پر ٹنگے ہوئے کپڑے مجھے زندہ انسانوں کی طرح لگ رہے تھے۔ مختلف کپڑے، قمیض، کوٹ، واسکٹ، پاجامے اور پتلون وغیرہ ــــ ان میں کچھ ایسے بھی تھے کہ جو میں نے آج سے بیس سال پہلے سلوائے تھے اور اب نو زائیدہ بچے کے کپڑوں کی طرح لگ رہے تھے۔ کچھ تو آدھے سے زیادہ پھٹ چکے تھے، اور دو ایک کے تو بس کالر ہی رہ گئے تھے۔ میں نے ایک پرانا کوٹ اٹھایا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے کالر پر اتنا میل جم گیا تھا کہ کپڑا تو برائے نام میل ہی میل تھا۔

چناں چہ پچھلی تمام صدیوں کی عمروں میں اپنے ایک اور دیکھنے کی شمولیت کے باوجود وہ دُور کی آواز پھر سُنائی دی۔ آج بھی پُورا ہجوم مراجعت کی ان ہی لکیروں پر ہولیا۔ لیکن سفید جھیل تک کسی نے بھی اس سُورج کو [جو سُکڑا اور سفید تھا] کو جاتے ہوئے نہ دیکھا، نہ اُس پاگل سُورج کی باتوں پر کسی نے یقین کیا۔ تو وہ بھاگ گیا ــــ اُسے پیٹا گیا ــــ جس کے نتیجے میں بے پا نقوشِ قدم کی مراجعت کی فصل کی لکیروں نے اُگنا بند کر دیا اور سفید جھیل تک جانے والی راہ گم ہو گئی۔

کہتے ہیں کہ پچھلی صدیوں کی عمروں اور ایک اور دیکھنے کا کوئی بھی جلوس اب پُورے ہجوم کی صورت میں جھیل [جس کے رنگ کی بابت ایک مدّت سے اب کوئی اطلاع نہیں مل رہی] کی اور نہیں جاتا بلکہ اس بند دروازے پر ایک بڑی قربان گاہ بنالی ہے ــــ فِفٹی فِفٹی ــــ اور منتشر لوگ، اکّا دُکّا، چوری چھپے معلّق بازگشت کی سرحدی فصیل پار کر کے ان پانچ پتھرائی بستیوں کے وِفاق میں داخل ہو جاتے ہیں کہ کبھی تو چھٹی بستی کے بند دروازے سے چھینی ہوئی اس اکیلی آنکھ کو اپنے ماتھے کے سُوراخ ــــ سُرخ حرف ــــ میں لگا کر اُس تقریباً ناممکن نظّارے کو انتہا میں ڈوبا دیکھ کر خود بھی پتھرائیں اور شرآب (مستور) کی فضیلت کے اعتراف کا تنہا واقعہ بن جائیں۔ لیکن تنہا، تنہا ہے اور چھٹی بستی کا دروازہ ہنوز بند ــــ

{کشمیری سے ترجمہ}

ان کی طرف کھینچی چلی جاتی تھی اور میری رگیں ان کی محبت میں پھڑکتی تھیں۔

وقت گزرتا گیا اور میں ایک ایک کپڑا اٹھاتا اور رکھتا گیا۔ میرا ذہنی تضاد جاری تھا۔ اور میں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پاتا تھا۔ میں بالکل کسی طرح کا انتخاب نہیں کر سکا۔ زندگی میں، میں نے نہ جانے کتنے طوفانوں کا سامنا کیا تھا اور آج پھر ایک بار میں ان ہی طوفانوں سے گزر رہا تھا۔ کون سا کپڑا کس حال میں اور کس دکان دار سے خریدا تھا۔ کس سے سلوایا اور کس دن پہنا تھا۔ یہ ساری باتیں فلم کی متحرک تصویروں کی طرح میرے ذہن میں آ رہی تھیں۔

خدایا! کاش ان چیتھڑوں کی بھی ایک نمائش ہوتی جیسے اور چیزوں کی نمائش ہوتی ہے۔ تو مجھے ضرور ایک عالمی ایوارڈ مل جاتا! اور پھر ایسی نمائش میں حرج بھی کیا ہے۔ جب سیبوں کی نمائش، بچوں کی نمائش، پھولوں کی نمائش اور طرح طرح کی نمائشیں ہوتی ہیں۔ کیا چیتھڑوں کی نمائش ضروری نہیں ؟

جب موہنجوداڑو اور ہڑپا کے کھنڈرات سے ملی ہوئی ٹھیکریاں ایک تہذیب کی عکاسی کرتی ہیں تو کیا یہ چیتھڑے ہماری تہذیب کا اہم حصہ نہیں ہیں ؟

کہاں گئے وہ دن، جب تین سال کے بعد بھی قمیض بالکل ٹھیک حالت میں رہتی اور بیس سال بعد بھی اس کا کچھ نہ کچھ حصہ موجود ہوتا تھا۔ اور آج کے اس پرآشوب دور میں کپڑا تو چھ مہینے بھی نہیں چلتا اور پھر مجھ جیسے چھوٹے ملازم کے لئے تو سوٹ بنوانا گویا کرا ڈیم تعمیر کرنے کے برابر ہے۔ وہ تو وقت پہ میری عقل کام آئی جو اس دن میں نے ایک بنگلہ دیش سوٹ خریدا۔ اور اب تک اسی سے کام چلا رہا ہوں!

اس بار بھی دل نے چاہا تھا کہ پرانا سوٹ چھوڑ دوں اور مہینے بھر اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ نہ جانے کیوں خواہ مخواہ اس مال کو بنگلہ دیش مال کہتے ہیں۔ یہ تو انگریزوں کی اترن ہے اور اب ہمارے پاس اپنا رہا ہی کیا ہے۔ سب انگریزوں کی اترن اور

"یہ تو خواہ مخواہ جگہ گھیرے ہوئے ہیں۔ بہتر ہے کہ میں ان سے چھٹکارا پاکر جگہ صاف کرلوں۔" یہ خیال مجھے پہلی بار نہیں آرہا ہے۔ میں نے پہلے بھی کئی بار ایسا سوچا ہے مگر نہ جانے کیوں میں ان چیتھڑوں کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا!

"لیکن لے جاؤں تو کہاں لے جاؤں۔ پھینک بھی تو نہیں سکتا!"

مجھے یاد آیا کہ دو ایک بار وہ بوڑھا بھکاری آیا تھا اور اس نے مجھ سے اترن کا سوال کیا تھا۔ وہ غریب تو تقریباً ننگا تھا لیکن میں اسے کچھ نہ دے سکا۔ مگر وہ بھی تو ایسے ہی موقعوں پر آتا ہے جب میں کسی نہ کسی مخمصے میں گرفتار ہوتا ہوں۔ اب تو مدّت سے وہ آیا نہیں۔ شاید اسے Begger Home لے گئے ہوں! یا ہو سکتا ہے کہ مر گیا ہو۔ زندگی کا کیا ٹھکانہ۔ میں ان ہی خیالات میں گم تھا کہ پار کمرے سے آواز آئی ——

"تم آج بھی سنسان مسجد کے بھوت کی طرح اکیلے بیٹھے ہو۔ کتنی دیر سے چائے لے کر تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔ ٹھنڈی ہو جائے تو پھر کوئلے کے بدلے کیا اپنا سر ڈالوں گی!"

یہ بالن کا کال بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بالن ہی کیا، ہر چیز کی قحط سالی ہے۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے اور ہمیں پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی!

یہ سوچنے کے بعد میں چیتھڑوں کو چھانٹنے لگا۔ میں نے طے کرلیا کہ ناقابلِ استعمال کپڑوں کو میں گٹھڑی میں باندھ لوں گا اور پھر کسی کو بخش دوں گا۔ اور جو کپڑے مرمت کے بعد قابلِ استعمال بن سکیں، ان کو الگ باندھ کر رکھ لوں گا۔ اس طرح سے جگہ بھی کھل جائے گی اور میں بھی ذہنی کشمکش سے آزاد ہو جاؤں گا۔

مگر ان چیتھڑوں کو چھانٹنا بھی آسان نہیں تھا۔ اب ایک معیار طے کرکے میں نے ایک ایک کپڑا اُٹھانا شروع کیا۔ لیکن جو بھی کپڑا میں اُٹھاتا گیا، دل نہیں مانتا کہ ان کو ردّی میں رکھ دوں۔ ان چیتھڑوں میں نہ جانے کیسی مقناطیسی کشش تھی جو مجھے

بس ایک آواز

رتن لال مجو

کھڑکیاں کھولنے سے کون سی تبدیلی آسکتی ہے۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ میرا دم گھٹ رہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ بہت عرصے تک ایک ہی جگہ رہنا ہو۔۔۔ ورنہ سردی میں دم گھٹنا کیسا؟ لوگ تو سردی کے مارے کانپ رہے ہیں لیکن مجھے اس قدر گرمی محسوس ہو رہی تھی کہ توبہ۔۔۔!

تھوڑا ہی وقت گزرا ہوگا کہ بنگالن پھر سے اپنا بھجن گانے لگی۔۔۔

"پاؤں ہو کر بھی میں تیرے درشن کرنے نہیں آسکتی ہوں۔"

اس بنگالن کے پاؤں بالکل صحیح وسلامت تھے۔ مگر کل شام اُس کے بیٹے نے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ اُس کے لئے ایک قدم چلنا بھی بہت مشکل ہے۔

"اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ چل پھر کیوں نہیں سکتی؟" میں نے بنگالن کے بیٹے سے پوچھا

جھُوٹن ہے ——

پھر ایک اور آواز کان میں آئی —— "تمھیں سوتے اور جاگتے ہیں خوُد کلامی کی عادت ہے۔"

مجھُے تو فراغت کے لمحات میں بھی باتیں ناگوار گزرتی ہیں اور پھر اُس وقت کی تو بات ہی نہیں کہ جب ذہنی کشمکش کی جنگ جاری ہو!

اور پھر بات بھی کس سے کروں۔ مجھُے اتنی فرصت کہاں؟ اب اگر کسی نے پوُچھا بھی کچھُ تو آسانی سے جواب بھی نہ دیا۔ اور باتیں بھی کروں تو بے تکی سی۔

"تم تو ان چیتھڑوں میں کھو گئے ہو۔ اُٹھو، چائے پیو۔ چیتھڑے تو میں نے کباڑی کو دے دیئے اور جھنجھٹ سے نجات پالی ہے۔"

میں بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک کپڑا بھی نہیں تھا۔ دیواریں خالی تھیں جو کاٹنے کو دوڑتی تھیں۔ اور آج پہلی بار میری نظر کیلنڈر پر پڑی ——

"میرا کوٹ اور میری پتلون۔"

"کون سا کوٹ اور کیسی پتلون؟"

"جو پہن کر میں دفتر جاتا ہوں۔"

"وہ بھی پہننے کی چیز تھی۔ میں نے سبھی چیتھڑوں کو رُخصت کر دیا ہے۔"

"رُخصت! تو میں کیا پہن کر دفتر جاؤں۔ تم نے تو مجھُے باہر جانے کے قابل نہیں رکھا!"

"بیٹھ جاؤ۔ دیکھا جائے گا۔ ابھی تو ایک ہفتے کی چھُٹی ہے۔"

"کیا خاک بیٹھ جاؤں، مجھُے اب ان دیواروں سے نفرت ہے۔ جن چیزوں سے ان کی رونق تھی، اُن کا تم نے نیلام کر دیا۔ یہ کیلنڈر کس کام کا۔ دِن، مہینے اور سال ان کا کیا فائدہ؟ سال ہا سال کی میراث تم نے کھوٹے سکوّں کے عوض بیچ ڈالی۔ بہر حال ایک روایت پھر بھی قائم رکھی؛

{کشمیری سے ترجمہ: بشیر بڈگامی}

میں ایک خاص قسم کا سوز اور اثر تھا۔ جو اُس کے بھجن کو اور بھی پُر اثر اور پُر سوز بنا رہا تھا۔ اس ہنگالن نے میرے ذہن پر ایسے نقوش چھوڑے جنھیں میں اس وقت تک اپنے لاشعور میں محسوس کر رہا ہوں۔ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اُس کا مجھ سے یہ کہنا کہ "میں ایک اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں اور ایک اچھے اور خوش حال گھر میں بیاہی گئی تھی۔ میرے مائیکے والوں کا شمار اُونچے درجے کے سنگیت کاروں میں ہوتا تھا۔ ہمارے گھر میں گانے بجانے کو عبادت کا ایک طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب ـــــ اب تو سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ سب کچھ ختم ہو گیا ہے ـــــ ختم ـــــ بالکل ختم ـــ" اور یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک طوفان اُبل پڑا ـــ

میں اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا ـــــ "رو مت ـــ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی" میں نے اُس سے کہا۔ لیکن حقیقت میں زندگی اُس سے دُور بھاگتی جا رہی تھی۔ کتنی دور سے یہ ہنگالن صحت یابی کی خاطر یہاں آئی ہوئی ہے۔ نہ جانے کتنے میلوں کا فاصلہ طے کر کے! موت نے اُس کے چہرے پر اپنا سایہ ڈال دیا ہے ـــ مگر اُس کے دل میں زندگی کی ایک شمع ابھی تک روشن ہے۔

یہ ہنگالن میرے سوا کسی دوسرے مریض سے بات نہیں کرتی تھی۔ اور نہ ہی کوئی اُس سے بات کرتا تھا۔ نرسیں بیماروں کو انجکشن لگا رہی تھیں اور اُن کا درجۂ حرارت نوٹ کر رہی تھیں۔ اُنھیں معلوم تھا کہ اُن کا کام ـــ اُن کا فرض صرف انجکشن لگانا ـــ اور ٹمپریچر نوٹ کرنا ہے۔ اُنھیں اس بات کا کوئی خیال نہ تھا کہ اُنھیں بیماروں کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنا چاہیئے ـــــ اُنھیں تسلّی دینی چاہیئے۔ کیونکہ کسی وقت بیمار دوا سے زیادہ تسلّی کے دو بول سُن کر صحت یاب ہوتا ہے۔

"کہیئے کیا حال ہے آپ کا؟"

"اوہ . . . سلمہ ـــ تم ـــ تم کس طرح یہاں آگئی؟"

"اُسے شدید کھانسی آتی ہے۔ اگر یہ کچھ قدم چل بھی لے تو اُسے سخت کھانسی کا دَورہ پڑتا ہے۔ اُس پر بے ہوشی کا ایک عالم طاری ہوتا ہے اور بہت دیر کے بعد وہ پھر ہوش میں آتی ہے۔"

مجھے بھی اس ہسپتال میں داخل ہوئے ایک عرصہ گزُر ا تھا۔ میری دائیں طرف کے بیڈ پر جو بیمار تھا، وہ ایک مِل مزدور تھا۔ وہ کمزوری کے باعث ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ دِکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے دائیں بازو کی رگ میں ایک سوئی لگی ہوئی تھی جس کے ذریعے اُس کے جسم میں خون داخل کیا جا رہا تھا۔ سٹینڈ پر لٹکی ہوئی بوتل سے خون کا ایک ایک قطرہ ٹپک ٹپک کر اُس کے جسم میں داخل ہو رہا تھا ــــــ وہ اپنے بھائی سے ہکلاتے ہوئے پوچھنے لگا ـــ "بس! کتنا خون بوتل میں باقی ہے؟"

"ابھی چل رہا ہے۔ بوتل خالی نہیں ہوئی ہے۔" جواب ملا۔

"وائے! جی چاہتا ہے کہ خون کی اس بوتل کو ہونٹوں سے لگا کر غٹا غٹ پی جاؤں، شاید پھر اس بوتل کو ختم ہونے میں کم وقت لگتا۔"

شاید اُسے یہ معلوم تھا کہ خون کی اس بوتل کو پی جانے سے وہ اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے! کیا معلوم اُس کے جسم میں کِس کا خون داخل کیا جا رہا ہو۔ کیا معلوم وہ شخص کہاں کا ہو! ـــ نہ کوئی جان نہ پہچان ـــ جس طرح ایک آدمی کا خون دوسرے کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ کاش اُسی طرح کسی کی خصلت کو دوسرے کے جسم میں داخل کیا جا سکتا ـــ کتنا اچھا ہوتا!

"پاؤں ہو کر بھی میں تیرے درشن کرنے نہیں آ سکتی ہوں!"

بنگالن پھر سے گانے لگی۔ وہ اس بھجن کو روتے ہوئے گا رہی تھی ـــ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی کارواں سے ـــ کسی پڑاؤ پر بچھڑ گئی ہو ـــ جیسے وہ کسی مقدس زیارت کی یاترا کو نکلا تھا، لیکن بیچ راستے میں تھک ہار کر گر پڑا ہو ـــ اُس کی آواز

بنگالن نے پھر سے بھجن شروع کئے ـــــ "پاؤں ہو کر بھی میں تیرے درشن کرنے نہیں آسکتی ـــ" اس وقت اُس کی آواز میں کھوکھلاپن اور زیادہ نمایاں تھا۔ اُس کی کھانسی بھی تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب وہ زندگی کی قید سے جلدی چھوٹ جائے گی ـــ "سنو، کتنا خون باقی ہے بوتل میں؟"

"چل رہا ہے!"

"میں خون کی بوتل کو مُنہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں پینا چاہتا ہوں ـــ اس طرح کم وقت میں یہ میرے جسم میں پہنچ جاتا!"

اب ہسپتال میں کھانسی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اور ایک نیا ماحول پیدا ہونے لگا تھا۔ اب صرف ایک آواز سنائی دے رہی تھی ـــ جو سُننے والوں کے کانوں میں اُترتی جا رہی تھی۔

"پاؤں ہو کر بھی میں تیرے درشن کرنے نہیں آسکتی!"

اس کے علاوہ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی ـــ خاموشی ـــ سنّاٹا ـــ

بنگالن کا بھجن ـــ

بس ایک تاثّر ـــ

بس ایک آواز ـــ

[کشمیری سے ترجمہ: ظفر معراج]

"میں نے کل آپ کی بیماری کی خبر سُن لی۔"

"کیوں ؟ ——— تم یُونی ورسٹی نہیں جایا کرتی تھی ۔"

"نہیں ——— میں اپنی ایک سہیلی کی شادی کے سلسلے میں بہت مصروف تھی ۔"

"شادی ہو گئی ؟"

اُس نے سر ہلا کر "ناں" کی ——— اور میرے بستر کی چادر کی شکنیں دُرست کیں ۔ سلمہ میرے سرہانے کے قریب ایک سٹول پر بیٹھی کسی سوچ میں گُم ہو گئی ۔ اُس کی آنکھیں کسی شے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں ——— اور ایسا محسوس ہو رہا تھا مجھے کہ وہ بالکل کھو گئی ہے اور اُسے اپنے آس پاس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ۔

"سلمہ !"

"ہوں ——— !"

"سلمہ —" میں نے دوبارہ اُسے آواز دی ۔

اُس نے اپنی آنکھیں پاس کے مریض کو دی جانے والی خُون کی بوتل سے ہٹا دی ۔ اور میری طرف کچھ اس طرح سے دیکھنے لگی کہ جیسے میں اُس کی نظروں کے سامنے نہ تھا ، بلکہ خُون کی وہ بوتل تھی جس میں سے قطرہ قطرہ خُون ٹپک کر پاس کے مریض کے جسم میں داخل ہو رہا ہو ۔

"زِندگی"

"ہاں ——— یہی زندگی ہے ———" میں نے اُسے کہا ۔ لیکن اُس نے شاید میری بات سُنی نہیں ۔ درحقیقت میں سلمہ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا ——— ڈھیر ساری باتیں ۔ مگر میری نظروں کے سامنے فوراً ہی اُس کا وہ نفرت بھرا چہرہ گھومنے لگتا تھا ——— جب وہ کسی لڑکے سے کوئی بات کر رہی ہو ——— سلمہ کے کِردار پر کسی قسم کا کوئی شک کرنا ایک عظیم گناہ تھا ۔ یہ الگ بات ہے کہ بڑے بڑے صوفی اور زاہد لوگ تُشک غلطیوں کا شِکار ہوتے ہیں ۔ غلطی تو فطرتِ اِنسانی میں بسی ہوئی ہے ۔ !

برگِ آوارہ

نریندر کھجوریہ (مرحوم)

میں لوٹ کر آرہا تھا۔ ابھی کچھ پل ہوئے وہ بس دندناتی ہوئی گزر گئی تھی جس پر میں گزشتہ چھ مہینوں سے کنڈکٹر تھا۔ یوں ہی بات کا بتنگڑ بنا اور میری نوکری کا پہیہ، جو عام طور پر پنکچر ہی رہتا تھا، ایک دم پھر پنکچر ہو گیا۔ اور بس چلی گئی۔ پیلے پتوں کا ایک ریلا کافی دور تک بس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ بے کار ہوتے ہوئے بھی دل میں کوئی بوکھلاہٹ نہ تھی، جیسے میں اپنی پرانی اور جانی پہچانی دنیا میں لوٹ کر آگیا ہوں۔ جہاں بھوک تھی، مگر کھلا آکاش بھی تھا۔ بکھری ہوئی دھوپ بھی تھی ......

... اچانک بین کے سُر میرے کانوں میں پڑے۔ میں نے دیکھا، سامنے پگڈنڈی کی طرف سے ایک بارات آرہی تھی۔ ایک وقت تھا جب بارات کا بینڈ دیکھتے ہی دل خوشی سے ناچ اٹھتا تھا۔ اب جب میں ۲۳ برس کا ہوں، اس کی آواز سن کر کچھ عجیب سا

ڈوگری

میں نے سوچا دُولھے کو اس بات پر ضرور غصّہ آئے گا۔ اور نہ جانے کچھ جھگڑا بھی ہو جائے۔

لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ بس بین بجانے والوں کو ایک روپیہ تھما کر دُولھا خود بھی ناچنے لگا۔ جیسے

ہیجڑوں کی مشہوری کرنے والے ناچتے ہیں۔

دھیرے سے ایک سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے دیکھا، وہ دونوں بُوڑھے میرے پیچھے کھڑے تھے۔

ایک نے آگے بڑھ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیا کام کرتے ہو؟"

"بے کار ہوں!" میں نے جواب دیا۔

"کام کروگے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔ میں نے اپنے سر کو ذرا جھٹکا دیا۔ "ہاں!"

"اکھنور تک ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔"

میں نے دھیرے سے اُس کا ہاتھ اپنے کاندھے سے ہٹا دیا۔ "مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"چپ چاپ آرام سے بیٹھنا ہوگا!" میں نے اپنی عمر کے ۲۳ برس چپ چاپ ہی بتائے ہیں۔

"ہمیں صرف تین دن کے لئے تمھاری ضرورت ہے۔ اس کے ہم تیس رُوپے الگ دیں گے،

لیکن تمھیں آخر تک چپ رہنا پڑے گا۔"

تھوڑی دیر میں ہی دُولھے کے چمکتے دمکتے کپڑے میرے بدن پر تھے۔ وہی کھٹی کسیلی شراب

والا گلاس میرے سامنے بھی آگیا

"نہیں، میں نہیں پیتا!"

"نہیں۔ پیو!" فوجی ڈھنگ سے کٹوائے ہوئے بالوں والے نوجوان نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے

کہا۔ "دُولھا بن کر نا، نہیں کرتے۔"

میں نے کہا۔ "نقلی دُولھے پر آپ کی یہ بات لاگو نہیں ہوتی!"

گلاس اصلی دُولھے نے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی ادھ مُوندی آنکھیں ایک بار

پُوری کھُل گئیں۔ ایک آنکھ کانچ کی تھی۔

احساس ہوتا ہے۔ اپنے آپ میں ایک شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ ایک تذبذب، جیسے میری اپنی بارات ہو۔ بنا کسی مرضی کے میں اُس طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ بین والوں کے پھُولے ہوئے گال، باراتیوں کی گہری رنگ کی پگڑیاں، پسینے سے جن کے داغ باراتیوں کے ماتھے پر جھک رہے ہیں۔ کورے لٹھے کے پاجامے، جن کی چوڑیوں پر دھول جمی ہوئی تھی، تیل سے بھگوئے ہوئے دیسی چمڑے کی جوتیوں کی "چیں چیں"۔

ایک مریل سی گھوڑی پر ڈٹ کر بیٹھا ہوا دُولھا۔ پُلیا کے ساتھ والی کھُلی جگہ میں آکر وہ بیٹھ گئے۔ نہ جانے بس کے انتظار میں۔ ایک طرف کمبل بچھا کر چوکڑی جم گئی۔ دیسی شراب کی بوتلیں، جن کے مُنہ مکّی کے گودوں سے بند کئے ہوئے تھے، کھُل گئیں۔ شراب کی کھٹّی، کسیلی بدبو اُٹھ آئی۔ دُولھا نے دُودھ پیتے بچّے کی طرح دونوں ہاتھوں میں گلاس پکڑ کر مُنہ سے لگا لیا۔

کچھ ہی پل پہلے، سہرے کی لڑیوں سے ڈھکے ہوئے چہرے کا تصوّر میں نے کیا تھا۔ اب وہاں سخت چہرہ تھا جس پر چیچک کے داغ تھے۔ ایک آنکھ کھُلی کی کھُلی۔ نہ جانے کانچ کی تھی اور مُنہ بند کرنے کے بعد بھی سونے کے دانت کا آگے بڑھا ہُوا سِرا چمک رہا تھا۔ ان سب سے پرے ایک طرف دو بوڑھے بے رُخی سے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے جیسے وہ کوئی ضروری شے راستے میں کھو آئے ہوں!

بین پھر بج اُٹھی۔ پینے پلانے والی چوکڑی میں ایک نوجوان، جس کے بال فوجی ڈھنگ سے کٹے ہوئے تھے، ناچنے لگا۔ وہ نوجوان اُس سمے تک ناچتا رہا جب تک بین بجانے والوں میں دم خم رہا۔ ایک باراتی، جسے بہت نشہ چڑھ گیا تھا، ہاتھ ہلا ہلا کر زور سے کہہ رہا تھا ——— "سچ بات ہے، سولہ آنے سچ۔ جو خود بدصورت ہو، اُسے بیوی خوب صورت ملتی ہے۔ پھر دُولھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔ "پھٹّے کی ہونے والی بیوی، حسن پری ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ آخر میرا سُسرال بھی وہیں ہے۔"

سورج ڈوبنے پر دُلہن کو گھر میں داخل کیا گیا۔ میرے بدن پر سے سُنہری اچکن اور شادی والے کپڑے اب اُتر چکے تھے۔ اس بوڑھے نے میری طرف بڑی سمجھداری سے دیکھتے ہوئے دس دس رُوپے کے تین نوٹ میرے سامنے کر دیئے۔ میں نے اپنی نظریں نوٹوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "نہیں مجھے اپنی مزدوری مل گئی ہے۔"

بوڑھے نے نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "رات کو یہاں ٹھہر جاؤ، صبح چلے جانا۔" پھر ادھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ "اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ اس بار پھر وہی کھٹی شراب کی بدبو آنگن میں پھیل گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ شراب پی نہیں رہے، چھڑک رہے تھے۔ میں غیر ضروری کردار کی طرح ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اصلی دُولھا ایک عورت سے کہہ رہا تھا۔ "بھابی! تیرے پیر دھو دھو کر پیوں گا۔ دیکھ اس غریب پر ترس کھا! میں نے سُنا ہے دُلہن حسن پری ہے۔ بھابی، آج حُسن پری دِکھا دے!"

عورت مُنہ میں چادر کا پلّو ٹھونس کر ہنس پڑی۔ "نہیں! میری چاند سی دیورانی کو نظر لگ جائے گی۔"

"بھابی، میری ایک آنکھ شیشے کی ہے، دوسری میں خود ہی بند کر لوں گا۔ میں سدا کے لئے سوُرداس بن جاؤں گا!"

"اچھا سوچوں گی۔" وہ میرے سے کہہ اور زور سے ہنس کر وہ چلی گئی۔ دونوں ہاتھوں سے گلاس تھامے وہ کھڑا رہا، اور اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

میں اسی طرح ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ سونے کی ہمت مجھ میں نہیں رہی تھی۔ میں جیسے "میں" نہیں تھا۔ سارا گھر سو گیا، بغیر ایک کمرے کے۔ ایک کمرہ جاگ رہا تھا۔ یہ کمرہ رو رہا تھا

"۔۔۔۔۔ نہیں، تم کون ہو؟"

زور کے قہقہے سے جیسے سارا کمرہ کانپ اُٹھا۔ "میں کون ہوں..... اتنا بھی نہیں جانتی..... مجھے نہیں پہچانتی؟"

تیسرے دن ہم بس میں واپس آ رہے تھے۔ اگلی سیٹ پر میں اور نئی دُلہن ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ ہماری سیٹ کی پچھلی سیٹ پر اصلی دُولہا بیٹھا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بس پر نہیں، ایک تیز گھومتی ہوئی چکّی پر کھڑا تھا۔ ایک بوجھ میرے بدن پر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہمارے بیچ کی خالی جگہ پر اصلی دُولھے کی للچائی ہوئی نظریں بچھی ہوئی تھیں۔ اگر جھٹکے سے ہمارے بدن ایک دوسرے سے چھُو جاتے تھے تو پچھلی سیٹ سے ایک زور کی کھنکار سُنائی دیتی تھی اور میں سنبھل کر بیٹھ جاتا۔

ایک بار جب نیند کی جھپکی میں بیوی کا سر میرے کاندھے کے اُوپر جُھک گیا تو پچھلی سیٹ سے لگاتار کھنکار شروع ہو گئی۔ جیسے کوئی چیز گلے میں پھنس گئی ہو۔ میں نے دھیرے سے اپنا کندھا سرکا لیا۔ رت جگے کی وجہ سے وہ بے سُدھ سوئی ہوئی تھی۔ کیا یہ میرا بدن ہے جو یوں کانپ رہا ہے؟ کانپتا بدن اور ڈُوبتا ہوا دل۔ کیا یہ میں ہوں؟ میں تھوڑا مُڑ کر دیکھتا ہوں۔ بے رُخی میں جھپکتی ہوئی ایک آنکھ، چمکتے سونے کے دانت کا ایک سرا۔ اور مجھے یقین نہیں آتا کہ اصلی دُولھا یہی ہے اور میرے ساتھ گٹھڑی بنی ہوئی ایک معصوم لڑکی اس کی دُلہن ہے۔ کھٹی شراب کی بدبُو میں ڈُوبے ہوئے لفظ "پیٹھے کی دُلہن حُسن پری ہے" مجھے یاد آ جاتے ہیں۔ ایک اَن جان سا درد، جو مجھے پہلی بار محسوس ہوا، ایک بڈھے بوجھ کی طرح میرے اِرد گرد لپیٹتا جا رہا ہے۔

ایک موڑ پر ایک فوجی ٹرک آ جانے سے ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائی۔ سب ایک ہی بار اپنی اپنی سیٹ پر جھُول گئے۔ نئی دُلہن گھونگھٹ کھینچنے لگی۔ اسی افراتفری میں اُس کے انگوٹھے میں سے آرسی گر پڑی۔ میں نے آرسی اُٹھا کر اُس کے سامنے کر دی۔ اُس نے جھجکتے جھجکتے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور آرسی لے لی۔ اس سمے ہمارے بیچ میں صرف ہم دونوں کی نظر تھی۔ پھر وہی کھنکار، پر یہ آواز اب میرے لئے بے مطلب بن گئی تھی..... بس کے ہارن کی طرح۔

یادوں کے جھروکے

بندھو شرما

چڑھتو کا کوٹ ٹھاکر گجے سنگھ کی ملکیت تھا۔ تقریباً اڑھائی سو ایکڑ کا یہ گاؤں پہاڑی ڈھلان پر بسا ہوا تھا۔ ٹھاکر چڑھت سنگھ صاحب، گجے سنگھ کے دادا تھے اور یہ گاؤں جموّں کے راجہ صاحب نے اُن کی بہادری اور وفاداری کے صلے میں اُن کے نام لکھ دیا تھا۔ اس طرح یہ گاؤں "چڑھتو کا کوٹ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اس سے قبل اس گاؤں کا نام کیا تھا؟ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ یُوں یہ گاؤں ٹھاکر چڑھت سنگھ کے ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے بھی بسا ہوا اور آباد ہی تھا۔ گاؤں کا اپنا ایک چھوٹا سا مندر تھا جہاں اس کے باسی سر جھکاتے تھے۔ میٹھے پانی کا ایک کنواں تھا جس کا پانی پیتے تھے۔ امرائیوں کے جھنڈ تھے، کھیت اور باغ تھے اور کھیتوں کے نیچے نیچے صاف شفاف پانی کی ایک ندی سی بہتی رہتی جس میں کمر تک پانی تو بارہوں

"نہیں — تم وہ نہیں۔ پر ماتما کے لئے تم چلے جاؤ—"

"وہ تارا کہتا تھا۔ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ پر تم یہ نخرے کیوں کر رہی ہو؟ تجھے کیا پتہ، بھابی کی کتنی خوشامدیں کی ہیں؟"

"نہیں، نہیں، نہیں — یہ دھوکا ہے، کپٹ ہے۔ تم وہ نہیں ہو—"... ...

.. یہ کہتے ہوئے وہ سسکنے لگی۔

دوسرے دن سڑک کے کنارے اُسی پلیا پر بیٹھ کر میں سوچ رہا ہوں۔ میں پت جھڑ کا ایک زرد پتہ ہوں جسے یک لخت ایک ہی جھکڑ نے بیاہ منڈپ پر پھینک دیا۔ لیکن کاش! یہ حادثہ صرف اتنا سا ہی ہوتا۔ اس سے کسی دوسرے کی زندگی کا نیا، مگر عجیب باب نہ لکھا جاتا۔ میں سوچ رہا ہوں، اس کہانی کا ویلن کون ہے؟

اور اچانک میرا ہاتھ میری اپنی ہی اور اُٹھ جاتا ہے —— !

———— {ڈوگری سے ترجمہ: محمد یٰسین}

شراب پلا کر تال پر نچاتے ہوئے پورے میلے میں اڑتے سے رہتے تھے۔ ان میلوں میں کتنی ہی دوستیاں اور عداوتیں جاگ اٹھتیں۔ ایسی دوستیاں جو عمر بھر نبھتی تھیں اور دشمنیاں جو عمر بھر پلتی رہتی تھیں ۔۔۔ ۔۔۔۔۔ اور پھر انھیں چند چہرے یاد آنے لگتے۔ چاندنی میں نہائے چہرے، جن کی نگاہوں کی برچھیاں سرمے میں بجھی ہوئی نوکوں سے سینہ چھیدتی چلی جاتیں۔ میلے سے لوٹنے پر بھی دل جیسے کہیں پیچھے ہی کھویا رہتا تھا!

یہیں پر انھوں نے قریب پچاس برس پہلے، ایک میلے میں کیسرو کو دیکھا تھا۔ اور کتنی ہی دیر تک کھوئے کھوئے سے اسے دیکھتے ہی رہے تھے۔ کندن سی ملائم، تراشے ہوئے بدن والی خوابوں میں کھوئی آنکھوں والی کیسرو اپنی سہیلیوں کے ساتھ برگد کے پیڑ کے نیچے، چبوترے پر بیٹھی جلیبیاں کھا رہی تھی۔ اُن کی ہنسی کی کھنک اور چوڑیوں کی چھنک چاروں طرف بکھر رہی تھی۔ مگر گجے سنگھ اپنے گرد و پیش سے بے خبر بُت سے بنے صرف اسی کی جانب دیکھے جا رہے تھے۔ کیسرو کی ایک سہیلی نے اسے ٹھوکا دے کر کہا تھا ——

"اری دیکھنا، یہ کہیں تمھیں اٹھا کر ہی نہ لے جائے!"

ٹھاکر صاحب کے کانوں میں یہ جملہ پڑا تو وہ اپنے آپ میں آگئے۔ کیسرو کے ہونٹوں پر کھینچی ہوئی ہنسی کی باریک سی لکیر انھیں نظر آئی تھی یا نہیں، یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ مگر وہ اپنی گھوڑی کی باگ موڑنے ہی لگے تھے کہ ایک اور گھوڑی اُن کی گھوڑی کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی ——

"کیسرو!"

نو وارد گھوڑ سوار نے بڑے رُعب سے پکارا تھا اور اس کے بعد بڑی تیز نظروں سے ٹھاکر گجے سنگھ کی جانب دیکھا تھا۔ ٹھاکر کچھ دُور نکل آئے تھے کہ نو وارد اپنی گھوڑی کو ایڑی لگا کر راستے میں ہی اُن تک آ پہنچا تھا۔ اور اُن کی بگی گھوڑی سے جوڑتے ہوئے بولا تھا ——

مہینے رہتا تھا۔ گاؤں کے لڑکے دِن بھر اس میں مچھلی پکڑنے کے لئے بنسی ڈالے رہتے

تھے۔ ندی کے پار کوئی چار چار کوس تک پھیلا ہوا جنگل تھا۔ یہ اتنا گھنا جنگل تھا کہ اس

کو "شکاریوں کی جنت" کہا جا سکتا تھا۔

ٹھاکروں کا گھر اصلی بستی سے کچھ فاصلے پر قدرے بلندی پر واقع تھا۔ جیسے

باقی مکانوں کا پہرہ دے رہا ہو! گھر کی کھڑکیاں اور جھروکے گاؤں کی جانب کھلتے تھے۔

اور یوں لگتا تھا جیسے وہ پورے گاؤں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ شام ڈھلنے پر ان کھڑکیوں

اور روزنوں سے نکلتی ہوئی روشنی گاؤں کے اندھیروں سے گزرتی، کھیتوں میں سے

چھن کر ندی کے پانی پر زرد چھینٹے سے بکھیرتی تھی اور اس کے بعد گھنا جنگل شروع

ہو جاتا جہاں اندھیرے کی حکومت تھی، کالی سیاہ تاریکی کی۔

ٹھاکر گجے سنگھ اپنے دیوان خانے میں لالٹین کی زرد مدقوق روشنی میں فرشی

پائیوں والے اپنے پلنگ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ زندگی کے ستّر

زینے طے کر چکے ہیں اور ستّرویں زینے پر کھڑے جب وہ نیچے کی طرف دیکھتے ہیں، تو

سبھی زینے اُنھیں اپنے سامنے بچھے ہوئے سے نظر آتے ہیں۔ وہ سر نیوڑھائے افسردہ سے

بیٹھے بیتے دِنوں کو یاد کرتے ہیں۔ دِل حسرتوں سے بھرا ہے۔ اُن کی آنکھوں کے نیلے

بلّوروں میں، جن پر گزرے دَور کی تہیں چڑھ آئی ہیں، ایک چمک سی اُبھر آئی ہے،

اُن کے ذہن سے نکل کر وہ بے شمار مقامات اور چہرے اُن کے سامنے گھومنے لگتے

ہیں جو اُن کی زندگی سے کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے ہیں۔

اُن رنگین میلوں کی گہما گہمی اب بھی اُن کے کانوں سے ٹکراتی رہتی ہے جن میں کہیں بھجن

اور گیت گونجتے تھے اور برچھیاں و کلہاڑے چلا کرتے تھے۔ وہ دنگل — جن میں کسے اور

کمائے ہوئے بدن ایک دوسرے سے بھڑ جانے کے لئے اُتاولے ہو کر اُچھل اُچھل جاتے تھے،

وہاں بجنے والے ڈھول کی آواز اُنھیں صاف سُنائی دیتی اور وہ اپنی بگّی گھوڑی کو

تھامے دوڑ کے لئے تیار کھڑے تھے۔ گھوڑے ایک پل بھی ساکن ہو کر نہیں ٹھہرتے تھے۔ رومال سنگھ انھیں دیکھ کر یوں ہنسا تھا جیسے اُسے اُن کے پہنچنے کی اُمید نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد اُس نے ٹھاکر کو اشارے سے اپنی جانب آنے کو کہا تھا۔ ٹھاکر صاحب جب اُس کے قریب پہنچے تو اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُنھیں ایک طرف دیکھنے کی دعوت دی۔ گجے سنگھ نے دیکھا کہ چوگان کے ایک سرے پر، آم کے چبوترے پر عورتوں کا ہجوم تھا جن میں کیسرو بھی اپنی سہیلیوں سمیت موجود تھی۔

اتنی دیر میں ایک سنجیدہ سا شخص بھیڑ میں سے نکل کر آگے بڑھ آیا تھا۔ ڈھولوں کی گھن گرج لمحہ بھر رُک گئی۔ اُس شخص نے آٹھوں سواروں کے نام اور اُن کے گاؤں کا تعارف کرانے کے بعد ان سب کو ایک ایک سرخ جھنڈی تھما دی تھی۔ سواروں کو یہ جھنڈی چوگان سے تقریباً تین کوس کے فاصلہ پر بنے ہوئے دیوی کے مندر میں چڑھا کر واپس پہنچنا تھا!

جب اُس سنجیدہ شخص نے تمام سواروں کو تیار رہنے کا حکم دیا تو سارے مجمع میں خاموشی طاری ہو گئی۔ پھر اُس نے ڈھول بجانے والوں کو اشارہ کیا اور پورے چوگان میں دھمک سی پیدا ہو گئی۔ رومال سنگھ اور گجے سنگھ کی نگاہیں آم کے درخت والے چبوترے پر جا کر لوٹ آئی تھیں اور گجے سنگھ کے تمام بدن میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی تھی۔

"جے دیوی!" اُس شخص نے نعرہ بلند کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سبھی سوار اپنی اپنی جھنڈی لہراتے، ہوا کو چیرتے آگے بڑھ گئے تھے۔

کچھ دیر تک سب تماشائیوں کی نگاہیں گھوڑ سواروں کا تعاقب کرتی رہی تھیں۔ اور اس کے بعد تمام سوار ایک ایک کر کے کھیتوں اور پودوں میں غائب ہو گئے تھے۔ ڈھول خاموش ہو گئے اور بھیڑ میں دوبارہ کھسر پھسر ہونے لگی تھی۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر بکھرنے بھی لگے تھے ـــــ

تھوڑے عرصہ کے بعد ہجوم میں دوبارہ ہل چل مچ گئی۔ گجے سنگھ کی بگی گھوڑی اور

"میرا نام رُومال سنگھ ہے۔ میں دریا والے شہر کے پاس رہتا ہوں۔"

جب ٹھاکر صاحب نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تو اُس نے اُن کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "تم نے کیسرو کو آج دیکھا ہے اور مجھے اُس کو دیکھتے بہت عرصہ ہو چکا ہے۔ ہم دونوں میں سے ایک شخص کو راہ سے ہٹنا پڑے گا!"

اور پھر لمحہ بھر رُک کر اُس نے اپنی بات جاری رکھی تھی ——

"تم بھی گھوڑ سواری کے شوقین معلوم ہوتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ ہمارا انصاف یہ گھوڑیاں ہی کریں گی! دوپہر کے وقت ہونے والی گھوڑ دوڑ میں آجانا۔ اگر تم جیت گئے تو میں تمھارے رستے سے ہٹ جاؤں گا اور اگر میں جیتا تو تم —— ٹھیک ہے نا؟"

اُس نے سوال کیا تھا۔ مگر ٹھاکر گجے سنگھ نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ رُومال سنگھ نے ایک اور سوال کر دیا ——

"لیکن تم نے اپنا نام، ٹھکانہ تو بتایا ہی نہیں؟"

"ٹھاکر گجے سنگھ!" —— ٹھاکر نے جواب دیا تھا اور رُومال سنگھ پھر ٹھاکر کے آگے بڑھ کر بولا تھا ——

"میاں! گھوڑی کو نشہ پلا کر میلہ میں نچانا اور بات ہے۔ مگر شرط بد کر دوڑ لگانا دوسری بات ہے! دوپہر کو تمھارا انتظار کروں گا۔ وقت پر پہنچ جانا۔"

یہ کہہ کر رُومال سنگھ نے گھوڑی کو ایڑ لگائی تھی اور گرد اُڑاتا میلے میں کھو گیا تھا۔ ٹھاکر گجے سنگھ حیران و ششدر رہ کر سوچتے رہے کہ کیا کیا جائے!

گھوڑ دوڑ سے وہ ڈرتے نہیں تھے۔ لیکن اُنھیں اس خیال سے ہی شرم محسوس ہونے لگتی تھی کہ یہ سب ایک لڑکی کے لئے کیا جائے! اور پھر اُن کے سامنے کیسرو کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک سوچوں کے ریشمی تاروں میں پھنسے رہے تھے۔

جس وقت وہ چوگان میں پہنچے تو قریب سات سوار اپنے اپنے رہواروں کی باگیں

ایک واری کئی گھاؤ

ڈاکٹر منوج

جیل کے گھڑیال نے چار بجائے۔ پریتو نے اپنی کوٹھڑی میں کروٹ بدلی "سالے اکتنے زور سے گھنٹے بجاتے ہیں۔ مانو شہر کے سارے لوگ ہر دم اسی سے گھڑیاں ملانے کے انتظار میں رہتے ہوں۔"

"پہرے دار رت جگے کا سارا غصہ گھنٹے پر ہی نکالتا جان پڑتا ہے یا سوچتا ہوگا، اگر زور سے بجاؤں گا تو جیلر صاحب خوش ہوں گے کہ باقی پہرے داروں کی طرح یہ ڈیوٹی کے دوران سونے کا عادی نہیں۔"

پریتو اپنے بستر پر سے اٹھا اور کونے میں پڑی صراحی کو منہ لگا کر تین چار گھونٹ لے لیے۔ "چھوٹی ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ یہاں دوسرا کون آتا ہے پانی پینے۔"

لوہے کی سلاخوں میں سے باہر جھانکا۔ برآمدے میں ہلکا سا بلب روشن تھا۔

اُس سے کچھ فاصلے پر دوسرے گھوڑے دکھائی دینے لگے تھے۔ چوگان سے کچھ ہی فاصلے پر پہنچے تک بجے سنگھ اپنے دیگر ساتھیوں سے خاصا آگے نکل آئے تھے کہ پیچھے سے ایک تیز خنجر سنسناتا ہوا اُن کے کان سے چھوتا ہوا لوگوں کے گھیرے کے پاس آگرا۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر خنجر اُٹھا لیا تھا اور ایک سوار اپنے گھوڑے کی باگیں ایک دم موڑ کر دور نکل گیا تھا۔

پھر اُن کے گاؤں کے بانکے گبرو ٹھاکر کے پیچھے پیچھے ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑہ ناچتے چوگان کے چکر لگانے لگے تھے۔ آم کے پیڑ والے چبوترے کے قریب پہنچے تو چوڑیوں کی جھنکار اور قہقہے اُن کے کانوں میں بھی پڑے تھے مگر وہ گردن اُٹھا کر اُس جانب نہیں دیکھ سکے تھے ـــــــ کیسرو اُنھیں پھر کبھی نہیں ملی۔ لیکن جب بھی اُس کی یاد آجاتی، اُن کے دل پر ایک لکیر سی کھنچ جاتی تھی۔ میلہ کی رنگین چہل پہل اور گہما گہمی اُن کے کانوں میں گھنگنے لگتی اور وہاں اُڑتی ہوئی گرد و غبار کی خوشبو اُن کے نتھنوں میں سما جاتی۔ پھر کیسرو کا چاند میں نہایا چہرہ آہستہ آہستہ اُسی دھول میں غائب ہو جاتا اور ایک دوسرا چہرہ اُن کے سامنے آکھڑا ہوتا۔ رومال سنگھ لنگیہہ کا چہرہ ـــــــ اُس سے بھی اُن کی کبھی دوبارہ مُلاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچتے ـــــ "کیا بانکا گبرو سرپھرا جوان تھا رومال سنگھ بھی ـــ" اور یہ سوچتے ہی اُن کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ کی ایک مہین سی لکیر کھنچ گئی ـــــــ اُنھیں خبر تک نہ ہوئی کہ اُن کی بیوی کس وقت دیوان خانے میں آئی چونک کر اس طرح اُس کی جانب دیکھنے لگے جیسے چوری کرتے پکڑے گئے ہوں۔ بیوی نے اُن کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا ـــــــ

"کن سوچوں میں پڑ گئے ہیں آپ؟"

"اری بہت عرصہ ہوا۔ میلے میں دو شخص ملے تھے اور بس اُسی میلے میں ہی کھو گئے کہیں! پھر نہیں ملے!!" ـــــ ٹھاکر صاحب کہہ تو گئے مگر اُنھیں اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے شرم سی آنے لگی تھی ::

{ڈوگری سے ترجمہ: کرن کاشمیری}

پریتو نے پھر کروٹ بدلی۔ اُس نے بھی انسان کو مارا تھا۔ اُسے اپنے چچا شوبھا رام کی ادھ کٹی گردن یاد آگئی۔ "وار تھا مضبوط مگر قدرے ترچھا۔ میں اگر تھوڑا لمبا ہوتا تو وار ضرور سیدھا پڑتا۔ اور گردن کٹ کر فرش پر جا گرتی!"

"اگر گردن پوری کٹ کر نیچے جا گرے تو درد کا احساس کون سے حصّے کو ہوتا ہوگا؟ کٹی گردن کو، یا دھڑ کو؟ خیر جی، یہ تو وہی جان سکتا ہے جس کی گردن کٹے۔ مگر وہ بھی کسی کو کیونکر بتا سکتا ہے۔ مرنے میں کون سی دیر لگتی ہے؟"

چچا کی گردن پر پڑا ترچھا وار پھر اُسے صاف صاف نظر آنے لگا۔ پریتو کے دماغ میں پھر وہی کہانی اُبھرنے لگی۔ پرانی یادیں تصویریں بن بن کر پھر زندہ و جاوید ہونے لگیں۔ وہ حیران تھا کہ آخر اس قدر تیزی کے ساتھ حملہ کرنے میں کیسے کام یاب ہو سکا!

"چچا طاقت ور تھا۔ مجھ ایسے دو تین آدمیوں پر حاوی ہو سکتا تھا۔ مگر وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کچھ کروں گا۔ مجھے اچانک کیا ہو گیا تھا؟ دیوار پر لٹکے تبر پر صرف ایک نظر ڈالی۔ اندھیرے میں بھی کیسا چمک رہا تھا۔ اُسے اُتار کر پل دو پل کھڑا رہا تو برقی لہر سی تن بدن میں دوڑ گئی۔ دل و دماغ میں ہل چل سی مچ گئی۔ تبر کے دستے پر ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ کان تپنے لگے۔ گلا خشک ہوتا گیا۔ سر کے بال یکایک کھڑے سے ہو گئے۔ ایک ہی ٹھوکر سے دروازہ کھول کر تیزی سے چچا کی طرف لپکا۔ چراغ کی مدھم روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پاس پہنچتے ہی میں نے ایک بھرپور وار کیا اور آن کی آن میں اُس کی گردن لڑھک گئی۔ ایک ہی جھٹکے سے تبر کھینچا تو خون کے فوارے نے چھت کو چھو لیا۔ ماں پہلے سے چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتی ہوئی۔ منہ پوری طرح کھلا تھا۔ دونوں بازو ہوا میں پھیلے تھے۔ مانو میں اُسے ہی قتل کرنے والا تھا۔ ماں نے زور سے آواز دی — "ارے ...... ارے۔" پر اتنے میں، میں وار کر کے تبر کھینچ چکا تھا۔ تبر کھینچنے سے گھائل جسم کو دھکا سا لگا۔ اور وہ

اپنے علاقے کے سپاہیوں نے بتایا کہ گئے برس ہمارے گاؤں میں بجلی لگ گئی۔ وہاں بھی بلب جل رہے ہوں گے۔ خود جاکر دیکھ لیں گے۔ دو ایک برس کی ہی تو بات ہے۔ سات سال کٹ گئے۔ دو تین اور ہیں۔ باقی معاف۔ بس عمر قید کٹی سمجھو۔"

پرتیو پھر سے بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے چادر بھی اوڑھ لی۔

"اب نیند کہاں آئے گی۔ سالے گھنٹہ بھی آہستہ نہیں بجا سکتے۔"

پرتیو نے آنکھیں موند لیں۔ اُسے پولیس والوں کی پہلی پٹائی یاد آ گئی۔ "سات سال بیت گئے، پر ویسی پٹائی آج تک دیکھی نہ سُنی۔ پہلے ہی چانٹے پر سالا پیشاب نکل گیا تھا۔ ایک ساتھ اتنے ان جان آدمی دیکھ کر سہم گیا تھا شاید۔ اور پھر عمر بھی کیا تھی؟"

"کیا عمر تھی بھلا؟ پندرہ سولہ برس کا تھا۔ پندرہ... اور سات ہوئے بائیس۔ زیادہ سے زیادہ تین چار اور ــــــ کُل ملا کر ہوئے پچیس[25] یا چھبیس[26]۔ جیل سے چھُوٹنے پر بھی کوئی خاص زیادہ عُمر نہیں ہوگی۔ باہر نکل کر بھی کافی جیوں گا۔ شروع شروع میں لوگوں نے تو ڈرا دیا تھا۔ کہتے عمر قید سے کیا کم سزا ہوگی اور عمر قید صرف چودہ برس کی ہوتی ہے۔ مانو آدمی کی عمر چودہ سال سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی۔ پر لوگ بھی ٹھیک ہی سوچتے ہیں، اس جیل میں سالے جس طرح کام لیتے ہیں اور جو کچھ کھانے کو دیتے ہیں، اُسے دیکھتے ہوئے چودہ سال صحیح سلامت کاٹنے کا دم خم کسی میں ہی ہے۔ اپنے ایسی پکی ہڈیاں ہی کاٹ سکتی ہیں۔ کوئی کمزور سا آ پھنسے تو چار برس میں ہی ختم ہو جائے! اُس کی عمر قید صرف چار برس۔ اور باقی؟ باقی سب معاف۔"

دوسری طرف والے مزے کرتے ہیں۔ کام ہلکا اور خوراک بھی بڑھیا۔ اے کلاس جیل۔ بی کلاس جیل اور چارسے والا جہنم۔ بی اے پاس کو بی کلاس جیل۔ کمال کے قانون بناتے ہیں یہ۔ تو سوچو سالو کہ آخر مارا تو اُس نے بھی انسان ہی ہے!"

"دیور جی! ذرا اِدھر تو آؤ..... رام سرن - بھیا جلدی آ۔ جانے اندر کیا ہو رہا ہے..."

میں بُت بنا کھڑا رہا۔ دھیرے دھیرے محلے میں ہل چل بڑھتی گئی۔ شور میں اضافہ ہوتا گیا، چچا کی لاش ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔

پریتو نے آنکھیں کھولیں، پھر میچ لیں۔ اتنا طویل عرصہ گزرنے کے باوجود اُسے ایک ایک بات ٹھیک سے یاد تھی۔ سارا کام دو منٹ سے بھی کم وقت میں ہو گیا تھا۔ لیکن یاد کرنے لگتا تو گھنٹوں یاد کرتا رہتا۔ ان سات برسوں میں شاید ہی کوئی ایسا دن ہو گا جب اُسے وہ واقعہ یاد نہ آیا ہو!

چچا کو پتہ تو چل گیا ہو گا کہ اُسے میں قتل کرنے لگا ہوں۔ اگر پتہ نہ چلا ہو گا تو پھر بدلہ کیسا؟ جانے اُسے پہچاننے کا موقع بھی نصیب ہُوا یا نہیں؟ تبر کی چوٹ پڑنے کے بعد وہ کچھ سوچ بھی سکا ہو گا یا نہیں؟ ہاں مجھے یاد ہے کہ چوٹ پڑنے پر پل بھر پہلے چچا نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اور اُس کی آنکھوں میں خوف جھلک رہا تھا۔ تبر کو لہراتے دیکھ کر اُس کے بازو اُوپر کو اُٹھے اور مُنہ سے کانپتی آواز ــــــ "ارے ــــــ"۔ بس وہ اتنا ہی بول پایا تھا۔ وقت چاہے ایک سیکنڈ سے بھی کہیں کم مِلا ہو گا مگر اُسے معلوم تو ضرور ہوا ہو گا کہ یہ کِس گناہ کی سزا مِل رہی ہے!"

مجھے دیکھ لینے اور چوٹ لگنے کے درمیان کا معمولی سا وقفہ اُس نے کیسے کاٹا ہو گا؟ تبر کے وار سے ٹھیک پہلے پل بھر اُسے اپنی موت کا سایہ نظر آیا ہو گا۔ تبھی تو اُس کی آنکھوں میں ڈر تھا۔ خوف و ہراس تھا۔ تیز دھار والے تبر نے جب اُس کی گردن کو چھُوا ہو گا اور اُسے کاٹتا ہوا اندر دھنسا ہو گا، تب تو چچا نے سوچا ہو گا کہ پریتو بدلہ لے رہا ہے!"

"اگر اُس دِن بچ بھی جاتا تو پھر کبھی قتل کر دینا تھا اُسے۔" پریتو کو یقین تھا کہ چچا کی موت اُسی کے ہاتھوں ہو گی!

گرنے لگا۔ گردن ایک طرف لڑھکی ہوئی، خون سے لتھڑے ماس میں سے کٹی ہوئی ہڈی جھانکتی سی، دونوں ہاتھ پورے کھلے اور اوپر کو اُٹھتے ہوئے۔ ٹانگیں چوڑی اور اکڑی ہوئی۔ جیسے پی ٹی کرتے اسکول کے بچّوں کی ہوتی ہیں۔ گرنے سے پہلے دھڑ ڈگمگایا۔ لڑکھڑاتے قدم تیزی سے آگے بڑھے اور سامنے کی دیوار سے ٹکرا کر وہ فرش پر جا گرا۔ وہ ابھی ہاتھ پاؤں پٹک ہی رہا تھا کہ ماں چلّائی ــــ "یہ تو نے کیا کیا؟ ـــــ یہ کیا کر دیا تو نے۔۔۔؟"

طاقچے میں جلتے دیئے کی لَو پھڑپھڑائی۔ تبر ایک بار پھر ہوا میں لہرایا۔ اور ایک وار ماں پر کر دیا۔ اب کے نشانہ چوک گیا اور ماں چارپائی پر سے اُٹھ کر پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ آنگن میں کھلنے والے دروازے کی کنڈی چچا نے اندر آتے وقت بند کر دی تھی اور میری کوٹھڑی میں سے باہر جانے کا راستہ تھا ہی نہیں۔ ماں ڈری سہمی سی اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے ایک کونے میں دُبک گئی۔ آنکھیں میچ کر اور دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے وہ زور زور سے چیخنے لگی ــــ "ہائے! مجھے مار ڈالا۔۔۔ ۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ مجھے بچاؤ۔۔۔"

میں نے تبر اوپر اُٹھا کر وار کرنے سے پہلے ماں پر ایک نظر ڈالی تو پل بھر میں یادوں کی ایک بارات سی میرے دماغ میں اُبھر آئی۔ اُٹھے ہوئے ہاتھ خود بخود جھکتے گئے۔

"آخر اس کا کیا قصور ہے؟"

ماں لگاتار چیختے جا رہی تھی۔ جی میں آیا اسے منع کروں۔ مگر زبان تھی کہ جو ہلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ گلا، منہ ایک دم خشک ہو چکا تھا۔ سوچا تبر پھینک دوں۔ پھر محسوس ہوا کہ بند ہاتھ اب کبھی کھل نہ پائیں گے!

اچانک کسی نے ڈیوڑھی کھٹ کھٹائی ـــ "دروازہ کھولو۔ کیا ہوا؟ دروازہ کیوں نہیں کھولتے؟" چاچی کی گھبرائی ہوئی آواز گونجنے لگی۔ ماں خاموش ہو گئی اور چپ چاپ مجھے گھورنے لگی۔ دروازہ کھولنے کی ہمت اس میں کہاں تھی۔ چاچی نے دروازے کو دو تین زور زور کے دھکّے دیئے مگر وہ کھل نہ سکا۔ اُس نے پڑوسیوں کو پکارنا شروع کر دیا۔

یا ناک صاف کرلیتی۔ اور پھر سویٹر بُننے لگتی۔ پر یتو کی اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کا سوتا پھوٹ نکلا۔ اُس کے دل میں مانو خوف و ہراس نے ڈیرہ جمالیا تھا۔ اچانک اُسے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ وہ اکیلا ہے، بالکل اکیلا۔ اُسے بیتی باتیں رہ رہ کے ستانے لگیں۔ اُسے یاد آیا منگو نے ایک بار کہا تھا۔ "جا۔ جا، تیرے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ تیری ماں بدمعاش ہے۔" وہ آہستہ آہستہ لوٹا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ مگر اُس کی آنکھوں کی نیند کسی نے چُرالی تھی۔ رات بھر جاگتا رہا۔ صبح جلدی جلدی اسکول جانے کی تیاری کی۔ ماں جب کھانا کھلا رہی تھی تو پر یتو نے محسوس کیا کہ یہ اُس کی ماں نہیں، کوئی اجنبی سی عورت ہے۔ اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ ماں کی ہر بات جھوٹی ہے، فریب ہے!

گھر سے نکل کر وہ اسکول کی طرف چل پڑا۔ اسکول ساتھ کے گاؤں میں تھا۔ ابھی آدھے راستے میں ہی پہنچا تھا کہ اُس کے قدم رُک گئے۔ آج اسکول جاتے ہوئے اُسے شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں اس وہم نے جنم لیا کہ رات کا واقعہ اُس کے سبھی ساتھیوں نے اُس کے ساتھ کھڑے ہو کر دیکھ لیا ہے۔ سوچوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے ساتھی پہلے سے سب کچھ جانتے تھے اور "بدمعاش۔ بدمعاش"، کی رٹ لگاتے رہتے تھے۔ چمپا جب ماسٹر کے ساتھ کھیت میں مُنہ کالا کرتی پکڑی گئی تھی، تب گاؤں والوں نے اُن کی کیا گت بنائی تھی۔ اگر ماں اور چچا بھی پکڑے گئے تو کیا ہوگا؟ اُنھیں بھی گاؤں چھوڑنا پڑے گا۔ اُسے یہ سوچ کر بھی ڈر محسوس ہوا۔ وہ کسی کو مُنہ تک نہیں دِکھانا چاہتا تھا۔ وہ کھیتوں کی جانب لوٹ آیا اور آم کے پیڑ کے نیچے اکیلا بیٹھ گیا۔ آج وہ پہلی بار اسکول سے بھاگا تھا۔ اس لئے ہلکا سا کھٹکا سُن کر بھی اُس کا دل دہل جاتا تھا۔ دوپہر کے بعد لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے ایک آدمی اُسے اپنی طرف آتا دِکھائی دیا۔ وہ اُس کا چچا تھا۔ شاید اُس کی نظر پر یتو پر نہ پڑتی مگر گھبراہٹ میں وہ وہاں سے اُٹھا اور جھاڑیوں کی طرف لپکا۔ چچا نے اُسے دیکھ لیا۔

ماں پر اب ناراض نہیں تھا۔ سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی جب بے چاری بیوہ ہوگئی۔ کوئی پوچھنے والا تک نہ تھا اور گود میں معصوم بچہ تھا۔ چچا کا سہارا نہ لیتی تو زندہ کیسے رہتی؟ چچا نے اُن کی زمین، جائداد اور مکان تک پر قبضہ کرلیا۔

پریتو سوچ رہا تھا کہ جب سے ہوش سنبھالا، ماں نے کبھی اُسے اپنے ساتھ نہیں سُلایا۔

"بہادر بچے اکیلے سوتے ہیں۔ میرا لاڈلا کوئی ڈرپوک تھوڑی ہے۔" وہ اُسے ہمیشہ ساتھ والی کوٹھڑی میں سُلاتی تھی۔

اکثر ڈر کر پریتو ماں کے پاس سونے کی ضد کرتا۔ تو وہ گھڑی بھر اُسے اپنی چارپائی پر لٹاتی۔ جب اُس کی آنکھ لگ جاتی تو پھر ساتھ کی کوٹھڑی میں چھوڑ آتی۔

پریتو کا ماتھا تب ٹھنکا تھا جب وہ چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ لڑائی جھگڑا ہونے پر لڑکے اُسے طعنہ دیتے "تمھاری ماں بدمعاش ہے۔"

اُن ہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک رات اچانک اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ ساتھ کے کمرے سے عجیب و غریب سرگوشی سُنائی دی۔ وہ خوف سے کانپنے لگا۔ ہمت بٹور کر چارپائی سے اُٹھا اور اندھیرے میں بھٹکتا ہوا مشکل سے دروازے تک پہنچا۔ دروازے کی دراز سے جھانکا تو کمرے میں گُپ اندھیرا تھا۔ کچھ دِکھائی نہیں دیا۔ ایکا ایک چارپائی پر سے کسی کے اُٹھنے کی آواز سُنائی دی۔ پھر باہر والا دروازہ کھُلا اور پریتو نے ہلکی روشنی میں کسی کو باہر نکلتے دیکھا اور پہچان بھی لیا۔ وہ آدمی پریتو کا چچا تھا۔

اُسے یوں لگا جیسے کسی نے اُس کا دِل ہاتھوں میں دبوچ کر نچوڑ دیا ہو۔ وہ پسینے میں شرابور ہوگیا۔ ڈر اور شرمندگی کے احساس کی شدت سے وہ بوکھلا اُٹھا۔ دروازہ ابھی کھُلا پڑا تھا۔ ماں اُٹھی۔ دروازہ بند کیا۔ دِیا جلایا اور بستر ٹھیک کرنے لگی۔ پھر چارپائی پر بیٹھ کر پریتو کا سویٹر بُننے لگی۔ دِیئے کی روشنی میں پریتو نے دیکھا ماں رو رہی ہے۔ کوئی آواز نہیں مگر آنسو ہیں کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے۔ کبھی کبھار وہ ڈوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھ لیتی

دیاہے۔ یہی حال رہا تو پانچ جماعتیں بھی پاس نہیں کر پائے گا۔" یہ کہتا کہتا چچا مویشیوں کے باڑے کی طرف چلا گیا۔

اتنے میں چچی بھی باہر آ چکی تھی۔ ماں کی طرف گھور کر بولی ــ "یہ خاک سمجھائے گی۔ جو خود رنڈاپے میں بھی رنگ رلیوں سے باز نہیں آتی۔ باپ کا پھل پل کر ہی رہتا ہے۔"

چچی اپنے کمرے میں لوٹ گئی۔ ماں اور چچی آپس میں بولتی نہیں تھیں۔

پرتیو کو یقین تھا کہ آج ماں اُسے خوب پیٹے گی اور وہ پٹائی کے لئے تیار بھی تھا۔

"آ اندر آ جا!" ماں نے بلایا۔ وہ اُٹھا اور نظریں جھکائے اندر چلا گیا۔ اب آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ ماں نے مٹی والے ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے رے، آج تو اسکول کیوں نہیں گیا؟ سچ سچ بتا دے!"

پرتیو خاموش رہا۔ ماں ہاتھ دھو کر پاس آئی۔ ادھ گیلے ہاتھوں سے اُس کی گردن پکڑ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "نہیں میرے بچے! ایسا نہیں کرتے۔ ماسٹر مارتا ہے کیا؟" یہ کہتے کہتے ماں نے اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا۔ "تیرے بغیر اور کون ہے میرا؟ تیرا باپ زندہ ہوتا تو یہ حالت نہ ہوتی ہماری۔ تو بڑا ہوگا۔ پڑھ لکھ جائے گا۔ تو دو دن میں بھی آرام سے کاٹ لوں گی۔ اگر اَن پڑھ رہ گیا تو لوگ کیا کہیں گے.... ....کس کا بیٹا ہے یہ؟ باپ نہیں رہا تو ماں نے بگاڑ ڈالا۔"

پرتیو نے ماں کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ سامنے کی دیوار کو گھور رہی تھی۔ جانے کیا دیکھ رہی تھی وہاں۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ پرتیو سے نہ دیکھا گیا۔ اُس کی آنکھوں سے بھی آنسو پھوٹ نکلے۔ وہ زور زور سے سسکنے لگا۔ رونے لگا۔ ماں نے اُسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا تو پرتیو نے محسوس کیا کہ ماں سانس روک روک کر سسکیوں کے اُمڈتے سیلاب کو روکنے کی کس قدر کوشش کر رہی ہے۔

"ہائے میں مر جاؤں! یہ تیرے گھٹنے کو کیا ہوا؟ تو نے بتایا کیوں نہیں بیٹا؟

"پرییتو ــــ!" چچا کی غضب ناک آواز سُن کر وہ گر پڑا۔ اور دہشت سے اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اُس کا گھٹنا چھِل گیا تھا۔ اُس نے سنبھلنا چاہا۔ مگر چچا قریب پہنچ چکا تھا۔ پرییتو چچا سے پہلے بھی پٹ چکا تھا۔ مگر ایسے اُس کے خوف کا عالم کچھ اَور ہی تھا۔ زمین پر اوندھے پڑے اُسے چچا کا جسم بڑا بھیانک سا دِکھائی دیا۔ بھوت پریت کی طرح ڈراؤنا

چچا نے زور کی ٹھوکر ماری۔ "اُٹھ کمینے! اِسکول سے کھسک کر یہاں چھپتا ہے سالے۔" اور پھر ٹھوکر کے بعد ٹھوکر ــــ "اُٹھ ... اُٹھ!"

چچا نے لکڑیوں کے گٹھے کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ مارتے وقت وہ لڑکھڑا سا گیا۔ سہما سمٹا پرییتو کھڑا ہوا۔ چچا کہہ رہا تھا ــــ "حرام زادے! اِسکول جا سکتا ہے نہ گھر کا کام کر سکتا ہے۔ چل بچّو گھر، تیری کھال نہ اُدھیڑ لی تو کہنا۔" اور ایک ہاتھ لکڑیوں پر سے ہٹا کر زور سے پرییتو کی گردن پر جما دیا۔ وہ بے چارہ دو تین قدم پیچھے لڑھک گیا۔ اور گرتے گرتے بچا۔ اِسی طرح سارے راستے چانٹے، گالیاں اور ٹھوکریں کھاتا وہ گھر تک پہنچا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے مگر زبان سے اُف تک نہ کی۔ اُس نے معافی مانگی، نہ گڑگڑایا۔ اب اُس کے دِل میں ڈر رہا تھا نہ کوئی جھجک۔

آنگن میں پہنچ کر چچا نے زور سے دھکا دیا۔ اور پرییتو لڑکھڑاتا دروازے کے قریب جا گرا۔ بستے میں سے کتابیں نکل کر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ چچا نے اُس کی ماں کو آواز دی۔ "سُن اپنے لاڈلے کی کرتوت۔ سالا اِسکول سے بھاگ کر کھیتوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ پڑھنے لکھنے والے بچّے اور ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں، چھڑا دو اس کی پڑھائی۔ گھر کا کام کاج بھی دیکھے تو غنیمت ہے۔"

ماں دہلیز پر حیران سی کھڑی تھی۔ کھُلے ہوئے بال اور مٹّی سے لتھڑے ہاتھ۔ شاید دیوار کی لپائی کر رہی تھی۔

"اسے اندر لے جا اور سُن اس کے کارناموں کا حال۔ تمھارے لاڈ پیار نے اِسے برباد کر

پھانسی کا پھندا ابھی گلے میں پڑ سکتا ہے۔ پھانسی! پرتیو کے ذہن میں رسّے سے لٹکتے

ایک آدمی کی تصویر اُبھر آئی۔ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز تک سنائی دی۔ ہاتھ پاؤں مارتا

ہوا آدمی۔ جس کی گردن لمبی ہوتی جا رہی ہے، زبان باہر نکل آئی ہے۔ رنگ نیلا پڑ گیا ہے،

آنکھیں پھٹ کر باہر آنے کو ہیں۔ اور جو ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ٹھنڈا پڑ جاتا ہے!

جب مقدمے کے فیصلے کے انتظار میں تھا، تب پرتیو نے کئی لوگوں سے پوچھا تھا کہ پھانسی

چڑھنے والے کی موت کیسے ہوتی ہے۔ پھر کئی بار خواب میں اُس نے آدمی کی لٹکتی لاش

دیکھی۔ ہر بار وہ چونک کر جاگ پڑتا!

وہ پھانسی کے پھندے کے کتنا قریب جا پہنچا تھا جس کی خاطر اُس نے یہ خطرہ مول

لیا۔ بالآخر اُس نے کیا کیا؟ ابھی مشکل سے چار برس قید کاٹی تھی کہ پرتیو کو اپنے گاؤں کے

ایک سپاہی نے اطلاع دی۔ "اب تمھیں گھر کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمھاری ماں

کسالی کے پچھن ٹھوکر کے گھر بس گئی ہے۔"

اُس دن ماں کا لحاظ کیوں کیا؟ اُسے زندہ کیونکر چھوڑا؟ کچھ دن رہ رہ کر اُسے ماں

پر غصّہ آتا رہا جو دھیرے دھیرے رحم میں تبدیل ہوتا گیا۔ آخر اُس بے چاری نے عمر بھر

رنج و الم کے سوا اور دیکھا بھی کیا ہے؟

"مجھے کتنا دُلارتی تھی۔ مجھے پال پوس کر بڑا کیا۔ پڑھایا، لکھایا۔ تاکہ بڑا ہو کر میں اُسے

آرام پہنچا سکوں۔ یہاں جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھا میں کس طرح اُس کا دُکھ، اُس کی غربت

اُس کی تنہائی کا خیال رکھ سکتا تھا؟ لوگوں نے جانے کیا کیا طعنے مارے ہوں گے! کیسے

کیسے نشتر چبھوئے ہوں گے، اکیلی عورت کا لوگ جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ چار برس بھی

اُس نے جانے کیسے کاٹے ہوں گے؟ جبھی تو ماں بچپن میں مجھے ہر دُکھ، ہر تکلیف سے بچاتی

تھی۔ اس لالچ میں کہ بڑا ہو کر میں اُسے سُکھ پہنچاؤں گا۔ اُس کی حفاظت کروں گا۔'

بنا لالچ کے کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا۔ چاہے وہ ماں ہی کیوں نہ ہو؟"

کیسے آئی یہ چوٹ میرے لاڈلے کو؟ ماں پرتیو کے زخمی گھٹنے کو دیکھ رہی تھی۔ پھر آنسو پونچھتی ہوئی اٹھی۔ اور اس شام دیر تک کبھی مرچیں پھونک کر کبھی ہلدی لگا کر پرتیو کے زخمی گھٹنے کو ٹکوریں کرتی رہی۔ اُس رات پہلی بار ماں نے اسے اپنے ساتھ سلایا۔ رات گئے چچا آیا تو بولی ــــ "آج پرتیو کو بخار ہے۔" اور پھر جانے سرگوشی میں کیا باتیں کیں! جنھیں سن کر چچا لوٹ گیا۔

اُس رات کے بعد وہ متواتر چھ سال ہر رات چچا کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ اُس کے آنے کا انتظار کرتا۔ جب تک وہ چلا نہیں جاتا' اسے نیند نہیں آتی۔ کسی کسی دن چچا نہیں آتا تھا۔ "ماں بھی چچا کا انتظار کرتی ہوگی۔ آخر کوئی کتنی زبردستی کر سکتا ہے؟ ماں کی اپنی بھی مرضی ہوتی ہوگی۔ پہلے اُس کی مرضی ہوتی تھی یا نہیں' یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن اُس رات یقیناً ماں راضی نہیں تھی۔" وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دلدل سے نکلنا چاہتی تھی۔ حسبِ معمول وہ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ چچا آیا اور پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ماں بولی: دیور جی! اب ختم بھی کیجیے یہ سلسلہ۔ پرتیو اب بڑا ہو چکا ہے!"

چچا نے اُسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ "حرام زادی! اب ستّی ساوتری بننے لگی ہے۔ پرتیو تو کب کا بڑا ہو چکا ہے۔ کوئی اور یار ڈھونڈ لیا ہے کیا؟"

پرتیو کو پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ واقعی بڑا ہو چکا ہے! اور پھر وہی ایک برقی لہر ــــ ...... دیوار پر لٹکتے تبر پر ایک نظر ...... تبر ہاتھوں میں ...... دو سیکنڈ کا وقفہ ...... دروازے کو ایک ٹھوکر ...... ایک وار ...... اور ادھ کٹی گردن لڑھکتی ہوئی ......

ــــ ٥ ٥ ٥ ــــ

جیل کے گھڑیال نے پانچ بجائے۔ پھر وہی شور! شاید گھڑیال کو زور سے بجا کر قیدیوں کو بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ جیل میں ہیں یا پھر گھنٹے گھنٹے بعد یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ تبر کا وار کرنے کے لیے دو سیکنڈ درکار ہیں۔ لیکن جرم کی سزا کاٹتے برسوں لگ جاتے ہیں۔

چکّی

اوم گوسوامی

اصل نام لقب تلے چھپ گیا ہے۔ سب اُنہیں ماسٹر جی کہتے ہیں، گھر میں بال بچے بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ اصلی نام صرف دو جگہوں پر درج ہے۔ ایک بچوں کی ولدیت کے طور پر اسکول رجسٹر میں، دُوسرے تحصیل کے احاطے میں چبوترے والے برگد پر جڑی ہوئی نیم پلیٹ پر۔ "ماسٹر جی، رجسٹرڈ شدہ عرضی نویس، تجربہ قلم گیری ۲۵ برس مسلسل" نام کے ساتھ تجربے کی مدت اُنہوں نے یونی ورسٹی کی ڈگری کی طرح جوڑ رکھی ہے۔ کہتے ہیں "غور کرنا، ۲۵ برس یعنی ایک صدی کا چوتھائی حصہ ہیں عرضیاں لکھتے ہو گیا ہے۔ فائلوں کی فائلیں لکھ چکے ہیں۔ بڑے بڑے انگلینڈ ریٹرن لوگوں کو اس قلم سے قائل کر دیا ہے۔"

روز صبح تحصیل میں آتے ہی چبوترے کو ماتھا ٹیکتے ہیں۔ ناک رگڑتے ہیں "پہاڑوں والی ماتا سارے جگت کا بھلا کرنا،، سب سے پہلے آنا اور سب کے بعد میں جانا۔ بس اسٹاپ سے

"میں نے ماں کی خاطر چچا کا قتل نہیں کیا۔ میں نے اُس کے لئے یہ قربانی نہیں دی۔ میں نے خود اپنا بدلہ لیا ہے۔ اپنے اُس ناقابلِ برداشت بوجھ کو ہلکا کرنے کی غرض سے، جسے لگاتار چھ برس ڈھوتے ڈھوتے میں بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ چھ سال تک ہر رات اندھیرے کمرے کے دروازے کی درار سے جھانک جھانک کر میں نے چچا کا انتظار کیا۔ وہاں کھڑے کھڑے میں نے جو بے عزتی، جو تکلیف برداشت کی ہے، اُسے بیان کرنا مشکل ہے۔ چارپائی کی چرمراہٹ ...... چچا کے تیز تیز سانس ...... اُس کی کھانسی ...... وہ سرگوشیاں ــــ یہ سب میں نے چھ برس تک کس طرح سہا، اس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ اُس منحوس گھڑی اگر محلے میں کسی کی آہٹ تک سُنتا تو کانپ کانپ جاتا۔ صرف اس ڈر سے کہ کہیں کوئی میری ماں کو چچا کے ساتھ مُنہ کالا کرتے نہ دیکھ لے۔ یہ وہ بے پناہ تکلیف تھی جو تبر کے سو وار بھی نہیں پہنچا سکتے۔ میں نے چچا کا خون کر کے ماں پر کوئی احسان نہیں کیا۔ ماں کو تو میں نے زیادہ مجبور اور تنہا کر دیا۔ اُسے تڑپتا ہوا چھوڑ آیا۔ اُس نے جو کچھ کیا، مناسب کیا۔

"مرد کے سہارے کے بغیر عورت جی نہیں سکتی۔ خاوند نہ رہے تو کوئی بہن بھائی سہی، کوئی رشتے دار ہی ہو، بیٹا بیٹی ہو۔ اور اگر کوئی نہ رہے تو پھر لچھمن ٹھوکر ہی سہی!"

اور پھر پرتیو سوچنے لگا کہ جب وہ جیل سے چھوٹ کر گھر جائے گا تو جانے ماں اُس سے ملنے آئے گی بھی یا نہیں!

ــــــــــــ {ڈوگری سے ترجمہ: جتیندر شرما}

اُن کے جسم توڑے پر آجاتے تھے، لیکن اب وہ ٹائپ کی "ٹپ ٹپ" کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں
صرف ظاہری ٹپ ٹاپ ہی رہ گئی ہے، لوگ پتلون کوسی اور ٹیبل دیکھتے ہیں۔ قلم کا اثر نہیں
پرکھتے، وہ تحصیل کے آنگن میں نظر دوڑاتے ہیں۔ اُن کی مایوس نظر مڑ کر اپنی نیم پلیٹ پر ٹک
جاتی ہے اور ۲۵ برس مسلسل کو گھورنے لگتی ہے۔

آوازیں دی جا رہی ہیں ——— "گوگال بنام تیجاں حاضر ہو۔" "ڈھیسر وہ بنام بنیرو
حاضر ہو۔" گھر سے بھوکے پیاسے نکلے ہوئے لوگ ہانپتے ہوئے اس طرح ادھر اُدھر دوڑتے ہیں جیسے
افراتفری مچی ہوئی ہو۔ آس پاس کھانے کی کوئی سبیل نہیں، پانی کی کوئی چھبیل نہیں۔ وہ سوچتے
ہیں، سوڈا لیمن یا چھولے بھٹورے کی ریڑھی لگا لیں۔ کام کافی ہے لوگ بھوک سے پریشان ہو
اُٹھتے ہیں۔ لیکن ۲۵ برس پر ٹھہری ہوئی نظر آگے نہیں جاتی۔ کیا اب ۲۵ برس سے یک
لخت ناطہ توڑا جا سکتا ہے۔ کیا اس تسلسل کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ لیکن بے کار بیٹھ کر گپیں سننے
اور سنانے سے پیٹ کی آگ نہیں بجھ سکتی۔ اگر پانی کا ایک مٹکا لایا جائے اور گتے پر لکھ دیا جائے
صرف اپنے گاہکوں کے لئے، تو شاید ... ...

اچانک ترنڈو، شگنہ پنج پور، حال ہی بستی کو آتے دیکھ کر اُن کے خیالات کا سلسلہ
ٹوٹ جاتا ہے، چہرے پر رنگت سی آجاتی ہے۔ ترنڈو کا کام وہ پچھلے دس برسوں سے کرتے
آرہے ہیں۔ ترنڈو عدالتوں کا کیڑا ہے۔ کام صرف مقدمے کرنا اور عدالتوں میں پھنسے رہنا۔ گواہی
دینا۔ اور گواہوں کا انتظام کرنا۔ ماسٹر جی کا کہنا ہے کہ کچہریوں میں پھنسے لوہے، جیسے سخت لوگوں
کو انہوں نے دھوپ میں رکھے ہوئے مکھن کی طرح پگھلتے دیکھا ہے۔ لیکن ترنڈو اپنی کلف لگی
پگڑی کی طرح اکڑتا ہی جا رہا ہے۔

دیہاتی بھائی احترام کے ساتھ ترنڈو کو "چوہدری" کہتے ہیں۔ اگر کوئی نہ کہے تو وہ اُس
کی وکیلوں جیسی خدمات سے محروم ہو جاتا ہے۔ کوئی آدمی گھر بلا کر چائے یا لسی پلا، اُس سے
مقدمے کے بارے میں مشورہ کرتا ہے۔ اور اُسے چوہدری کہنا بھول جاتا ہے۔ تو وہ خود ہی یاد کروا دیتا

لیکن اس چبوترے تک آتے جاتے، انہوں نے راستے کی سبھی باریکیوں کو پہچان رکھا ہے، کہاں پر پتھر تھوڑا سا ابھرا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اتنا کہ آنکھیں موند کر چلنے پر کبھی ٹھوکر نہ کھائیں۔ یادداشت ایسی کہ بس اسٹاپ کے پاس پڑی کھوری سل دس سال پہلے ڈھائی انچ باہر تھی، پھر وقت کا بوجھ سہتے سہتے ڈھائی انچ اندر دھنس گئی۔ ان سل پتھروں سے بھی مضبوط کئی آدمی انہوں نے دیکھے ہیں۔ وقت کی دھیمی دھیمی آنچ موم کے پتلوں کی طرح انہیں پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔ کچہریوں میں پھنسے نواب زادوں کو فٹ پاتھ کی دھول چھانتے دیکھا ہے۔ بڑے بڑوں کے ساتھ واسطہ پڑا، لیکن مجال ہے۔ جو انسان پہچاننے میں انہوں نے دھوکا کھایا ہو۔

راستے میں ایک سفید چوکور سل دیکھتے ہوئے انہیں کئی برس بیت گئے ہیں۔ اس کو دیکھتے ہی وہ ہمیشہ سوچتے ہیں کہ کبھی اسے اکھاڑ کر گھر لے جائیں۔ تو مسالہ پیسنے کے کام میں لا سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے کی ہمت، وہ ہمیشہ اگلے دن پر ٹالتے آئے ہیں۔ راستے میں کھڑے بجلی کے کھمبوں کو دیکھتے دیکھتے انہیں ان کے نمبر تک یاد ہو گئے ہیں۔ یہ بھی پتہ ہے کہ کس کھمبے کے نمبروں کا روغن کتنی لائنوں میں بہہ گیا ہے۔ افسروں کا ذکر چھڑتا ہے۔ تو پرانے افسروں کی تعریف کرتے ہوئے انہیں خاصی خوشی محسوس ہوتی ہے، ماتھے کی ایک ایک شکن، ایک ایک انداز انہیں یاد آ جاتا ہے۔ باریکی ان کی نظروں کی خوبی ہو گئی ہے۔

میلی اور بے ڈھنگی پگڑیوں سے تحصیل کا میلہ لگتا ہے، پھر حاکم اہلکار لوگ آنے شروع ہوتے ہیں۔ تحصیلدار صاحب اور نائب صاحب کو "بندگی جناب" وکیل پیشہ اور پیشکاروں کو "آداب عرض جناب!" چپراسیوں اور سپاہیوں کو "جے رام جی کی" یہ کام ماسٹر جی ۲۵ برسوں سے کرتے آئے ہیں —— "رسوخ کی بات ہے بھائی۔ اسی لئے تو افسر اہلکار احترام کرتے تھیں"۔ وہ اپنے پرانے گاہکوں کو سناتے ہیں۔ لیکن اب تو اس کام میں صرف احترام ہی رہ گیا ہے۔ من ہی من میں وہ سوچتے ہیں۔ جب سے ٹائپ والے عرضی نویس کرسیاں اور میز لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ کام آدھا بھی نہیں رہ گیا۔ پہلے اردو لفظوں والی ان کی نیم پلیٹ پڑھتے ہی۔ لوگ سیدھے

اُن کے جبو ترے پر آجاتے تھے، لیکن اب وہ ٹائپ کی "ٹپ ٹپ" کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ ہی رہ گئی ہے، لوگ پتلون کوٹ اور میٹنز دیکھتے ہیں، قلم کا اثر نہیں پرکھتے، وہ تحصیل کے آنگن میں نظر دوڑاتے ہیں۔ اُن کی مایوس نظر مڑ کر اپنی نیم پلیٹ پر ٹک جاتی ہے اور ۲۵ برس مسلسل کو گھورنے لگتی ہے۔

آوازیں دی جا رہی ہیں ——— "گوگال بنام تیجاں حاضر ہو۔" "ڈھیرو بنام بنیرو حاضر ہو" گھر سے بھوکے پیاسے نکلے ہوئے لوگ ہانپتے ہوئے اس طرح ادھر اُدھر دوڑتے ہیں جیسے افراتفری مچی ہوئی ہو۔ آس پاس کھانے کی کوئی سبیل نہیں، پانی کی کوئی چھبیل نہیں۔ وہ سوچتے ہیں، سوڈا لیمن یا چھولے بھٹورے کی ریڑھی لگا لیں۔ کام کافی ہے لوگ بھوک سے پریشان ہو اُٹھتے ہیں۔ لیکن ۲۵ برس پر ٹھہری ہوئی نظر آگے نہیں جاتی۔ کیا اب ۲۵ برس سے یک لخت ناطہ توڑا جا سکتا ہے۔ کیا اس تسلسل کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ لیکن بے کار بیٹھ کر گپیں سننے اور سنانے سے پیٹ کی آگ نہیں بجھ سکتی۔ اگر پانی کا ایک مٹکا لایا جائے اور گھتے پر رکھ دیا جائے صرف اپنے گاہکوں کے لئے، تو شاید۔۔۔۔ ۔۔۔

اچانک تر نیڈو، شکنہ پنج پور، حال نئی بستی کو آتے دیکھ کر اُن کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، چہرے پر رنگت سی آجاتی ہے۔ ترنیڈو کا کام وہ پچھلے دس برسوں سے کرتے آرہے ہیں۔ ترنیڈو عدالتوں کا کیڑا ہے۔ کام صرف مقدمے کرنا اور عدالتوں میں پھنسے رہنا۔ گواہی دینا۔ اور گواہوں کا انتظام کرنا۔ ماسٹر جی کا کہنا ہے کہ کچہریوں میں پھنسے لوہے، جیسے سخت لوگوں کو انہوں نے دھوپ میں رکھے ہوئے مکھن کی طرح پگھلتے دیکھا ہے۔ لیکن ترنیڈو اپنی کلف لگی پگڑی کی طرح اکڑتا ہی جا رہا ہے۔

دیہاتی بھائی احترام کے ساتھ ترنیڈو کو "چوہدری" کہتے ہیں۔ اگر کوئی نہ کہے تو وہ اُس کی وکیلوں جیسی خدمات سے محروم ہو جاتا ہے۔ کوئی آدمی گھر بلا کر چائے یا لسی پلا۔ اُس سے مقدمے کے بارے میں مشورہ کرتا ہے۔ اور اُسے چوہدری کہنا بھول جاتا ہے۔ تو وہ خود ہی یاد کروا دیتا

لیکن اس چبوترے تک آتے جاتے، انہوں نے راستے کی سبھی باریکیوں کو پہچان رکھا ہے، کہاں پر پتھر تھوڑا سا ابھرا ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اتنا کہ آنکھیں موند کر چلنے پر بھی ٹھوکر نہ کھائیں۔ یادداشت ایسی کہ بس اسٹاپ کے پاس پڑی کھوری سل دس سال پہلے ڈھائی انچ باہر تھی، پھر وقت کا بوجھ سہتے سہتے ڈھائی انچ اندر دھنس گئی، ان سل پتھروں سے بھی مضبوط کئی آدمی انہوں نے دیکھے ہیں۔ وقت کی دھیمی دھیمی آنچ موم کے پتلوں کی طرح انہیں گھلا کر رکھ دیتی ہے۔ کچہریوں میں پھنسے نواب زادوں کو فٹ پاتھ کی دھول چاٹتے دیکھا ہے۔ بڑے بڑوں کے ساتھ واسطہ پڑا، لیکن مجال ہے۔ جو انسان پہچاننے میں انہوں نے دھوکہ کھایا ہو۔

راستے میں ایک سفید چوکور سل دیکھتے ہوئے انہیں کئی برس بیت گئے ہیں۔ اس کو دیکھتے ہی وہ ہمیشہ سوچتے ہیں کہ کبھی اسے اکھاڑ کر گھر لے جائیں۔ تو مصالحہ پیسنے کے کام میں لا سکتے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے کی ہمت، وہ ہمیشہ اگلے دن پر ٹالتے آئے ہیں۔ راستے میں کھڑے بجلی کے کھمبوں کو دیکھتے دیکھتے انہیں ان کے نمبر تک یاد ہو گئے ہیں۔ یہ بھی پتہ ہے کہ کس کھمبے کے نمبروں کا روغن کتنی لائنوں میں بہہ گیا ہے۔ افسروں کا ذکر چھڑتا ہے۔ تو پرانے افسروں کی تعریف کرتے ہوئے انہیں خاصی خوشی محسوس ہوتی ہے، ماتھے کی ایک ایک شکن، ایک ایک انداز انہیں یاد آجاتا ہے۔ باریکی ان کی نظروں کی خوبی ہو گئی ہے۔

میلی اور بے ڈھنگی پگڑیوں سے تحصیل کا میلہ لگتا ہے، پھر حاکم اہلکار، لوگ آنے شروع ہوتے ہیں۔ تحصیلدار صاحب اور نائب صاحب کو "بندگی جناب" وکیل پیشہ اور پیشکاروں کو "آداب عرض جناب!" چپراسیوں اور سپاہیوں کو "جے رام جی کی" یہ کام ماسٹر جی ۲۵ برسوں سے کرتے آئے ہیں — "رسوخ کی بات ہے بھائی۔ اسی لئے تو افسر اہلکار احترام کرتے تھے۔" وہ اپنے پرانے گاہکوں کو سناتے ہیں۔ لیکن اب تو اس کام میں صرف احترام ہی رہ گیا ہے۔ من ہی من میں وہ سوچتے ہیں، جب سے ٹائپ والے عرضی نویس کرسیاں اور میز لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ کام آدھا بھی نہیں رہ گیا۔ پہلے اردو لفظوں والی ان کی نیم پلیٹ پڑھتے ہی۔ لوگ سیدھے

"جی پہلے میں اس کا پروسیجر پتہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"بھائی پروسیجر کیا؟ متعلقہ درخواست لِکھوا کر، پہلی مُہر میری لگے گی۔ پھر آگے دفتری کارروائی ـــ" "تقریباً کتنے دن لگ جائیں گے؟"

"دِنوں کی بات پُوچھو۔ تو میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں کہ جو ایک ہفتے میں بنوا کر لے گئے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں میں پچیس ۲۵ برس سے تحصیل کے چکر کاٹتے دیکھ رہا ہوں ـــ"

"پیسے تقریباً کتنے لگ جائیں گے؟" لڑکے نے پُوچھا۔

"بھئی جتنا گُڑ ڈالو، اُتنا میٹھا۔" لڑکے کے پاؤں پیچھے مُڑتے دیکھ کر اُنھوں نے بات بدلی "ماسٹر چُنی لال سے درخواست لِکھواؤ تو جھمیلا کم پڑتا ہے اور سرٹیفکیٹ جلدی سے۔ یہاں واحد میں ایسا عرضی نویس ہوں جس کے پاس اپنی لکڑی کی مُہر ہے، پُرانے زمانے کی۔ ورنہ ربر اسٹامپ والوں کی کوئی وُقعت ہی نہیں ... ..."

لڑکا پُوری بات سُنے بغیر ہی اُٹھ گیا تھا۔ ماسٹر جی کی آواز ہلکی سی بڑبڑاہٹ میں بدل گئی۔ وہ یاد کرنے لگے۔ صُبح دہلیز پر کِس کا مُنہ دیکھا تھا۔ اتنے میں ایک بُوڑھی عورت کو اُن کی تجربہ کار نِگاہوں نے تاڑ لیا۔ "مائی کیا بنوانا ہے؟"

"راشن کارڈ کی نقل!"

ماسٹر جی نے قلم پکڑا۔ سوچا چلو ایک اٹھنی تو آئی۔ لیکن بارہ آنے مانگوں گا تو کہیں اٹھنی اس کی جیب سے نِکلے گی۔ کاغذ پر قلم پھیرنے لگے لیکن سیاہی میں رنگ ہی نہیں تھا۔ بہت دِنوں سے پھیکی پڑ رہی تھی۔ آج رنگت ہی چھوڑ گئی۔ اُٹھ کر کرشن چندر کی طرف سیاہی لینے گئے۔ مُڑ کر آئے تو بُوڑھی کارڈ لے کر نرپت کے پاس جا پہنچی تھی!

اُنھوں نے آواز دی ـــ "لے آؤ مائی!"

اتنی دیر میں نرپت رولر میں سے کاغذ نِکال کر مائی کو پکڑانے لگا۔

دوپہر کو شوما روٹی کا ڈبّہ لے کر آ گیا۔ مُنہ ریوڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بول رہا تھا:

ہے۔ تعزیراتِ ہند کی دفعہ فلاں فلاں کے تحت اُن سے چکی نہ پسوائی تو خود کو چودھری کہنا چھوڑ دوں گا!"

اپنے پُرانے گاہکوں کو دیکھ کر ہی ماسٹر جی اپنے اس دھندے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ نہیں تو کبھی یار اس کام سے اُن کا من اوب گیا ہے۔ "سُنائیے کام کاج کیسا ہے؟" ترِیڈو پُوچھتا ہے۔

"کیا کہیں کام میں برکت ہی نہیں رہی۔ جن کو قلم پکڑنے کا سلیقہ نہیں، وہ قلم گیری کرنے لگے۔ اگرچہ بی، اے۔ ایم اے کی ڈگریاں لے کر آتے ہیں، لیکن تجربہ بھی تو کوئی چیز ہے بھائی صاحب! پانچ منٹ ٹائپ پر ٹپ ٹپ کیا اور درخواست تھمادی۔ نکالیئے جی پانچ رُوپے! لوگوں کی عقل ماری گئی ہے۔ اگرچہ مشین سے صفائی زیادہ آتی ہے لیکن دستی کام کا۔۔۔۔"

اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ماسٹر جی ترِیت لال کی طرف دیکھتے ہیں جو ٹائپ رائیٹر کے کی بورڈ پر لگاتار چوٹیں لگائے جا رہا ہے۔ پھر ذرا اُونچا بولنے لگتے ہیں۔ "وہی بات ہوئی نا امتحان میں لکھا کچھ نہیں کہ صفائی کے پانچ نمبر تو مل ہی جائیں گے۔ اسی لئے تو لوگ بے چارے تحصیل میں کام یاب نہیں ہوتے۔ درخواست میں ایسی زوردار عرض ہونی چاہیئے کہ دیتے ہی کام یابی کی اُمید ہو جائے! اُس روز پیش کار ریڈر کو سُنا رہا تھا کہ نائب صاحب مختصر کارروائی کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ درخواست بقلمِ خود کس کی ہے۔ جس پر میری مُہر لگی ہو۔ معاملہ یقیناً اُس کے حق میں ہوگا۔ تجربے کی بات ہے نا، جی۔ اپیل زوردار ہونی چاہیئے، کہتے ہیں: "ویل اسٹارٹ اِز ہاف ڈن۔" یہ کہہ کر ماسٹر جی ہنس پڑتے ہیں۔

پاس سے پینٹ کوٹ پہنے ایک لڑکا گزرا۔ غرض مند کو اُن کی نظر فوراً تاڑ لیتی ہے۔ ۲۵ برسوں میں انھیں درخواستوں کے علاوہ سیلز مین شِپ میں بھی کافی تجربہ ہو گیا ہے۔ "آیئے بابو جی! میرا ہی نام ماسٹر چُنی لال ہے۔ سَنَد یافتہ عرضی نویس۔" لڑکا جو رُک گیا تھا، کہنے لگا:

"باشندۂ ریاست کا سرٹیفکیٹ بنوانا تھا۔" ماسٹر جی نے قلم ہاتھ میں پکڑا۔ گتہ آگے کر لیا۔

"ضرور بنے گا۔ اپنا نام، اپنے والد کا نام، سکنہ حال،" لڑکے نے سوالوں کی بوچھار کو روک دیا۔

غبارے اُڑاتے ہیں۔ پیسے کی وُقعت ہی نہیں۔ یہاں لاکھ جھوٹ بولو، تب جا کر ایک پیسہ آتا ہے۔ مُڑ کر اُن کی نظر نیم پلیٹ کی ۲۵ برس مُسلسل والی سطر پر ٹھہر جاتی ہے جیسے حساب لگا رہے ہوں۔ اس عرصے میں کتنا جھوٹ؟ شاید بے انداز۔ . . . .

باپو جی کہتے تھے: "برہمن کے پوت، کوئی جن، کوئی بھوت۔" جو زوال اُن کے خاندان پر آ گیا تھا، اُس کا انجام کیا ہے۔ انجام کیا ہے؟ پڑدادا راج گورو تھے۔ دادا راج پروہت رہ گئے۔ باپو جی ہوتے ہوتے عام پُوجا پاٹھ والے پنڈت رہ گئے۔ مجھے پنڈتائی کی طرف سے لاپرواہ دیکھ کر کہتے تھے۔ ڈُوب گیا خاندان کا نام۔ لیکن میں نے تو عرضی نویس کے ساتھ لگ بھگ یہی کام کیا۔ جو رِشی مُنی کیا کرتے تھے۔ لوگوں کی فرمائشیں لکھ کر حکومتوں تک پہنچاتے تھے۔ اُن کی حکومت دیوی دیوتاؤں کی ہوتی تھی اور ہم حاکم انسانوں کے پاس عرضیاں پہنچاتے ہیں۔ کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ لیکن آگے تو نام ڈُوبا ہی ڈُوبا ہے۔ نہ پڑھنا، نہ لکھنا۔ کیا کریں گے؟ جیب، کُتریں گے، سینڈ لگائیں گے، بھیک مانگیں گے۔ یہ چشم و چراغ بھک منگوں کی قوم!

تریڈو چودھری تحصیل دار صاحب کے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ ساتھ میں کالے کمبل والا ایک آدمی تھا۔ "ماسٹر جی ایک شہادت دینی ہے۔ نام ہے کشیرو ولد فقیرو۔ آپ نے کہنا ہے کہ کشیرو کا ہل بیرو ولد گھسا رنے آپ کے سامنے کھولا تھا۔" تریڈو نے تول تول کر بات سمجھائی تھی۔ ماسٹر جی نے تریڈو کی طرف دیکھا۔ دیکھنا ایک سوال ہے۔ تریڈو نے کمبل والے کسان کی طرف دیکھا۔ "لو بھائی! پہلے ان کا حساب چُکتا کر دو۔" "پہلے اندر کا کام ختم کر لیں۔" کسان کی آواز میں بلا کی چالاکی تھی۔ کیا پتہ اس کی گواہی مانی بھی جائے یا نہیں؟ ایسے میں خرچہ بھی کسی کام نہیں آئے گا۔" اس طرح کے آدمیوں کے ساتھ ماسٹر جی کافی عرصہ سے نبھاتے آئے ہیں۔ بولے: "بھائی! ہم تم کیا کوئی بیوپار کرنے لگے ہیں؟ میں نے جھوٹ بولنا ہے بھائی۔ اپنا ایمان بگاڑنا ہے۔ ذہن، ضمیر کو دھوکا دینا ہے۔" انھوں نے جھوٹ پر ذرا زور ڈالا۔ کسان نے

لیکن ماسٹر جی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جی چاہا ایک زور کا تھپّڑ اُس کے منہ پر مار دیں، بات کرنے کا سلیقہ ہی نہیں حرامی کو۔ لڑکا ریوڑیاں کھا چکا تھا۔ "باپو! دس پیسے دو۔"

"کیا کرنے ہیں دس پیسے؟ چوبیس گھنٹے جُگالی کرتے رہتے ہو!"

"اپنے لیے تھوڑے مانگ رہا ہوں۔ نکّو کے لیے گیس والا غبارہ لینا ہے۔ اُس کو پھر دَورہ پڑ گیا ہے۔"

یہ سُن کر ماسٹر جی کچھ پل خاموش ہو کر سوچتے رہے۔ روگ بیماریاں بھی غریبوں کو ہی لگتی ہیں۔ صُبح کی نحوست لگی ہوئی ہے۔ دُمڑی کا گاہک نہیں آیا۔ انھیں یاد آیا، ایک باشندۂ ریاست کا سرٹیفکیٹ بنوانے آیا تھا۔ اُٹھ کر چلا گیا۔ ایک بوڑھی راشن کارڈ کی نقل بنوانے آئی تھی، اُٹھ کر چلی گئی۔ دُمڑی کا گاہک نہیں آیا۔ لوگ آتے ہیں۔ اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ بے کار بیٹھ کر ٹائپ کی ٹپ ٹپ، چپڑاسیوں کی آوازیں اور اپنے اپنے کام دھندے میں مصروف لوگ، یہ سب انھیں بے مایا دِکھائی دینے لگتے ہیں۔

انھوں نے شوکیس سے دس پیسے کا ایک سکّہ نکال کر دیا۔ لڑکے کے چہرے پر رونق آ گئی۔ ماسٹر جی بولے — "دانہ سیاہی لے آ!" لڑکے کا منہ اُتر گیا۔ لیکن اُس نے یہ کہتے ہوئے بھاگنا شروع کر دیا۔ "نہیں، میں نے غبارہ لینا ہے۔" انھوں نے دیکھا کہ دُور باہر سڑک پر لڑکا ایک غبارہ لے کر ناچتا کودتا لوگوں کے ہجوم میں گُم ہو گیا۔

ماسٹر جی کے بھیتر کچھ جلتا ہے، اُبلتا ہے۔ "ٹھہر بیٹا! آ لینے دے مجھے گھر — " گھر کی یاد آتے ہی اُن کے اندر کچھ برف کی طرح منجمد ہونے لگتا ہے!

آج سبزی کوئی نہیں آئی۔ نمک، مرچ کے ساتھ کھاؤ۔ کچھ ہتھیلی پر لا کر رکھو تو پکوان بھی پکاؤں! — بیوی کے زہریلے بول، بے ہوش پڑا ہوا لڑکا۔ منہ میں سے نکلتا ہوا جھاگ اور ایک جیسی بیاہنے لائق تین بیٹیاں!

سالوں کو قدر ہی نہیں۔ پیسہ پیسہ جوڑو اس نالائق اولاد کے لیے — انھوں نے

تحصیل کا میلہ چھٹ رہا ہے۔ اِکا دُکا لوگ رہ گئے ہیں۔ نرپت لال اپنا سامان سنبھال رہا ہے۔ پھر افسر اہل کار بھی جانے لگتے ہیں۔ ماسٹر جی کھڑے ہو کر سلام کرتے ہیں۔ کاغذ، پتر اور اسٹامپ سنبھالتے ہوئے وہ سوچتے ہیں، آج کا دِن تو کسی طرح پُورا ہو گیا۔ لیکن آگے، آگے کیا؟ مُنہ میں سے جھاگ بہاتے ہوئے نکّو، بانہہ ہلاتی، مُنہ پھاڑتی بیوی اور اندھیرے کمرے کے کونوں میں بیٹھی ہوئی تین بیٹیاں؛ کروشیے، سلائیں، پریس یا ڈیزائن بناتی ہوئیں، گیس والے غبارہ کی طرح مُنہ میں چپاتی کا ٹکڑا لئے شوسے کی تصویر، یہ سب کیا ہے۔ وہ سوچتے ہیں، مُنہ میں اُلٹا ہاتھ رکھ کر دِن بھر کی تھکن باہر نکالتے ہیں اور جھولا اُٹھا کر بس اسٹامپ کی طرف چل پڑتے ہیں۔

{ ڈوگری سے ترجمہ: محمد یٰسین }

اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دُو روپے کا نوٹ نکالا اور ماسٹر جی کو پکڑا دیا۔

" نہیں نمبردارا۔ اس کے لئے کون اپنا ایمان خراب کرے۔ چار سطریں لکھ دو تو فریادی ہنس کر دُو روپے دے جاتا ہے۔ پھر یہ پاپ کیوں، بھائی؟ آگے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ گھر میں بیماریوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔"

" کوئی اور نہیں ملتا ـــ؟" کسان نے تریڈو کی طرف دیکھا۔

گواہ بہتیرے، لیکن ہمیں کوئی اناڑی گواہ نہیں چاہیے۔ ماسٹر جی کو ۲۵ برس کا تجربہ ہے۔" ماسٹر جی چہرے پر گمبھیرتا بکھیر کر بیٹھ گئے۔ سارا دار و مدار اُن پر تھا۔ جو دو تار ٹوٹ چکے تھے انھیں جوڑنے والی کڑی وہی تو تھے۔ صرف وہی! بولے "قیمت تجربے کی ہے بھائی صاحب! یہ سامنے ٹائپ بابو بیٹھے ہیں ناں، انھیں کہو صرف ایک رُوپے پر دوڑتے آئیں گے۔ ہم تو پلنج سے کم ایک قدم بھی نہیں اُٹھاتے۔ اپنی دُکان ہماری بگاڑ کر جاؤ۔ پیچھے سے چاہے دس رُوپے کا گاہک لوٹ جائے۔ گاہک اور موت کا کوئی پتہ نہیں ہوتا ـــ" من میں کہتے ہیں، گاہک کی موت کا کوئی پتہ نہیں ہوتا ـــ کیا خبر کب آمرے! پھر کتنا حلق پھاڑ کر قابو میں آئے۔ لیکن یہی تو سیلز مین شپ ہے ـــ"

کسان نے محسوس کیا، جیسے اُس کی ساری ہوشیاری گاؤں کی دیواروں کے پیچھے رہ گئی ہو۔ شہر یا تحصیل کی سرحد میں آتے ہی وہ غیر ملکی سکّے کی طرح کھوٹا ہو جاتا ہے۔ تحصیل کا دفتر بھی بند ہونے والا تھا۔ تھوڑا سا سمے اور لگا تو بات ہی ختم سمجھو۔ منصف صاحب پتہ نہیں کس کے حق میں لکیر کھینچ دیں یا پھر ایک اور مہینے کا پھیرا پڑ جائے ـــ اُس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دس کا نوٹ نکل آیا۔ پھر تیسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں سے ایک ایک والے نوٹ نکل آئے۔ آخر چوتھی جیب میں سے پانچ کا ایک نوٹ باہر آیا جسے وہ ماسٹر جی کی ہتھیلی پر رکھ کر اندر جانے لگا۔

عدالتوں، کچہریوں میں خرچ تو ہوتا ہی ہے بھائی۔" تریڈو کی تسلّی بھری آواز آئی ـــ

ننگی دھوپ

سرن سنگھ

میرا نام راج بھٹ ہے۔ معلوم ہوا کوئی سردار جی افسر آیا ہے۔ سُن کر رہ نہیں سکا۔ سوچا چلو مِل آؤں... سچ پُوچھیں تو آج برسوں بعد کوئی ہندو افسر اور وہ بھی سردار جی یہاں آیا ہے اور میں برسوں بعد یہاں آیا ہوں... ... وقت کی بات ہے۔ پہلے تو گھر سے ریسٹ ہاؤس تک ایک چھلانگ لگا کر پہنچ جاتا تھا لیکن اب... ... خیر اب عمر بھی کہاں پہنچ چکی ہے... پچاس یا ساٹھ کا ہوں گا لیکن آج بھی شُسری شام کی بیوی کہتی ہے کہ مجھ میں جوانوں کی سی سکت ہے۔ لیکن سچ مانیے اب تو جان نہیں رہی۔ یہ پنڈلیاں تھوڑا سا چلنے کے بعد گرنے لگتی ہیں... ... جناب میری طرف حیرانی سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ آپ سوچتے ہوں گے میں کیسا انسان ہوں۔ اس قیامت کی بارش میں بھی آگیا ہوں۔ بارشیں بھی دیکھی ہیں۔ پر جو بات آج ہے... ... خدا کی پناہ! سمجھ نہیں آرہا، اُوپر والا کیا رنگ لا رہا ہے...

پنجابی

کی نہیں تو اور کس کی؟ ... ... میں سچ کہتا ہوں ... ... یہ آپ کا بھرم ہے کہ لوگوں کی اپنی ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔ جس وقت ہمارا اپنا راج تھا، کیا مجال کوئی مسلمان اس بنگلے کی طرف دیکھ بھی سکے۔ وہ بنگلے سے دُور ہی بیٹھے رہتے۔ یہ اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک بار ایک لمبی مونچھوں والا میاں ... ... شاید نائب تھا کہ تحصیل دار ... ... لیکن تھا پکا راجپوت ... ... اُس نے ایک سرپھرے مسلمان نوجوان کو اُس خوبانی کے درخت کے ساتھ پورے سات گھنٹے باندھے رکھا ... ... اُس نے کیا کیا تھا؟ افسر صاحب کا بوجھ ادب سے نہیں اُٹھایا تھا ... ... اب تو بات ہی اور ہے! جب دیکھیں، باورچی خانے میں یہی لوگ گھسے رہتے ہیں ... ... اور پھر اب ... ... اگر جھوٹ نہیں بولتا، ہندو سکھ افسر دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں! کیا کہا آپ نے ... ... افسروں سے مُلک بھرا پڑا ہے، لیکن میں وہاں کی بات نہیں کرتا، یہاں کی بات کرتا ہوں۔ ہیں بھی ہم کتنے؟ پورے گاؤں میں بس تین کنبے، باقی سبھی یہی۔ آپ کیا مہاراج جموّں کے رہنے والے ہیں؟ سُنا ہے جموّں میں ریل آگئی ہے۔ بڑی لمبی ہوتی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ ریل میں بارہ مولہ کے سبھی لوگ سما سکتے ہیں؟ میں ذرا آرام سے بیٹھ لوں ... ... پاؤں ٹھٹھر گئے ہیں۔ پاؤں بھی کیا کریں! اس ربڑ کی بوٹ میں پانی چلا جاتا ہے۔ دراصل یہ میری اپنی غلطی ہے۔ میں شہر گیا تھا۔ غلطی سے مندر میں چلا گیا۔ باہر نکل کر دیکھا تو بوٹ غائب! اور اُس کی جگہ یہ پھٹے پرانے پڑے تھے، خاموشی سے پہن لئے۔ گوردواروں میں سُنا ہے کہ چوری نہیں ہوتی! ہاں آپ کو دیکھ کر یاد آیا۔ ہمارے گاؤں سے ایک میل دُور سکھوں کا ایک گاؤں بھی ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے یہی کوئی پچیس تیس گھر سکھوں کے آباد تھے لیکن نامعلوم اُنھیں کیا ہو گیا۔ اب تو چار پانچ ہی گھر آباد ہیں۔ باقی تو شہروں میں بس گئے ہیں۔ خیر رہیں، جہاں بھی رہیں، لیکن لگتا ہے زمین سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ سُنا ہے زمینوں کا کوئی نیا قانون بننے لگا ہے ... ... لو دیکھئے بارش کتنی تیز ہو چلی ہے ... ... آسمان سے جیسے ندیاں بہہ رہی ہیں۔ خیر اچھا ہے،

دیکھئے نا ...... بادل کیسے نیچے تک لٹکے ہوئے ہیں۔ جیسے بے چاروں کا نالا ہی ٹوٹ گیا ہو۔ آپ جناب ان چناروں کی طرف کیا گھور رہے ہیں؟ کہتے ہیں کہ یہ خوب صورت درخت کسی دوسرے ملک سے لا کر یہاں لگایا گیا تھا۔ دیکھئے نا سامنے والا درخت بھیگا ہوا کیسا لگ رہا ہے۔ جیسے ایک نوجوان دوشیزہ اپنے جسم پر پانی کی ایک گڑوی ڈال کر آ کھڑی ہوئی ہو! آپ کہیں گے میں کن باتوں میں الجھ گیا ہوں۔ دراصل میری زبان ٹک کر نہیں بیٹھ سکتی۔ آپ بادلوں کو کیوں گھور رہے ہیں؟ مجھے خود یہ ڈوبے بادل ایک آنکھ نہیں بھاتے جن کے گاڑھے پن کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بادل کالے ہوں، گھنے ہوں، پھٹے پھٹے ہوں، کیسے بھی ہوں، ذرا بھی اچھے نہیں لگتے۔ دیکھئے کیسے بادل اور دھند سارے ماحول پر چھا گئی ہے! جیسے سارا جہاں انھیں کی جاگیر ہو!

آپ کیا آج ہی پہنچے ہیں؟ دراصل مجھے آپ کے آنے کا ابھی ابھی پتہ چلا ہے۔ اب کیا رہا تھا سارا ج۔ یہ جگہ جب ہوا کرتی تھی۔ یہ جو مٹیالے پانی سے بھرا نالہ دریا کی طرح بہہ رہا ہے اصل میں آج ہی پانی سے بھرا ہے۔ پچھلے برس اس میں چلو بھر پانی نہ تھا۔ انگریزوں کے وقت، آپ کو کیا بتاؤں، یہاں کیا رونق ہوا کرتی تھی۔ دور دور تک لگے ہوئے خیمے، انگریز اور میمیں، واہ بھگوان! کیا رونق ہوا کرتی تھی! اس نالے کی مچھلی کا کیا بتاؤں، جیسے بالکل گری کی مانند۔ نہ کانٹا نہ بو۔ جیسے میم کی ران ہو! اب تو پانی کا بھی قحط اور مچھلی تو کیا، ایک گرنہ (مچھلی کا بچہ) تک نہیں ملتا۔ اور تو اور، اس جنگل کو جیسے کوئی بلا چاٹ گئی ہو! دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا۔ ایسے لگتا ہے جیسے یہاں درخت ہی نہ تھے! سامنے کائل اور دیودار کے درختوں کا جھومنا اور سرد ہوا کے جھونکے دیکھ کر ایسا لگتا کہ انسان زمین پر نہیں بلکہ بہشت میں بیٹھا ہو۔ اب کیا رہ گیا ...... یہی کچھ جھاڑیاں اور گھاس پھوس۔ اگر کوئی سن نہیں رہا تو میں سچ کہوں کہ جب سے مسلمانوں کی حکومت آئی ہے، سب برباد ہوتا جا رہا ہے ...... آپ میری بات سن کر چونک پڑے ہیں؟ مسلمانوں

دوسرے کی جڑیں کاٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک کاشت کار کو زمین خریدنے کے لئے کہا تھا۔ پر کہاں جی! بس یہی کہتے ہیں کہ پیسے نہیں۔ ان لوگوں کو پورا پتہ ہے کہ زمین اُسی کی رہے گی جو خود ہل چلائے گا۔ پھر بھلا پیسے کیوں دیں؟ پہلے بھی ہمارے ہندوؤں کی زمینیں انھیں مُفت میں مِل گئی ہیں۔ بس اب تو سمجھئے ان کے وارے نیارے ہیں!۔

آپ نے کیا فرمایا؟ قانون سب کے لئے یکساں ہے۔ اور میں نے کب اس بات سے انکار کیا ہے' جموں کے لوگوں کی فالتو زمینیں تو ہندو بھائیوں کو ہی ملیں گی۔ لیکن یہاں ہماری تو مُسلمان لے جائیں گے۔ بس اسی دُکھ کا شکار ہوں۔ آپ نہیں جانتے جناب ان لوگوں کو۔ انھوں نے چیزوں کے دو بھاؤ رکھے ہیں۔ اپنے لئے ایک اور ہم لوگوں کے لئے دوسرا۔ خیر جی ہری سنگھ جیسا بادشاہ انھوں نے نکال دیا۔ ہم کس باغ کی مُولی ٹھہرے! دراصل اب انھیں کا وقت ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اب نوکریاں تو درکنار، ہمیں اچھی اچھی جگہوں پر تعینات ہی نہیں کرتے۔ بس جی عجیب سی افراتفری ہے!

خیر دفع کیجیے سب کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ آپ نے زیادہ تو نہیں ڈال دی۔ ایسے ہی ایک بوند ہی کافی تھی۔ ٹھنڈے لہو میں گرمی کرنے کے لئے۔ اتنی چڑھ تو نہیں جائے گی۔ اچھا جی بے شک چڑھے، غم دفا ہو جائے گی۔ یہی تو فائدہ ہے اپنے ہندو بھائی افسر کا۔ انسان کُھل کر بات کر سکتا ہے۔ ان لوگوں نے ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ہے جی بڑی تیز چیز، گلا چیر گئی ہے۔ ولایتی ہو گی! ویسے سُنا ہے کہ ہمارے مُلک میں بھی اب بننے لگی ہے۔ سوم رس کے لئے ہم زمانۂ قدیم سے مشہور تھے۔ آپ نے کیا فرمایا؟ پانی ڈال لینا تھا۔ اس میں بھی ملاوٹ؟ آگ لگ گئی زمانے کو۔ ملاوٹ کے بغیر تو کوئی بھی چیز نہیں۔ بس مہاراج! اور نہیں چاہیے، اتنی ہی کافی ہے۔ میرے دماغ کی رگیں اتنی سے ہی تن گئی ہیں۔ چڑھے گی تو نہیں! خیر میں بھی کیا انٹ شنٹ بکنے لگا ہوں۔ اگر بک بھی دیا تو جناب سے کیا ڈر؟ جناب مائی باپ ہیں۔ مائی باپ تو انگریزوں کی طرح شوقین ہیں۔ بس راج کیا تو انگریزوں نے

آئے سیلاب۔ میں تو کہتا ہوں، ایسا سیلاب آئے کہ سب ڈوب جائیں! لیکن آپ بے فکر

رہیں ...... یہ بنگلہ خطرے سے باہر ہے۔ انگریزوں نے سوچ سمجھ کر اس جگہ کا چناؤ کیا ہے،

خدا بھی کہاں سُنتا ہے۔ ان کو بہا کر نہیں لے جاتا! لیکن میں نے بھگوان کی شکتی بھی دیکھی

ہے۔ کافی عرصہ کی بات ہے میرے ایک چچیرے کا لڑکا مسلمان بن گیا۔ لیکن دیکھو، بھگوتی کا

کرنا کہ کچھ ہی وقت میں سالا دانے دانے کا محتاج ہو گیا۔ آج کل اُس کی ایسی خستہ حالت ہے

کہ خدا کتّے کی بھی نہ کرے! بے شمار بچے، کھانے کے لئے ایک دانہ بھی نہیں۔ اور تو اور اب

جان سے بھی معذور ہے۔ آپ نے کیا پوچھا ...... میرے کتنے بچے ہیں ...... مہاراج

بچے ہوتے، جب میں نے شادی کی ہوتی۔ رب بھی اکیلا اور راج بھٹ بھی اکیلا۔ اصل میں

جوانی میں، میں نے بڑے عیش کئے ہیں۔ آپ کو کیا بتاؤں، میں نے کون کون سے پاپڑ نہیں

بیلے۔ کوئی بھی ایسے عیش نہیں کر سکتا جو میں نے کئے ہیں۔ در اصل پنڈتوں کی قوم بھی

کچھ نہیں۔ اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا کہنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ تبھی تو سُسرے

راج کاج کے لائق نہیں رہے۔ آپ ہی بتائیے۔ میرے دو ہاتھ، دو کان، ٹانگیں، بازو

سب ثابت ...... پھر کیا کمی تھی مجھ میں ...... خیر چھوڑیئے اس بات کو۔ آپ سمجھیں گے

میں بھی کون سی بات لے بیٹھا ہوں۔ یہ کیا ہے؟ کس لئے؟ میرے لئے ـــــ رام رام ... جناب

قسم کرا لیجئے اگر زبان سے چھوئی تک ہو ...... جناب کے سامنے اب انکار نہیں کیا جا

سکتا۔ آپ سوچیں گے، راج بھٹ بھی کیسا آدمی ہے۔ جناب پھر تو میں بھول جاؤں گا ...

میں نے آپ سے زمین کے قانون کے بارے میں پوچھا تھا۔ سچ جانیئے، جب سے میرے کانوں

میں اس کی بھنک پڑی ہے، آرام ہی نہیں لگ رہا۔ دن رات فکر لگی رہتی ہے۔ اپنے

گاؤں کے یہ مسلمان نہ جانے ... کیا سرگوشیاں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ اندر

اندر سے انھیں سب کچھ بتایا گیا ہے۔ میں نے بات نکالنے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن کوئی

بات ہی نہیں بتاتا۔ میں حیران ہوں، ان میں کتنا اتفاق ہے! ہماری طرح نہیں کہ ایک

دھبہ

کنول کشمیری

سنبھال کر رکھے سفید اور بیش قیمتی قالین پر اَمِٹ سیاہی کے کالے دھبے پڑ گئے تھے جن کی وجہ سے اس کے مالک کو سخت ذہنی کوفت ہو رہی تھی۔ غصے میں اُس کی حالت کے بارے میں اس وقت کچھ سوچنا ہی چاہتا تھا کہ اُسی پل ایک . . . اجنبی اور عام آدمی مجھ سے پوچھے بغیر میری ہی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور اُس قالین کے مالک کی جگہ مجھے اُلجھن میں ڈال دیا۔

کتنی گھٹیا سی بات ہے کہ آپ کسی شراب خانے کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھے ہوئے ہیں۔ سردی سے بچنے کے لئے یا تنہائی کے احساس کو مٹانے کے لئے گرمی حاصل کر رہے ہیں اور اس طرح کوئی آ ٹپکے۔ ذہنی اُلجھن کا پیدا ہونا کوئی اَن ہونی بات نہیں ہوتی۔ اس سے دل کا قرار جاتا رہتا ہے۔

"باہر برف پڑ رہی ہے۔" اُس نے اپنی جوڑیٹی (اُونی چادر) جھاڑتے ہوئے اور کرسی پہ

کیا افسر تھے! واہ واہ...... دراصل افسر بھی شاہی طبیعت کا ہونا چاہیئے!

جناب کو تو اور بھی شوق ہوں گے۔ میرا مطلب ہے، جس طرح کے شوق بڑے افسروں کے
ہوتے ہیں، جناب کو شاید میری بات سمجھ نہیں آئی... میرا مطلب ہے...... ہاں بس
بس وہی۔ آپ افسر بن کر اس وقت آئے جب...... پہلے پہل تو دُور دُور سے افسر لوگ
اس بنگلے میں آکر ٹھہرتے تھے۔ لیکن اب یہ لوگ بھی سیانے ہو گئے ہیں۔ بندہ تو کہتے ہوئے
جھجکتا ہے۔ اب جو بھی آتا ہے شہر سے ہی ہمراہ لاتا ہے...... سُنا ہے شہر میں سب کچھ
مل جاتا ہے۔ صرف پیسے کی بات ہے۔ آپ نے کیا کہا؟ جناب اپنی ذات برادری کی....
کوئی رہی ہوتی تو راج بھٹ اب تک کنوارا نہ رہتا۔ دراصل کنوارا لفظ غلط ہے۔ غیر شادی
شدہ کہنا درست ہے۔ ایک طرح سے تو جناب ٹھیک ہیں۔ بیاہ کیا ہوتا تو جنجال میں پھنسا
ہوتا۔ اکیلا ہوں، جہاں مرضی ہے چلا جاؤں، جو مرضی آئے، کر لوں۔ اب آپ سے کیا چھپانا
ہے؟ ایک دن ٹلکی کہنے لگی: ویسے ہے وہ میرے چھوٹے بھائی شام کی بیوی۔ کیا بتاؤں آپ
کو! بڑی شیر دل عورت ہے۔ وہ بھی ایک چیز ہے۔ ایک دن بچاری نے صاف کہہ دیا۔ راج
بھٹ! کیا اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہو؟ کوئی قتل کر دے گا۔ بس جناب اُسی دن سے میں نے
باہر ٹکریں مارنا چھوڑ دیں۔ بچاری ہو گی کوئی چالیس برسوں کی۔ لیکن اب جان سے معذور
ہو کر رہ گئی ہے۔ سالی نے بیس برسوں میں چھ بچے پیدا کر دیئے ہیں۔ آپ نے جناب کیا فرمایا۔
مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میری آپ فکر نہ کریں! میں یہاں کے کونے کونے سے واقف ہوں۔ مجھے کہیں
تو آنکھیں بند کر کے گھر پہنچ جاؤں۔ جناب کو بھی اب بھوک لگی ہو گی۔ جناب ان لوگوں کے
ہاتھوں کا پکا ہوا کھا لیتے ہیں؟ پنجاب کے سردار، سُنا ہے اس بات کا پرہیز نہیں کرتے۔ خیر
اگر صاف ستھرا پکایا گیا ہو تو پھر کوئی ڈر نہیں۔ جناب خوب تھکے ہوں گے! رات بھی
کافی بیت چکی ہے۔ جناب کا کل کا پروگرام کیا ہے؟ ٹھہریں گے یا جائیں گے؟ اگر رکیں گے تو پھر
میں ہاتھ پاؤں مار لوں۔ آپ جناب میری فکر نہ کریں۔ میں یہیں اپنے رحیم بٹ چوکیدار کے پاس
رہ لوں گا۔ میرا پرانا یار بیلی ہے۔ بڑا اچھا ہے۔ پکا مسلمان!

ملبوس، مسکراتی، نازک اندام، روئی کے اُن چھنے گالوں کی طرح ملائم بننے کی کوشش کرتی ہوئی نئی پھوٹی سرسوں کی کونپلوں کی مانند، لیکن اُن کے چہروں کے پس پردہ کتنے ہی سیاہ منظر میرے دل و دماغ کے پردوں پر ابھر اُبھر آتے اور میرا من مبتلا کے رہ جاتا۔ زندگی کے سُہانے پن کا یقین جاتا نظر آتا۔ اور اس کیفیت کی بدمزگی سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے سامنے پڑا ہوا پیگ خالی کر دیا۔ اور پھر اپنے بکھرے خیالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ ایک ہی مرکز پر، جہاں سے زندگی کی خوب صورتی کی کلی پھوٹتی ہے۔

آرکیسٹرا دھیمی سُروں میں بڑے پیار سے بج رہا تھا۔ کبھی کبھی ان سُروں سے پاپ کی آواز ایسی اُبھر آتی جیسے بہت سے بھنورے ایک ساتھ منڈلانے لگ پڑے ہوں۔ اور اس سے دماغ سے اُبھرتی لہروں کو اور بھی ہچکولے ملتے ہوں۔ میٹھے میٹھے، پیارے پیارے، پُرسوز، زندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو جانے والے، وہی پہلے کی صورتیں اب اچھی اور پیاری لگنے لگیں!

کچھ دوری پر کھڑا بیرا، جس پر مجھے رہ رہ کر ہنسی آ رہی تھی، میری طرف دیکھ رہا تھا۔ لگاتار ٹکٹکی باندھے ہوئے، جو میرے ایک اشارے پر پیگ بھر سکتا تھا۔ میں کیوں پی رہا تھا اور وہ کیوں پلا رہا تھا۔ اس بات سے شاید ہم دونوں ہی بے خبر تھے!

بیرا کچھ اجنبی سا بن کر اور بھنویں سُکیڑ کر میرے سامنے بیٹھے آدمی کا آرڈر لے کر گیا ہی تھا کہ میرے جی میں آیا، اُسے بُلا کر پوچھ لوں کہ اس آدمی نے کن چیزوں کا آرڈر کیا تھا۔ لیکن وہ چلا گیا اور میں اُسے بُلا نہ سکا!

"میرا نام خالق ہے۔" سامنے بیٹھے آدمی نے خود ہی اپنی بات شروع کر دی۔ "شہر کے سبھی ہوٹل بند ہیں۔ میرا خیال ہے ماہِ رمضان کی وجہ سے!"

میں اُس کی داستان سُننے کے موڈ میں نہ تھا۔ اور نہ ہی میں نے اُسے سُنانے کی دعوت دی تھی۔ سامنے پڑے ہوئے رسالے کا ورق اُلٹتے ہی ایک ادھ ننگی بھرپور جسم کی خوب

بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ کشمیری پٹو کی واسکٹ، السیاہی کوٹ پہنے ہوئے، گلوبند پر دوہری لال دھاری کی جوڑیئی اُس نے اپنے کندھوں پر سمیٹ رکھی تھی۔

"باہر برف گر رہی ہے۔" اُس نے دوسری بار کہا۔ میرے سامنے عورتوں کی ادھ ننگی تصویروں سے بھرا ہوا ایک انگریزی رسالہ پڑا ہوا تھا۔ "ہاں گر رہی ہوگی! گرنے دو!!" میں نے رسالے سے نظریں اُٹھانے کے بعد لاپروائی سے اُس کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر ادھ ننگی تصویروں میں کھو جانے کے ارادے سے رسالے کی طرف جھکا۔ لیکن ایسا نہ کر سکا۔ وہ اجنبی میری بے اطمینانی کا باعث بن رہا تھا۔ میں نے صوفہ کے ساتھ اپنی پیٹھ جوڑتے ہوئے بھرپور نظروں سے اُس کی طرف دیکھا ——

"ہندوستان کی بڑی پٹائی ہوئی ہے لیکن پھر بھی ڈٹا رہا ہے۔"

"چھوڑو یار۔ جو پٹ گیا، سو پٹ گیا۔ فیصلہ تو ہار جیت ہی کرتی ہے۔ باقی تو انسان کی بوکھلاہٹ ہوتی ہے!"

میرے سامنے بیٹھے آدمی نے دوسرے میز پر بیٹھے لوگوں کی باتیں سُن کر مجھ سے پوچھا:

"کیا کہیں لڑائی ہو رہی ہے؟"

"بھارت اور ایک چھوٹے سے جزیرے غرب الہند (ویسٹ انڈیز) کے بیچ۔" میں نے چڑ کر اُس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ مان نہ مان، میں تیرا مہمان (جیسے وہ فیصلہ کرکے آیا ہو کہ مجھ ہی سے اس کا جواب لینا ہے)

"کتنی حیرانی کی بات ہے کہ مجھے تو اس لڑائی کے بارے میں کوئی علم نہیں!"

شہر کے معزز لوگوں کا سب سے بڑا اور خوب صورت ریستوران اور بار لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔

آج کی شب یہاں ناچ کا ایک خاص پروگرام تھا اور لوگ ابھی سے آنا شروع ہو گئے تھے۔ میری جانی پہچانی کئی صورتیں تھیں۔ دوشیزائیں بھاری گرم کپڑوں میں سر سے پاؤں تک

کباب کا ایک حصّہ کاٹ لیا اور چپ چاپ کو کے کھانے لگا۔ میری طرف دیکھ کر وہ ایک بار پھر مُسکرایا، جیسے کہ کوئی پُرانا واقف کار ہو۔ بغیر مطلب کے اُس کی مُسکراہٹ پر مجھے غصّہ آگیا اور اچانک میرے مُنہ سے "جنگلی" اور "دیہاتی" الفاظ نکل گئے۔ پتہ نہیں اُس نے میری آواز سُنی یا نہیں لیکن وہ اطمینان کے لہجے میں بول اُٹھا: "باہر برف باری زوروں پر ہونے لگی ہے، صُبح تک نہ جانے اس کی کتنی تہیں جمع ہو جائیں گی!" اُس نے جلدی سے چائے پی ڈالی، جیسے اُسے بہت جلدی جانا ہو۔ چائے پینے کے بعد وہ چھت پر لٹکتے رنگ برنگے فانوسوں، کاغذ اور پلاسٹک کے پھولوں کی طرف دیکھنے لگا یا پھر دیوار اور چھت پر چہرے ٹٹولنے کا جتن کرنے لگا۔ کچھ پل اُس کی نظریں آرکیسٹرا بجانے والوں پر ٹکی رہیں اور پھر ہال میں بیٹھی دوشیزاؤں کے چہروں پر سے سرکنے لگیں۔ اُس نے میرے قریب آکر دھیمی آواز میں جیسے اپنائیت کے انداز میں پُوچھا: "یہ عورتیں بھی پیتی ہیں کیا؟" اُس کے چہرے پر بھولے پن اور شرارت کے ملے جُلے تاثرات اُبھرتے اور مٹتے تھے۔ اُس وقت میں نے چاہا کہ اُس کے چہرے پر زور سے ایک تھپڑ رسید کروں اور اُس کا ڈھیٹھ مُنہ توڑ دوں، جیسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ میرے دل میں اُس کے لیے کوئی اپنائیت نہیں!

سفید قالین پر پڑے ہوئے سیاہی کے دھبّے اور بھی بڑے ہو گئے ہیں۔" کسی نے کہا۔ ایک عورت بولی: ایسے لگتا ہے جیسے چاولوں میں بہت سے روڑے مِل گئے ہوں! اور پلاؤ کھاتے ہوئے تمام کے تمام دانتوں کے نیچے آگئے ہوں اور معزز لوگ اس طرح کی ملاوٹ کرنے والوں کو کوس رہے ہوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے! انسان کا مزہ کِرکِرا ہو کر رہ جاتا ہے۔ لعنت ایسے وقت کو، جہاں زندگی کا سُکھ نصیب نہ ہو!"

میرے سامنے بیٹھے آدمی نے تنگ آکر بیرے کو زور سے پُکارا، ایسے اطمینان اور بے باکی سے، جیسے گاؤں کے کسی ٹیلے پر کھڑا ہو کر ایک دیہاتی دوسرے راہ گیر کو اونچی آواز سے باآسانی بُلا لیتا ہے۔ اُس کی آواز جیسے ایک دم سارے ہال کی خاموشی

صورت دوشیزہ کی تصویر پر میری نظریں جم گئیں، جو پورے صفحے پر بکھری پڑی تھی۔
مجھے لگا کہ اُس کے جسم سے جذبات کا ایک غبار اُبھر آیا ہو، جیسے کہ وہ سانس لے رہی
ہو، جیسے اُس کا دِل دھڑک رہا ہو۔ اور پھر میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرا دِل بھی دھڑکنے
لگا ہو۔ لہریں بکھیرتا ہوا جو میری نس نس میں پھیل رہی ہوں، گدگدا رہی ہوں!
بیرا نہ جانے میرے کون سے اشارے پر سامنے کا پیگ بھر گیا اور ٹِک کی آواز سے
میں چونک سا پڑا۔ باہر برف کے موٹے موٹے گالے پڑ رہے تھے جو روشن دان کے شیشوں
پر سے سرک سرک جاتے!
میں نے ایک پورا گھونٹ بھر کے اُن تمام خلط ملط خیالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی جو میرے
دِماغ کی گیلی زمین سے کھنبوں (مشروم) کی طرح پھوٹ پڑے تھے۔
میری نظریں سامنے بیٹھے آدمی پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کا مجھے پورا احساس تھا کہ اس
طرح سے کسی کو گھورنا تہذیب کی نشانی نہیں اور وہ بھی ایک ریستوران میں۔ حقیقت
یہ تھی کہ میں اُس کی ناک کی چوٹی پر ایک کالے تِل، اُس کے نچلے ہونٹ کے نیچے حجامت بناتے
ہوئے لگے زخم اور آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے ملے جُلے جذبات و تاثرات کا جائزہ لے
رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر خوشی اور حیرانی کے ملے جُلے تاثرات تھے۔ اپنی جانب میری
نظروں کو دیکھ کر وہ مُسکرا پڑا۔ بیرا اُس کے سامنے چائے رکھ رہا تھا۔ میں آلو کی چپس
ایک ایک کر کے مُنہ میں ڈالنے لگا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اُس وقت میں نے بہت سی
مِلی جُلی آوازیں سُنیں۔ آرکیسٹرا بند تھا۔ ٹیڈی بوائے گا رہا تھا۔ آوازیں ہنسنے کی،
پلیٹوں، چمچوں، بوتلوں اور چھری کانٹوں کی۔
"شڑپ" میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے بیٹھا آدمی چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا،
اُس کے دائیں ہاتھ میں پیالی تھی اور بائیں ہاتھ میں کباب۔ کباب جیسے سانپ کا بچّہ
ہو۔ اور اُس کے ہاتھوں سے بھاگنے کی کوشش کر رہا ہو! اُس نے دیکھتے ہی دیکھتے

"تو دیکھتا نہیں، تیرا بیرا اتنے پیسے مانگ رہا ہے!"

مجھے سب کچھ پتہ ہے۔ بل میں نے ہی لکھا ہے۔" مینیجر کہہ رہا تھا۔ "تو بالکل گنوار ہے۔ دیکھتے نہیں کتنے معزز شہری آئے ہوئے ہیں اور تم یہاں بدمزگی پیدا کر رہے ہو۔ اور پھر یہ کوئی چائے پینے کا وقت ہے۔" مینیجر کی آواز میں کچھ تلخی آ گئی تھی۔

"لیکن تو مجھے اندر آ کر چائے پینے سے تو روک نہیں سکتا! یہ بھی تو ایک دکان ہے۔" مینیجر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور پھر اسے ساتھ والے کمرے میں لے گیا جہاں سے وہ کچھ دیر کے بعد لوئی جھاڑتا ہوا، اور بڑبڑاتا ہوا باہر آیا۔ "یہاں اچھا بھلا انسان بھی پاگل ہو جاتا ہے۔ مجھے ایک عمر ہو گئی ہے شہر میں آتے ہوئے، لیکن آج میں ایک نئی دنیا میں آ پھنسا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

"الو کا پٹھا!" مینیجر دربان کو تنبیہہ کر رہا تھا۔ "میں تجھے نوکری سے برطرف کر دوں گا۔"

"لیکن حضور، میں کسی کو اندر آنے سے تو روک نہیں سکتا۔" دربان سر جھکا کر چلا گیا۔

آرکیسٹرا بند پڑا تھا۔ مینیجر مائک پر آ کر کہنے لگا:

"لیڈیز اینڈ جنٹس! مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک جنگلی کے آ جانے سے آپ کو بدمزگی ہوئی ہے۔ اس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں۔ اب ہی مال ناگی رائے "ناچ شروع ہو رہا ہے!"

ہال میں پہلے ایک مدھم سی ہنسی گونج اٹھی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد آرکیسٹرا پھر سے بجنے لگا۔ "بابا بلیک شیپ ہیو یو اینی وول ...... " ماحول میں پہلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

"یہ دھبہ برا لگتا ہے!"

میں نے پورا پیگ اپنے حلق سے انڈیل دیا۔ بیرے نے میرے پاس کھڑے ہوتے ہوئے کہا — "اور کیا ہو سکتا! میرا خیال ہے کہ اس سارے قالین کو اسی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ لیکن یہ کام مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ دھبہ جانے کا نہیں۔" بیرا اپنی رائے دے کر چپ ہو گیا۔ قالین کے مالک کو ہی نہیں بلکہ میری طرح کتنے اور لوگوں کو اس دھبے کی وجہ سے کوفت ہو رہی تھی۔

(مختلف علاقائی زبانوں سے ترجمہ: ...)

میں طلاطم مچ گیا ہو۔ کونٹر کے پیچھے کھڑا مینیجر جو کتنی دیر سے ذہنی کشمکش میں اُلجھا پڑا تھا، ایک دم گھبرا اُٹھا۔ اور بھی کتنی نظریں ایک ساتھ اُس پر مرکوز ہوگئیں۔

بیرے نے اُس کے سامنے بل رکھ دیا۔

"کتنے پیسے؟" اُس نے پھر بھی بیرے سے پُوچھا۔

"پانچ رُوپے ستّر پیسے۔" بیرے نے اطمینان سے جواب دیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ ایک دم کھینچ لیا جو اُس نے جوڑ پٹی اُتار کر کوٹ کے بٹن کھول کر واسکٹ کے اندر کی جیب میں ڈالا تھا۔

"کیا کہا؟ پانچ رُوپے ستّر پیسے!"

"ہاں جناب پانچ رُوپے ستّر پیسے۔" بیرے نے نرمی سے دہرایا۔

"لو بات سُنو۔ کسی اور کو بے وقوف بنانا۔ آپ نے کیا سمجھا ہے۔ میں دیہاتی انسان یہاں آکر پھنس گیا ہوں۔ تم میری کھال نہیں اُدھیڑ سکتے۔ یہ پیسے میں زر کسی بید سے آتار کر نہیں لائے۔ دو پیالے چائے اور دو ٹکڑے کباب کے تو صرف ایک روپیہ بیس پیسے ہی بنتے ہیں، جیسے شہر کے باقی ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ زیادہ پیسے دینے کے لئے میں تو بالکل تیار نہیں، چاہے آپ جو کچھ بھی کریں!" ——— بیرا ایسے حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا لیکن جلد ہی سنبھلتے ہوئے اُس نے اُسے کشمیری میں سمجھایا۔ "بھائی صاحب، یہاں سب چیزوں کی قیمت مُقرر ہے۔" اُس نے دوسری میز سے مینو اُٹھا کر اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ قیمتوں کی فہرست ہے۔ یہاں کوئی بات زیادہ لینے کی درج نہیں۔" ہال میں بیٹھے سبھی لوگ اس کونے کی طرف دیکھنے لگ پڑے تھے۔ تیکھی نظروں اور چہروں پر حقارت کے تاثرات لئے ہوئے۔ اسی وقت مینیجر بھی وہاں پہنچ چکا تھا جسے دیکھ کر اُس آدمی نے پُوچھا:

"تم مینیجر ہو۔ اُس جگہ (کونٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کھڑے رہتے ہو۔ تمھارے یہ بیرے گاہکوں کی کھال اُتارنے میں مصروف ہیں۔"

"کھال اُتارنے کی کون سی بات ہے۔" مینیجر نے اُسے اطمینان سے جواب دیا۔

دھبّہ

کنول کشمیری

سنبھال کر رکھے سفید اورینٹل قالین پر اُمٹ سیاہی کے کالے دھبّے پڑ گئے تھے جن کی وجہ سے اس کے مالک کو سخت ذہنی کوفت ہو رہی تھی۔ غصّے میں اُس کی حالت کے بارے میں اس وقت کچھ سوچا ہی چاہتا تھا کہ اُسی پل ایک... بنبی اور عام آدمی مجھ سے پوچھے بغیر میری ہی میز پر آکر بیٹھ گیا۔ اور اُس قالین کے مالک کی جگہ مجھے اُلجھن میں ڈال دیا۔

کتنی گھٹیا سی بات ہے کہ آپ کسی شراب خانے کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھے ہوئے ہیں۔ سردی سے بچنے کے لئے یا تنہائی کے احساس کو مٹانے کے لئے گرمی حاصل کر رہے ہیں اور اس طرح کوئی آ ٹپکے۔ ذہنی اُلجھن کا پیدا ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہوتی۔ اس سے دِل کا قرار جاتا رہتا ہے۔

"باہر برف پڑ رہی ہے۔" اُس نے اپنی جوڑیٹی (اُونی چادر) جھاڑتے ہوئے اور کرسی پر

ادھورا تاج محل

خالد حسین

ویسے کشمیر میں کوکرناگ سے لے کر گلمرگ تک اور یوس مرگ سے لے کر پہلگام تک جہاں کہیں
جائیے، قدرتی حسن کو دیکھ کر جی مچل اٹھتا ہے۔ مگر جھیل ڈل میں نہرو پارک اور مغل باغات
کی شان ہی نرالی ہے۔ گرمیوں میں جتنی رونق ان باغوں میں ہوتی ہے، اور کہیں نہیں ہوتی،
پینتیس ۳۵ پیسے خرچو اور مزے کے ساتھ نظارے دیکھو۔ عشق بازی کے لئے ان باغوں سے
اچھی جگہ اگر کہیں اور ملے تو شرط! پھولوں کی کیاریوں سے مزین سرسبز قالینوں پر چناروں
کی سہاونی چھاؤں تلے پھول ہی پھول بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ادھ کھلے، کھلے، پژمردہ،
اور مرجھائے ہوئے!

شگفتہ پھولوں کا طواف کرنا ہی بھونروں کا کام ہوتا ہے۔ ہمارا تو ہر اتوار کو یہ شغل ہے
کہ پانچ چھ دوست اکٹھے ہوئے اور آنکھوں کی تشنگی بجھانے کے لئے کسی نہ کسی باغ میں

ملبوس، مسکراتی، نازک اندام، روئی کے اُن چُنے گالوں کی طرح ملائم بننے کی کوشش کرتی ہوئی

نئی پھوٹی سرسوں کی کونپلوں کی مانند، لیکن اُن کے چہروں کے پسِ پردہ کتنے ہی سیاہ منظر

میرے دِل و دماغ کے پردوں پر اُبھر اُبھر آتے اور میرا من ہتلاکے رہ جاتا۔ زندگی کے سُہانے

پن کا یقین جاتا نظر آتا۔ اور اس کیفیت کی بدمزگی سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے

سامنے پڑا ہوا پیگ خالی کر دیا۔ اور پھر اپنے بکھرے خیالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ ایک ہی

مرکز پر، جہاں سے زندگی کی خوب صورتی کی کلی پھوٹتی ہے۔

آرکیسٹرا دھیمی دھیمی سُروں میں بڑے پیار سے بج رہا تھا۔ کبھی کبھی ان سُروں سے پائپ

کی آواز ایسی اُبھر آتی جیسے بہت سے بھنورے ایک ساتھ منڈلانے لگ پڑے ہوں۔ اور

اس سے دماغ سے اُبھرتی لہروں کو اور بھی ہچکولے ملتے ہوں۔ میٹھے میٹھے، پیارے پیارے،

پرسوز، زندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو جانے والے، وہی پہلے کی صورتیں اب اچھی اور پیاری

لگنے لگیں!

کچھ دُوری پر کھڑا بیرا، جس پر مجھے رہ رہ کر ہنسی آ رہی تھی، میری طرف دیکھ رہا تھا۔

لگاتار ٹکٹکی باندھے ہوئے، جو میرے ایک اشارے پر پیگ بھر سکتا تھا۔ میں کیوں پی رہا

تھا اور وہ کیوں پلا رہا تھا۔ اس بات سے شاید ہم دونوں ہی بے خبر تھے!

بیرا کچھ اجنبی سا بن کر اور بھنویں سُکیڑ کر میرے سامنے بیٹھے آدمی کا آرڈر لے کر گیا ہی

تھا کہ میرے جی میں آیا، اُسے بُلا کر پُوچھ لوں کہ اس آدمی نے کن چیزوں کا آرڈر کیا تھا۔

لیکن وہ چلا گیا اور میں اُسے بُلا نہ سکا!

"میرا نام خالق ہے۔" سامنے بیٹھے آدمی نے خود ہی اپنی بات شروع کر دی۔ "شہر کے

سبھی ہوٹل بند ہیں۔ میرا خیال ہے ماہِ رمضان کی وجہ سے!"

میں اُس کی داستان سُننے کے موڈ میں نہ تھا۔ اور نہ ہی میں نے اُسے سُنانے کی دعوت

دی تھی۔ سامنے پڑے ہوئے رسالے کا ورق اُلٹتے ہی ایک ادھ ننگی بھرپور جسم کی خوب

بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ کشمیری پٹو کی واسکٹ، السا ہی کوٹ پہنے ہوئے، گلوبند پر دوہری لال دھاری کی جوڑ پٹی اُس نے اپنے کندھوں پر سمیٹ رکھی تھی۔

"باہر برف گر رہی ہے۔" اُس نے دوسری بار کہا۔ میرے سامنے عورتوں کی ادھ ننگی تصویروں سے بھرا ہوا ایک انگریزی رسالہ پڑا ہوا تھا۔ "ہاں گر رہی ہوگی! گرنے دو!!" میں نے رسالے سے نظریں اُٹھانے کے بعد لاپرواہی سے اُس کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر ادھ ننگی تصویروں میں کھو جانے کے ارادے سے رسالے کی طرف جھکا۔ لیکن ایسا نہ کر سکا۔ وہ اجنبی میری بے اطمینانی کا باعث بن رہا تھا۔ میں نے صوفہ کے ساتھ اپنی پیٹھ جوڑتے ہوئے بھرپور نظروں سے اُس کی طرف دیکھا ——

"ہندوستان کی بڑی پٹائی ہوئی ہے لیکن پھر بھی ڈٹا رہا ہے۔"

"چھوڑو یار۔ جو پٹ گیا، سو پٹ گیا۔ فیصلہ تو ہار جیت ہی کرتی ہے۔ باقی تو انسان کی بوکھلاہٹ ہوتی ہے!"

میرے سامنے بیٹھے آدمی نے دوسری میز پر بیٹھے لوگوں کی باتیں سُن کر مجھ سے پوچھا:

"کیا کہیں لڑائی ہو رہی ہے؟"

"بھارت اور ایک چھوٹے سے جزیرے غرب الہند (ویسٹ انڈیز) کے بیچ۔" میں نے چڑ کر اُس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ مان نہ مان، میں تیرا مہمان (جیسے وہ فیصلہ کر کے آیا ہو کہ مجھ ہی سے اس کا جواب لینا ہے)

"کتنی حیرانی کی بات ہے کہ مجھے تو اس لڑائی کے بارے میں کوئی علم نہیں!"

شہر کے معزز لوگوں کا سب سے بڑا اور خوب صورت ریستوران اور یار لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔

آج کی شب یہاں ناچ کا ایک خاص پروگرام تھا اور لوگ ابھی سے آنا شروع ہو گئے تھے۔ میری جانی پہچانی کئی صورتیں تھیں۔ دوشیزائیں بھاری گرم کپڑوں میں سر سے پاؤں تک

کباب کا ایک حصّہ کاٹ لیا اور چپ چاپ کر کے کھانے لگا۔ میری طرف دیکھ کر وہ ایک بار پھر مُسکرایا، جیسے کہ کوئی پُرانا واقف کار ہو۔ بغیر مطلب کے اُس کی مُسکراہٹ پر مجھے غصّہ آ گیا اور اچانک میرے مُنہ سے "جنگلی" اور "دیہاتی" الفاظ نکل گئے۔ پتہ نہیں اُس نے میری آواز سُنی یا نہیں لیکن وہ اطمینان کے لہجے میں بول اُٹھا: "باہر برف باری زوروں پر ہونے لگی ہے، صُبح تک نہ جانے اس کی کتنی تہیں جمع ہو جائیں گی!" اُس نے جلدی سے چائے پی ڈالی، جیسے اُسے بہت جلدی جانا ہو۔ چائے پینے کے بعد وہ چھت پر لٹکتے رنگ برنگے فانوسوں، کاغذ اور پلاسٹک کے پھُولوں کی طرف دیکھنے لگا یا پھر دیوار اور چھت پر چہرے ٹٹولنے کا جتن کرنے لگا۔ کچھ پل اُس کی نظریں آرکیسٹرا بجانے والوں پر ٹکی رہیں اور پھر ہال میں بیٹھی دوشیزاؤں کے چہروں پر سے سرکنے لگیں۔ اُس نے میرے قریب آکر دھیمی آواز میں جیسے اپنائیت کے انداز میں پُوچھا: "یہ عورتیں بھی پیتی ہیں کیا؟" اُس کے چہرے پر بھولے پن اور شرارت کے ملے جُلے تاثرات اُبھرتے اور مٹتے تھے۔ اُس وقت میں نے چاہا کہ اُس کے چہرے پر زور سے ایک تھپّڑ رسید کروں اور اُس کا ڈیڑھ مُنہ توڑ دوں، جیسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ میرے دِل میں اُس کے لئے کوئی اپنائیت نہیں!

"سفید قالین پر پڑے ہوئے سیاہی کے دھبّے اور بھی بڑے ہو گئے ہیں۔" کسی نے کہا۔

ایک عورت بولی: "ایسے لگتا ہے جیسے چاولوں میں بہت سے روڑے مِل گئے ہوں! اور پلاؤ کھاتے ہوئے تمام کے تمام دانتوں کے نیچے آ گئے ہوں اور معزّز لوگ اس طرح کی ملاوٹ کرنے والوں کو کوس رہے ہوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے! انسان کا مزہ کِرکِرا ہو کر رہ جاتا ہے۔ لعنت ایسے وقت کو، جہاں زندگی کا سُکھ نصیب نہ ہو!"

میرے سامنے بیٹھے آدمی نے تنگ آکر بیرے کو زور سے پُکارا، ایسے اطمینان اور بے باکی سے، جیسے گاؤں کے کسی ٹیلے پر کھڑا ہو کر ایک دیہاتی دوسرے راہ گیر کو اونچی آواز سے یا کسانی بُلا لیتا ہے۔ اُس کی آواز جیسے ایک دم سارے ہال کی خاموشی

صورت دوشیزہ کی تصویر پر میری نظریں جم گئیں، جو پورے صفحے پر بکھری پڑی تھی۔

مجھے لگا کہ اُس کے جسم سے جذبات کا ایک غبار اُبھر آیا ہو، جیسے کہ وہ سانس لے رہی ہو، جیسے اُس کا دل دھڑک رہا ہو۔ اور پھر میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرا دل بھی دھڑکنے لگا ہو۔ لہریں بکھیرتا ہوا جو میری نس نس میں پھیل رہی ہوں، گدگدا رہی ہوں!

بیرا نہ جانے میرے کون سے اشارے پر سامنے کا پیگ بھر گیا اور ٹھک کی آواز سے میں چونک سا پڑا۔ باہر برف کے موٹے موٹے گالے پڑ رہے تھے جو روشن دان کے شیشوں پر سے سرک جاتے!

میں نے ایک پورا گھونٹ بھر کے اُن تمام خلط ملط خیالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی جو میرے دماغ کی گیلی زمین سے کھنبول (مشروم) کی طرح پھوٹ پڑے تھے۔

میری نظریں سامنے بیٹھے آدمی پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کا مجھے پورا احساس تھا کہ اس طرح سے کسی کو گھورنا تہذیب کی نشانی نہیں اور وہ بھی ایک ریستوراں میں۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اُس کی ناک کی چوٹی پر ایک کالے تل، اُس کے نچلے ہونٹ کے نیچے حجامت بناتے ہوئے لگے زخم اور آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے ملے جُلے جذبات و تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر خوشی اور حیرانی کے ملے جُلے تاثرات تھے۔ اپنی جانب میری نظروں کو دیکھ کر وہ مسکرا پڑا۔ بیرا اُس کے سامنے چائے رکھ رہا تھا۔ میں آلو کی چپس ایک ایک کر کے منہ میں ڈالنے لگا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اُس وقت میں نے بہت سی ملی جلی آوازیں سُنیں۔ آرکیسٹرا بند تھا۔ ٹیڈی بوائے گا رہا تھا۔ آوازیں ہنسنے کی، پلیٹوں، چمچوں، بوتلوں اور چھری کانٹوں کی۔

"شڑپ"، میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے بیٹھا آدمی چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ میں پیالی تھی اور بائیں ہاتھ میں کباب۔ کباب، جیسے سانپ کا بچہ ہو۔ اور اُس کے ہاتھوں سے بھاگنے کی کوشش کر رہا ہو! اُس نے دیکھتے ہی دیکھتے

"تو دیکھتا نہیں، تیرا بیرا اتنے پیسے مانگ رہا ہے!"

مجھے سب کچھ پتہ ہے۔ بل میں نے ہی لکھا ہے۔" مینجر کہہ رہا تھا۔ "تو بالکل گنوار ہے۔ دیکھتے نہیں کتنے معزز شہری آئے ہوئے ہیں اور تم یہاں بدمزگی پیدا کر رہے ہو۔ اور پھر یہ کوئی چائے پینے کا وقت ہے۔" مینجر کی آواز میں کچھ تلخی آگئی تھی۔

"لیکن تو مجھے اندر آکر چائے پینے سے تو روک نہیں سکتا! یہ بھی تو ایک دکان ہے۔"

مینجر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور پھر اسے ساتھ والے کمرے میں لے گیا جہاں سے وہ کچھ دیر کے بعد لوئی جھاڑتا ہوا، اور بڑبڑاتا ہوا باہر آیا۔ "یہاں اچھا بھلا انسان بھی پاگل ہو جاتا ہے۔ مجھے ایک عمر ہو گئی ہے شہر میں آتے ہوئے، لیکن آج میں ایک نئی دنیا میں آ پھنسا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

"الو کا پٹھا!" مینجر دربان کو تنبیہہ کر رہا تھا۔ "میں تجھے نوکری سے برطرف کر دوں گا۔"

"لیکن حضور، میں کسی کو اندر آنے سے تو روک نہیں سکتا۔" دربان سر جھکا کر چلا گیا۔

آرکیسٹرا بند پڑا تھا۔ مینجر مائک پر آکر کہنے لگا:

"لیڈیز اینڈ جنٹس! مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک جنگلی کے آجانے سے آپ کو بدمزگی ہوئی ہے۔ اس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں۔ اب ہی مال نا گی رائے "ناچ شروع ہو رہا ہے!"

ہال میں پہلے ایک مدھم سی ہنسی گونج اٹھی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد آرکیسٹرا پھر سے بجنے لگا۔ "بابا بلیک شیپ ہیو یو اینی وول... ..." ماحول میں پہلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

"یہ دھبہ برا لگتا ہے!"

میں نے پورا پیگ اپنے حلق سے انڈیل دیا۔ بیرے نے میرے پاس کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔۔۔ "اور کیا ہو سکتا! میرا خیال ہے کہ اس سارے قالین کو اسی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ لیکن یہ کام مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ دھبہ جانے کا نہیں۔۔" بیرا اپنی رائے دے کر چپ ہو گیا۔ قالین کے مالک کو ہی نہیں بلکہ میری طرح کتنے اور لوگوں کو اس دھبے کی وجہ سے کوفت ہو

(پنجابی سے ترجمہ: سنتوکھ سنگھ دھیر) [handwritten marginal note, partly legible]

میں طلاطم مچ گیا ہو۔ کونٹر کے پیچھے کھڑا مینجر جو کتنی دیر سے ذہنی کشمکش میں اُلجھا پڑا تھا، ایک دم گھبرا اُٹھا۔ اور بھی کتنی نظریں ایک ساتھ اُس پر مرکوز ہوگئیں۔

بیرے نے اُس کے سامنے بل رکھ دیا۔

"کتنے پیسے؟" اُس نے پھر بھی بیرے سے پوچھا۔

"پانچ رُوپے ستّر پیسے۔" بیرے نے اطمینان سے جواب دیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ ایک دم کھینچ لیا جو اُس نے جوڑ پٹّی اُتار کر کوٹ کے بٹن کھول کر واسکٹ کے اندر کی جیب میں ڈالا تھا۔

"کیا کہا؟ پانچ رُوپے ستّر پیسے!"

"ہاں جناب پانچ رُوپے ستّر پیسے۔" بیرے نے نرمی سے دہرایا۔

"لو بات سُنو۔ کسی اور کو بے وقوف بنانا۔ آپ نے کیا سمجھا ہے۔ میں دیہاتی انسان یہاں آکر پھنس گیا ہوں۔ تُم میری کھال نہیں اُدھیڑ سکتے۔ یہ پیسے میں نے کسی بید سے اُتار کر نہیں لائے۔ دو پیالے چائے اور دو ٹکڑے کباب کے تو صرف ایک روپیہ بیس پیسے ہی بنتے ہیں، جیسے شہر کے باقی ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ زیادہ پیسے دینے کے لئے میں تو بالکل تیار نہیں، چاہے آپ جو کچھ بھی کریں!" —— بیرا ایسے حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا لیکن جلد ہی سنبھلتے ہوئے اُس نے اُسے کشمیری میں سمجھایا۔ "بھائی صاحب، یہاں سب چیزوں کی قیمت مُقرّر ہے۔" اُس نے دوسری میز سے مینو اُٹھا کر اُسے دِکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ قیمتوں کی فہرست ہے۔ یہاں کوئی بات زیادہ لینے کی درج نہیں۔" ہال میں بیٹھے سبھی لوگ اس کونے کی طرف دیکھنے لگ پڑے تھے۔ تیکھی نظروں اور چہروں پر حقارت کے تاثرات لئے ہوئے۔ اسی وقت مینجر بھی وہاں پہنچ چُکا تھا جسے دیکھ کر اُس آدمی نے پُوچھا:

"تم مینجر ہو۔ اُس جگہ (کونٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کھڑے رہتے ہو۔ تمھارے یہ بیرے گاہکوں کی کھال اُتارنے میں مصروف ہیں۔"

"کھال اُتارنے کی کون سی بات ہے؟" مینجر نے اُسے اطمینان سے جواب دیا۔

دھبّہ

کنول کشمیری

سنبھال کر رکھے سفید اور مینٹل قالین پر اُمٹ سیاہی کے کالے دھبّے پڑ گئے تھے جن کی وجہ سے اس کے مالک کو سخت ذہنی کوفت ہو رہی تھی۔ غصّے میں اُس کی حالت کے بارے میں اس وقت کچھ سوچا ہی جا رہا تھا کہ اُسی پل ایک... بنبی اور عام آدمی مجھ سے پوچھے بغیر میری ہی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور اُس قالین کے مالک کی جگہ مجھے اُلجھن میں ڈال دیا۔

کتنی گھٹیا سی بات ہے کہ آپ کسی شراب خانے کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھے ہوئے ہیں۔ سردی سے بچنے کے لئے یا تنہائی کے احساس کو مٹانے کے لئے گرمی حاصل کر رہے ہیں اور اس طرح کوئی آ ٹپکے۔ ذہنی اُلجھن کا پیدا ہونا کوئی ان ہونی بات نہیں ہوتی۔ اس سے دِل کا قرار جاتا رہتا ہے۔

"باہر برف پڑ رہی ہے۔" اُس نے اپنی جوڑ پٹی (اُونی چادر) جھاڑتے ہوئے اور کرسی پہ

ادھورا تاج محل

خالد حسین

ویسے کشمیر میں کوکرناگ سے لے کر گلمرگ تک اور یوس مرگ سے لے کر پہلگام تک جہاں کہیں بھی جائیے، قدرتی حسن کو دیکھ کر جی مچل اٹھتا ہے۔ مگر جھیل ڈل میں نہرو پارک اور مغل باغات کی شان ہی نرالی ہے۔ گرمیوں میں جتنی رونق ان باغوں میں ہوتی ہے، اور کہیں نہیں ہوتی۔ پینتیس ۳۵ پیسے خرچو اور مزے کے ساتھ نظارے دیکھو۔ عشق بازی کے لئے ان باغوں سے اچھی جگہ اگر کہیں اور ملے تو شرط! پھولوں کی کیاریوں سے مزین سرسبز قالینوں پر چناروں کی سہاونی چھاوں تلے پھول ہی پھول بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ادھ کھلے، کھلے، پژمردہ اور مرجھائے ہوئے!

شگفتہ پھولوں کا طواف کرنا ہی بھونروں کا کام ہوتا ہے۔ ہمارا تو ہر اتوار کو یہ شغل ہے کہ پانچ چھ دوست اکٹھے ہوئے اور آنکھوں کی تشنگی بجھانے کے لئے کسی نہ کسی باغ میں

مایوس، مُسکراتی، نازک اندام، روئی کے اُن چِٹے گالوں کی طرح ملائم بننے کی کوشش کرتی ہوئی

ننھی پھوٹی سرسوں کی کونپلوں کی مانند، لیکن اُن کے چہروں کے پسِ پردہ کتنے ہی سیاہ منظر

میرے دل و دماغ کے پردوں پر اُبھر اُبھر آتے اور میرا من مضمحل ہو کے رہ جاتا۔ زندگی کے سُہانے

پن کا یقین جاتا نظر آتا۔ اور اس کیفیت کی بدمزگی سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے

سامنے پڑا ہوا پیگ خالی کر دیا۔ اور پھر اپنے بکھرے خیالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ ایک ہی

مرکز پر، جہاں سے زندگی کی خوب صورتی کی کلی پھوٹتی ہے۔

آرکیسٹرا دھیمی سُروں میں بڑے پیار سے بج رہا تھا۔ کبھی کبھی ان سُروں سے پائپ

کی آواز ایسی اُبھر آتی جیسے بہت سے بھنورے ایک ساتھ منڈلانے لگ پڑے ہوں۔ اور

اس سے دماغ سے اُبھرتی لہروں کو اور بھی ہچکولے ملتے ہوں۔ میٹھے میٹھے، پیارے پیارے،

پُرسوز، زندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو جانے والے، وہی پہلے کی صورتیں اب اچھی اور پیاری

لگنے لگیں!

کچھ دُوری پر کھڑا بیرا، جس پر مجھے رہ رہ کر ہنسی آ رہی تھی، میری طرف دیکھ رہا تھا۔

لگاتار ٹکٹکی باندھے ہوئے، جو میرے ایک اشارے پر پیگ بھر سکتا تھا۔ میں کیوں پی رہا

تھا اور وہ کیوں پلا رہا تھا۔ اس بات سے شاید ہم دونوں ہی بے خبر تھے!

بیرا کچھ اجنبی سا بن کر اور بھنویں سُکیڑ کر میرے سامنے بیٹھے آدمی کا آرڈر لے کر گیا ہی

تھا کہ میرے جی میں آیا، اُسے بُلا کر پُوچھ لوں کہ اس آدمی نے کن چیزوں کا آرڈر کیا تھا۔

لیکن وہ چلا گیا اور میں اُسے بُلا نہ سکا!

"میرا نام خالق ہے۔" سامنے بیٹھے آدمی نے خود ہی اپنی بات شروع کر دی۔ "شہر کے

سبھی ہوٹل بند ہیں۔ میرا خیال ہے ماہِ رمضان کی وجہ سے!"

میں اُس کی داستان سُننے کے مُوڈ میں نہ تھا۔ اور نہ ہی میں نے اُسے سُنانے کی دعوت

دی تھی۔ سامنے پڑے ہوئے رسالے کا ورق اُلٹتے ہی ایک ادھ ننگی بھرپُور جسم کی خوب

بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ کشمیری پٹو کی واسکٹ، ایسا ہی کوٹ پہنے ہوئے، گلوبند پر دوہری لال دھاری کی جوڑ پٹی اُس نے اپنے کندھوں پر سمیٹ رکھی تھی۔

"باہر برف گر رہی ہے۔" اُس نے دوسری بار کہا۔ میرے سامنے عورتوں کی ادھ ننگی تصویروں سے بھرا ہوا ایک انگریزی رسالہ پڑا ہوا تھا۔ "ہاں گر رہی ہوگی! گرنے دو!!" میں نے رسالے سے نظریں اُٹھانے کے بعد لاپروائی سے اُس کی طرف توجّہ کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر ادھ ننگی تصویروں میں کھو جانے کے ارادے سے رسالے کی طرف جھکا۔ لیکن ایسا نہ کرسکا۔ وہ اجنبی میری بے اطمینانی کا باعث بن رہا تھا۔ میں نے صوفہ کے ساتھ اپنی پیٹھ جوڑتے ہوئے بھرپور نظروں سے اُس کی طرف دیکھا ـــــــ

"ہندوستان کی بڑی پٹائی ہوئی ہے لیکن پھر بھی ڈٹا رہا ہے۔"

"چھوڑو یار۔ جو پٹ گیا، سو پٹ گیا۔ فیصلہ تو ہار جیت ہی کرتی ہے۔ باقی تو انسان کی بوکھلاہٹ ہوتی ہے!"

میرے سامنے بیٹھے آدمی نے دوسری میز پر بیٹھے لوگوں کی باتیں سُن کر مجھ سے پوچھا:

"کیا کہیں لڑائی ہو رہی ہے؟"

"بھارت اور ایک چھوٹے سے جزیرے غرب الہند (ویسٹ انڈیز) کے بیچ۔" میں نے چڑ کر اُس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ مان نہ مان، میں تیرا مہمان (جیسے وہ فیصلہ کرکے آیا ہو کہ مجھ ہی سے اس کا جواب لینا ہے)

"کتنی حیرانی کی بات ہے کہ مجھے تو اس لڑائی کے بارے میں کوئی علم نہیں!"

شہر کے معززّ لوگوں کا سب سے بڑا اور خوب صورت ریستوران اور بار لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔

آج کی شب یہاں ناچ کا ایک خاص پروگرام تھا اور لوگ ابھی سے آنا شروع ہو گئے تھے۔ میری جانی پہچانی کئی صورتیں تھیں۔ دوشیزائیں بھاری گرم کپڑوں میں سر سے پاؤں تک

کباب کا ایک حصّہ کاٹ لیا اور چپ چاپ کرکے کھانے لگا۔ میری طرف دیکھ کر وہ ایک بار پھر مُسکرایا، جیسے کہ کوئی پُرانا واقف کار ہو۔ بغیر مطلب کے اُس کی مُسکراہٹ پر مجھے غصّہ آگیا اور اچانک میرے منہ سے "جنگلی" اور "دیہاتی" الفاظ نکل گئے۔ پتہ نہیں اُس نے میری آواز سُنی یا نہیں لیکن وہ اطمینان کے لہجے میں بول اُٹھا: "باہر برف باری زوروں پر ہونے لگی ہے، صبح تک نہ جانے اس کی کتنی تہیں جمع ہو جائیں گی!" اُس نے جلدی سے چائے پی ڈالی، جیسے اُسے بہت جلدی جانا ہو۔ چائے پینے کے بعد وہ چھت پر لٹکتے رنگ برنگے فانوسوں، کاغذ اور پلاسٹک کے پھولوں کی طرف دیکھنے لگا یا پھر دیوار اور چھت پر چہرے ٹٹولنے کا جتن کرنے لگا۔ کچھ پل اُس کی نظریں آرکیسٹرا بجانے والوں پر ٹکی رہیں اور پھر ہال میں بیٹھی دوشیزاؤں کے چہروں پر سے سرکنے لگیں۔ اُس نے میرے قریب آکر دھیمی آواز میں جیسے اپنائیت کے انداز میں پوچھا: "یہ عورتیں بھی پیتی ہیں کیا؟" اُس کے چہرے پر بھولے پن اور شرارت کے ملے جلے تاثرات اُبھرتے اور مٹتے تھے۔ اُس وقت میں نے چاہا کہ اُس کے چہرے پر زور سے ایک تھپڑ رسید کروں اور اُس کا ڈھیٹھ منہ توڑ دوں، جیسے اتنا بھی پتہ نہیں کہ میرے دل میں اُس کے لئے کوئی اپنائیت نہیں!

سفید قالین پر پڑے ہوئے سیاہی کے دھبّے اور بھی بڑے ہو گئے ہیں۔" کسی نے کہا ایک عورت بولی: ایسے لگتا ہے جیسے چاولوں میں بہت سے روڑے مِل گئے ہوں! اور پلاؤ کھاتے ہوئے تمام کے تمام دانتوں کے نیچے آگئے ہوں اور معزز لوگ اس طرح کی مِلاوٹ کرنے والوں کو کوس رہے ہوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے! انسان کا مزہ کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔ لعنت ایسے وقت کو، جہاں زندگی کا سکھ نصیب نہ ہو!"

میرے سامنے بیٹھے آدمی نے تنگ آکر بیرے کو زور سے پُکارا، ایسے اطمینان اور بے باکی سے، جیسے گاؤں کے کسی ٹیلے پر کھڑا ہو کر ایک دیہاتی دوسرے راہ گیر کو اُونچی آواز سے باآسانی بُلا لیتا ہے۔ اُس کی آواز جیسے ایک دم سارے ہال کی خاموشی

صورت دوشیزہ کی تصویر پر میری نظریں جم گئیں، جو پورے صفحے پر بکھری پڑی تھی۔
مجھے لگا کہ اُس کے جسم سے جذبات کا ایک غبار اُبھر آیا ہو، جیسے کہ وہ سانس لے رہی ہو، جیسے اُس کا دِل دھڑک رہا ہو۔ اور پھر میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرا دِل بھی دھڑکنے لگا ہو۔ لہریں بکھیرتا ہوا جو میری نس نس میں پھیل رہی ہوں، گدگدا رہی ہوں!
بیرا نہ جانے میرے کون سے اشارے پر سامنے کا پیگ بھر گیا اور ٹِک کی آواز سے میں چونک سا پڑا۔ باہر برف کے موٹے موٹے گالے پڑ رہے تھے جو روشن دان کے شیشوں پر سے سرک جاتے!
میں نے ایک پورا گھونٹ بھر کے اُن تمام خلط ملط خیالوں کو سمیٹنے کی کوشش کی جو میرے دماغ کی گیلی زمین سے کھنبول (مشروم) کی طرح پھوٹ پڑے تھے۔
میری نظریں سامنے بیٹھے آدمی پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کا مجھے پورا احساس تھا کہ اس طرح سے کسی کو گھورنا تہذیب کی نشانی نہیں اور وہ بھی ایک ریستوراں میں۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اُس کی ناک کی چوٹی پر ایک کالے تِل، اُس کے نچلے ہونٹ کے نیچے حجامت بناتے ہوئے لگے زخم اور آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے ملے جُلے جذبات و تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر خوشی اور حیرانی کے ملے جُلے تاثرات تھے۔ اپنی جانب میری نظروں کو دیکھ کر وہ مُسکرا پڑا۔ بیرا اُس کے سامنے چائے رکھ رہا تھا۔ میں آلو کی چپس ایک ایک کر کے مُنہ میں ڈالنے لگا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اُس وقت میں نے بہت سی مِلی جُلی آوازیں سُنیں۔ آرکیسٹرا بند تھا۔ ٹیڈمی بوائے گا رہا تھا۔ آوازیں ہنسنے کی، پلیٹوں، چمچوں، بوتلوں اور چھُری کانٹوں کی۔
"شڑپ"، میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے بیٹھا آدمی چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا اُس کے دائیں ہاتھ میں پیالی تھی اور بائیں ہاتھ میں کباب۔ کباب، جیسے سانپ کا بچّہ ہو۔ اور اُس کے ہاتھوں سے بھاگنے کی کوشش کر رہا ہو! اُس نے دیکھتے ہی دیکھتے

"تو دیکھتا نہیں، تیرا بیرا اتنے پیسے مانگ رہا ہے!"

مجھے سب کچھ پتہ ہے۔ بل میں نے ہی لکھا ہے۔" مینیجر کہہ رہا تھا۔ "تو بالکل گنوار ہے۔ دیکھتے نہیں کتنے معزز شہری آئے ہوئے ہیں اور تم یہاں بدمزگی پیدا کر رہے ہو، اور پھر یہ کوئی چائے پینے کا وقت ہے۔" مینیجر کی آواز میں کچھ تلخی آ گئی تھی۔

"لیکن تو مجھے اندر آ کر چائے پینے سے تو روک نہیں سکتا! یہ بھی تو ایک دکان ہے۔"

مینیجر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اور پھر اسے ساتھ والے کمرے میں لے گیا جہاں سے وہ کچھ دیر کے بعد لوئی جھاڑتا ہوا، اور بڑبڑاتا ہوا باہر آیا۔ "یہاں اچھا بھلا انسان بھی پاگل ہو جاتا ہے۔ مجھے ایک عمر ہو گئی ہے شہر میں آتے ہوئے، لیکن آج میں ایک نئی دنیا میں آ گیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

"الو کا پٹھا! مینیجر دربان کو تنبیہ کر رہا تھا۔ "میں تجھے نوکری سے برطرف کر دوں گا۔"

"لیکن حضور، میں کسی کو اندر آنے سے تو روک نہیں سکتا۔" دربان سر جھکا کر چلا گیا۔

آرکیسٹرا بند پڑا تھا۔ مینیجر مائک پر آ کر کہنے لگا:

"لیڈیز اینڈ جنٹس! مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک جنگلی کے آ جانے سے آپ کو بدمزگی ہوئی ہے۔ اس کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں۔ اب "ہی مال ناگی رائے" ناچ شروع ہو رہا ہے!"

ہال میں پہلے ایک مدھم سی ہنسی گونج اٹھی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد آرکیسٹرا پھر سے بجنے لگا۔ "بابا بلیک شیپ ہیو یو اینی وول... ..." ماحول میں پہلے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

"یہ دھبہ برا لگتا ہے!"

میں نے پورا پیگ اپنے حلق سے انڈیل دیا۔ بیرے نے میرے پاس کھڑے ہوتے ہوئے کہا — "اور کیا ہو سکتا! میرا خیال ہے کہ اس سارے قالین کو اسی رنگ میں رنگ دیا جائے۔ لیکن یہ کام مشکل ضرور ہے۔ کیونکہ دھبہ جانے کا نہیں۔" بیرا اپنی رائے دے کر چپ ہو گیا۔ قالین کے مالک کو ہی نہیں بلکہ میری طرح کتنے اور لوگوں کو اس دھبے کی وجہ سے کوفت ہوتی

میں طلاطم مچ گیا ہو۔ کونٹر کے پیچھے کھڑا مینیجر جو کتنی دیر سے ذہنی کشمکش میں اُلجھا پڑا تھا، ایک دم گھبرا اُٹھا۔ اور بھی کتنی نظریں ایک ساتھ اُس پر مرکوز ہو گئیں۔

بیرے نے اُس کے سامنے بل رکھ دیا۔

"کتنے پیسے؟" اُس نے پھر بھی بیرے سے پوچھا۔

"پانچ رُوپے ستّر پیسے۔" بیرے نے اطمینان سے جواب دیا۔ اُس نے اپنا ہاتھ ایک دم کھینچ لیا جو اُس نے جوڑ پٹی اُتار کر کوٹ کے بٹن کھول کر واسکٹ کے اندر کی جیب میں ڈالا تھا۔

"کیا کہا؟ پانچ رُوپے ستّر پیسے!"

"ہاں جناب پانچ رُوپے ستّر پیسے۔" بیرے نے نرمی سے دہرایا۔

"تو بات سُنو۔ کسی اور کو بے وقوف بنانا۔ آپ نے کیا سمجھا ہے۔ میں دیہاتی انسان یہاں آکر پھنس گیا ہوں۔ تُم میری کھال نہیں اُدھیڑ سکتے۔ یہ پیسے میں نے کسی بید سے اُتار کر نہیں لائے۔ دو پیالے چائے اور دو ٹکڑے کباب کے تو صرف ایک روپیہ بیس پیسے ہی بنتے ہیں، جیسے شہر کے باقی ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ زیادہ پیسے دینے کے لئے میں تو بالکل تیار نہیں، چاہے آپ جو کچھ بھی کریں!" ——— بیرا ایسے حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا لیکن جلد ہی سنبھلتے ہوئے اُس نے اُسے کشمیری میں سمجھایا۔ "بھائی صاحب، یہاں سب چیزوں کی قیمت مُقرّر ہے۔" اُس نے دوسری میز سے مینو اُٹھا کر اُسے دِکھلاتے ہوئے کہا۔ "یہ قیمتوں کی فہرست ہے۔ یہاں کوئی بات زیادہ لینے کی درج نہیں۔" ہال میں بیٹھے سبھی لوگ اس کونے کی طرف دیکھنے لگ پڑے تھے۔ تیکھی نظروں اور چہروں پر حقارت کے تاثرات لئے ہوئے۔ اسی وقت مینیجر بھی وہاں پہنچ چُکا تھا جسے دیکھ کر اُس آدمی نے پُوچھا:

"تُم مینیجر ہو۔ اُس جگہ (کونٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کھڑے رہتے ہو۔ تُمھارے یہ بیرے گاہکوں کی کھال اُتارنے میں مصروف ہیں۔"

"کھال اُتارنے کی کون سی بات ہے۔" مینیجر نے اُسے اطمینان سے جواب دیا۔

جا بیٹھے۔ پروگرام کے مطابق آج ہمیں چشمۂ شاہی جانا ہے۔ امبری کے پیڑوں تلے کچھ کشمیری بچوں کو بیٹھے دیکھ کر ہم بھی سامنے کے چھتری والے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

اُدھر سماوار میں کشمیری چائے اُبل رہی تھی۔ ایک بڑھیا جو شاید اُن کی ماں تھی، سماوار میں پھونکیں مار رہی تھی۔ ایک لڑکی پیالیاں دھو رہی تھی۔ پاس ہی دری پر بیٹھی ہوئی دو حسینائیں آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ شاید وہ سہیلیاں تھیں۔ کیونکہ ایسی راز و نیاز کی باتیں صرف سہیلیوں ہی میں ہوا کرتی ہیں۔ ایک بغیر برقعے کے مگر دوسری برقعہ اوڑھے بیٹھی تھی۔ شاید ہمیں دیکھ کر ہی اُس نے اپنے چہرے پر برقعہ ڈالا ہوا تھا۔

"پیاریو! جلوہ دکھاؤ۔"

عادت سے مجبور کریم نے کہا۔

"تمھارے ہی چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے یہاں بیٹھے ہیں۔"

"چہرے سے پردہ ہٹاؤ تو مُرادیں بھر آئیں گی۔" اشرف نے لمبی سانس لے کر کہا۔

مگر اُس طرف کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔ تلک، جو کہ ہم میں سے کچھ زیادہ ہی سچا ناتھا، بولا: "یار! یہ کیا منہ دکھائے گی۔ یہ تو توے کی طرح کالی ہے اور اس کی آنکھیں تو ڈائن جیسی ہیں ——" تلک کے یہ الفاظ شاید اُس کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوئے۔ اُس نے غصے ہو کر چہرے سے نقاب اُٹھایا... اور کالے بادلوں میں جیسے بجلی کوندی۔ ہماری آنکھیں بجلی کی چمک دیکھتے ہی چندھیا گئیں۔ نیلی آنکھوں میں —— ویری ناگ کے گہرے چشمے کی سی مستی تھی۔ دو کالے ناگ سبز گھاس پر تڑپ رہے تھے۔ کھی کی طرح... نرم اور ملائم جسم پر آنکھیں پھسل رہی تھیں... اور اس کے جسم کا انگ انگ تھرک رہا تھا۔ گورا گورا روپ کالے ساٹن کے کپڑوں میں سے چھن چھن کر باہر آ رہا تھا —— اُس کی سہیلی اُس کو شاید... اپنے پیار کی کہانی

اَدھورا تاج محل

خالد حسین

ویسے کشمیر میں کوکرناگ سے لے کر گلمرگ تک اور یوس مرگ سے لے کر پہلگام تک جہاں کہیں جائیے، قدرتی حسن کو دیکھ کر جی مچل اُٹھتا ہے۔ مگر جھیلِ ڈل میں نہرو پارک اور مغل باغات کی شان ہی نرالی ہے۔ گرمیوں میں جتنی رونق ان باغوں میں ہوتی ہے، اور کہیں نہیں ہوتی، پینتیس ۳۵ پیسے خرچو اور مزے کے ساتھ نظارے دیکھو۔ عشق بازی کے لئے ان باغوں سے اچھی جگہ اگر کہیں اور ملے تو شرط! پھولوں کی کیاریوں سے مزّین سرسبز قالینوں پر چناروں کی سہاونی چھاؤں تلے پھول ہی پھول بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ادھ کھلے، کھلے، پژمردہ اور مرجھائے ہوئے!

شگفتہ پھولوں کا طواف کرنا ہی بھونروں کا کام ہوتا ہے۔ ہمارا تو ہر اتوار کو یہ شغل ہے کہ پانچ چھ دوست اکٹھے ہوئے اور آنکھوں کی تشنگی بجھانے کے لئے کسی نہ کسی باغ میں

مُختی

پریم سنگھ

مُختی سینکڑوں میں سے ایک تھی۔ اُس کا قد اور رُوپ پُر کشش تھے۔ رنگ گندمی، پتلی پتلی، لمبی لمبی۔ مُختی کی ایک اپنی ہی شخصیت تھی۔

مختی، جمال خاکروب کی بیوی تھی۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ اُسے جمال شیخ کی بیوی کہنے سے بات نہیں بنتی تھی!

بلّی کے پنجے کے نیچے آئے چوہے کی طرح جمال، مختی کے سامنے سہما سہما رہتا تھا۔ جمال کے بچے، مختی کے بچے کہہ کے جانے جاتے تھے۔ اور تو اور، خود جمال بھی محلے کی عورتوں میں "مختی کا جمال" کے نام سے ہی پکارا جاتا تھا۔

جتنی مختی قد آور تھی، اُتنا ہی جمال پست قد تھا۔ اور اپنی بیوی کو دیکھ کر اُس کے اندر کا جمال پستیوں میں کھویا رہتا۔

ہنس ہنس کے سُنا رہی تھی۔ جو کہ ختم ہونے ہی کو نہیں آ رہی تھی۔ لیکن اس کا دھیان ہماری طرف بھی تھا۔

کریم نے کہا: "یہ مان جائے تو میں اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہوں!"

"میں اسے اپنے دِل کی رانی بنا کر رکھوں۔ اس کی راہوں میں موتی بچھاؤں۔ یہ ایک مرتبہ بھی پیار بھری نگاہوں سے تو دیکھے۔" اکبر نے کہا

"یار! خدا کی قسم۔ پٹاخہ ہے، پٹاخہ ہے۔" تلک نے کہا۔

"گرو بخشے خدا کی قسم۔ اپنی دولت کا خود مختار بناؤں، اگر یہ شادی کے لئے راضی ہو جائے! یہ تو کشمیر کے حُسن کا نچوڑ ہے۔" میں نے بھی بات میں بات ملائی۔ دونوں باتیں کرتی رہیں۔ وہ کبھی کبھی ہماری طرف دیکھ کر ہنس بھی دیتیں۔ سب یہی سمجھتے کہ شاید مجھے ہی دیکھ کر ہنسی ہے ——— چائے پی کر اُنھوں نے سارا سامان سمیٹا اور جانے کی تیاریاں کرنے لگیں ——— ان کو تیار ہوتے دیکھ کر ہم تھوڑی دُور آگے جا کر ان کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ ہماری نگاہیں ابھی بھی خوب صورتی کے اُس مجسّمہ کے انگ انگ کا جائزہ لے رہی تھیں جس کے دام میں ہم سب اسیر تھے۔ اُس نے بیٹھے بیٹھے ہی بُرقعہ اوڑھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ چاند بس بادلوں میں چھپنے ہی والا ہے!"

ایک دھماکا سا ہوا۔ لگتا تھا کہ سامنے ڈل میں طوفان آیا ہوا ہے اور شکارے ڈوب رہے ہوں۔ شنکر آچاریہ کا مندر دھنس رہا ہو۔ ہاری پربت کے قلعے کی دیواریں ڈھ رہی ہوں، ہم اس طوفان کی لہروں کے طمانچے نہیں سہہ سکے۔ اور بے سُدھ ہو کر بہہ گئے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے دو بسا کھیاں ...... ایک ادھورے تاج محل کو اپنے سہارے اٹھا کر ایک طوفان کی مانند لے گئیں۔ اور وہ ...... ادھورا تاج محل ... ... دُور تک ہماری پتھرائی ہوئی آنکھوں میں پیار کی جوت جگاتا رہا۔

{پنجابی سے ترجمہ: محمد اسد اللہ وانی} ———

چلتا تھا۔ محلّے کی عورتوں سے لڑتے وقت وہ چنڈی کا رُوپ دھار لیتی۔ اپنی برادری کی بے عزتی اُس کے تن بدن میں آگ لگا دیتی۔ اُس کی گوری گوری اور لمبی لمبی باہیں ہوا میں اُچھل پڑتیں ــــ "تم خاکروبوں کو کیا سمجھتے ہو؟ کیا ہم انسان نہیں ہیں؟ جو خاکروبوں کو گالیاں دیتی ہیں، وہ اُن کی بیویاں ہی لگتی ہوں گی!"

حیات کی حرارت سے دھڑکتی موختی خاموش خاکروبوں میں جان بھر دیتی۔ ایک دن مختی گھڑا اور تُمبک ناری بجا کر اپنا خانہ داماد لے آئی۔ اُنیس بیس برس کا چھوکرہ جُمّا اُس کا من پسند سودا تھا۔ جُمّا یتیم تھا۔ دُور کے کسی گاؤں میں اپنی بہن کے پاس رہتا تھا۔

"حق تو یہ ہے کہ یتیم اپنے آبائی کنبے کی کشش سے آزاد ہوتا ہے۔ اس لئے جُمّا اِسی گھر کا ہی ہو کر رہے گا۔ میرا نذیر بھی ابھی پانچ برس کا تو ہے۔ جب تک وہ بڑا ہو کر باپ کا جھاڑو پکڑے گا تب تک جُمّا ہی جمال کا ہاتھ بٹائے گا۔ اللہ کا لاکھ شکر ہے جس نے اتنے لمبے انتظار کے بعد ہمیں چار پیسے کمانے والا ایک داماد دیا ہے۔"

جُمّا کو دیکھ کر مختی خوابوں کی حسین وادی میں کھو جاتی!

خطّجی، موختی کی سب سے بڑی بیٹی ابھی مشکل سے دس برس کی ہوئی تھی، لیکن ماں اُس کے لئے ایک خاوند ڈھونڈ لائی تھی۔

مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ جوڑی مختی کے اندر کی عورت کو قبول نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کی خطّجی ابھی شادی کے قابل نہیں۔ اُس کے تو یہ کھیلنے کے دن ہیں۔ مگر اُسے یہ خیال بھی آجاتا ــــ، کون سا خاکروب ہے جس نے اپنی بیٹی کا نکاح نہیں پڑھا ہوا۔ وہ اپنی بیٹیوں کی عمر کیوں نہیں دیکھتے؟ میرے بھائی کو ہی دیکھو۔ وہ تو تین برسوں سے خانہ داماد لے آیا ہے۔ اُس کی زُون تو میری خطّجی کی ہی ہم عمر ہے۔ اور وہ کانا خانہ داماد کی کمائی پر گلچھرے اُڑا رہا ہے۔ پھر میں نے کون سا گناہ کیا؟"

جُمّا کی شکل و صورت دیکھ کر مختی ہواؤں میں اُڑنے لگتی۔ اُس کے اندر ایک تسکین سی آجاتی!

جمال کے گھر کی بھی مختی کی طرح اپنی ہی بناوٹ تھی۔ چھوٹے سے کُنبے کا چھوٹا سا گھر۔ صرف ایک کمرہ! لیکن ستھرا ستھرا اور مُسکراتا مُسکراتا۔ ضرورت کی ہر شئے اپنے مقام پر ٹکی ہوئی، سلیقے سے۔ کسی ہُنر مند ہاتھ کی داستان بیان کرتی تھی!

گھر کا تمام بند و بست مختی کی عمل داری میں تھا۔ جمال اپنی ساری تنخواہ چُپکے سے اپنی بیوی کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ مختی کو جمال سے کوئی خاص شکوہ نہ تھا۔ اُس نے کبھی اُسے ٹھنگنا ہونے پر طنز نہیں کیا تھا۔ ہاں۔ اُسے تب ہی جمال پر غصّہ آتا تھا جب وہ چرس پی کر گھر میں شور و غل مچاتا۔ بچّوں کو پیٹتا اور بدحواس ہو کر اُوٹ پٹانگ بکتا۔ تب مختی آگ بگولہ ہو کر اُس پر جھپٹ پڑتی۔ اُسے خوب زد و کوب کرتی۔ بیوی اور خاوند کی لڑائی کا تماشا دیکھنے کے لئے ہمسائیوں کی دیواریں لگ جاتیں!

جمال، مختی سے کُٹاپا کھا کر گھر سے بھاگ جاتا اور تب تک واپس نہ لوٹتا جب تک اُسے یقین نہ ہوتا کہ اُس کی مختی کا غصّہ اب اُتر گیا ہے!

لیکن مختی بھی جمال کی مار پٹائی کر کے خوش نہیں ہوتی تھی۔ اُس کی رگ رگ کراہتی رہتی۔ اُسے اپنے کئے پر سخت پچھتاوا ہوتا۔ اور بھرا بھرا گھر بھی جمال کے بغیر خالی خالی لگتا۔ وہ جمال کے اُن دوستوں پر، جو اُس کو للچائی نظروں سے دیکھتے، شیرنی کی طرح گرجتی۔ "جو کچھ بھی ہے جمال ہی میرا سرتاج ہے۔" اور جمال بھی کبھی کبھی نشے میں آکر اپنے دوستوں کے آگے مختی کے گیت گانے کے بغیر نہ رہ سکتا۔ "حرام زادی! مزاج کی ذرا تند ہے۔ میری ہڈیاں چور کر دیتی ہے لیکن ایک بات میں اُس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ پاک دامن ہے۔"

جمال موختی سے مار کھا کر بھی مختی کو نفرت نہ کر سکتا۔ مختی کے لئے اُس کے اندر، رُوح کی گہرائی میں ایک کشش تھی۔ کوئی میٹھا میٹھا درد تھا۔ اور مختی بھی اپنی تُند مزاجی کے باوجود زندگی کے ہر موڑ پر جمال سے باوقار رہنے کی کوشش کرتی!

مختی سے صرف جمال ہی نہیں ڈرتا تھا بلکہ حق تو یہ ہے کہ محلّے کے مرد و زن پر اُس کا سکّہ

میں جان آگئی۔ اُس نے اُسے بستر پر لٹایا۔ آہستہ آہستہ اُس کے کپڑے اتارے۔ لیکن جُما کی جوان دھڑکتی چھاتیاں دیکھ کر مختی کے ہاتھ ان جانے ہی رُک گئے۔ اور وہ ایڑی سے چوٹی تک کانپ اُٹھی۔

جُما نے دو بار مختی کی قمیص کے بٹن کھولنے کی کوشش کی۔ اور دونوں بار مختی نے اُس کا ہاتھ روکتے اُسے جھڑکا: "بیٹا آج تجھے کیا ہو گیا ہے؟ کون ڈائن آج تیرا راستہ کاٹ گئی ہے؟"

دِن بدن جُما کی پینے کی عادت بڑھتی گئی۔ وہ اب خطجی کو بھی گھورنے لگ پڑا تھا۔ داؤ لگنے پر وہ اُس کی گالیں لال کر دیتا۔ اُس کی لمبی چوٹی کھینچ لیتا۔ اور کبھی کبھی اُس کی معصوم چھتیوں کو چھیڑنے لگتا۔ لیکن خطجی اُس سے دُور بھاگتی رہتی۔ اُسے گالیاں دیتی۔ اُسے پتھر مارتی! اور مختی یہ سب کچھ دیکھتی رہتی۔ مگر ہر چیز کو دیکھ کر درگزر کرنے کی کوشش کرتی!

لیکن ایک دِن مختی ششدر ہو کے رہ گئی۔ جُما گھر آیا تو سہی، لیکن خون میں لت پت۔ اُس کے سر پہ چوٹ آئی تھی۔ اُس کی ناک سوجھ گئی تھی!

جُما کام سے لوٹتے وقت قادر شیخ کے گھر میں گھس گیا تھا۔ قادر شیخ کی رحمتی بڑی بدذات عورت تھی۔ وہ تو مردوں کے کندھوں پر سوار ہوتی تھی۔ لیکن آج جب جُما، رحمتی کی پریشان زُلفیں سنوار رہا تھا تو اُس وقت قادر شیخ اپنے بھائی کے ساتھ گھر آ گیا۔ اور دونوں بھائیوں نے رحمتی اور جُما کی خوب مرمّت کی۔

مختی نے قادر شیخ کو گالیاں دے دے کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ وہ پُکار پُکار کر کہہ رہی تھی —"رحمتی! تو بدچلن عورت ہے۔ بھلا عورت کی رضامندی کے بغیر بھی کچھ ہو سکتا ہے؟ میرا جُما تو بھولا بھالا ہے۔ بے گناہ ہے۔ بے قصور ہے۔ اُس جادوگرنی نے میرے داماد کو لوٹ کھایا ہے!"

"شکر ہے کہ میری بیٹی کو تو ایک حسین خاوند نصیب ہوا ہے! ایک حسین مرد کو دیکھتے دیکھتے ہی عورت کی آدھی بھوک مٹ جاتی ہے!"

وہ اپنے ہمسائیوں اور رشتہ داروں کے پاس جمّا کی صفتیں کرتے نہ تھکتی۔ "میرا داماد تو ایک رحمت ہے۔ کم گو، جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ ظالم کبھی نظر اونچی کر کے کسی کی طرف نہیں دیکھتا۔ کیا مجال، جو کبھی خطّجی کی طرف دیکھ جائے! اپنے سسر کے سامنے تو سگریٹ تک نہیں پیتا۔ ٹاکی دیکھنے کی تو بات ہی نہیں۔ ساری کی ساری تنخواہ میری ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے۔ مجھے ماں ماں کہتے تھکتا نہیں۔ چشم بد دور۔ لڑکا کیا ہے؟ بس شرم و حیا کی مورت ہے!"

لیکن جمّا کو شہر آئے ہوئے کئی مہینے گزر گئے۔ اور مہینے برسوں میں بدل گئے، اور اسے اب اپنا گاؤں، وہ گاؤں جو اس کی دنیا تھا، چھوٹا چھوٹا نظر آنے لگا۔ وہ شہر کی گلیاں صاف کرتا ہوا ان گلیوں میں ہی کھو گیا۔ اس کی ہم عمر لڑکیوں کی نظریں اس کے اندر ایک طرب سی چھیڑ دیتیں۔ اور اب وہ شرماتے شرماتے چوری چھپے اُن کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ لیکن محنتی کی نظروں سے جمّا کی یہ آنکھ مچولی چھپی نہ رہ سکی!

وہ مسکراتے مسکراتے جمّا کے بدلتے رنگ دیکھ رہی تھی۔ اس نے دیکھا۔ جمّا اپنے بالوں کو سنوارنے لگا تھا۔ اسے سگریٹ کی بو آنے لگی تھی۔ اور اس کی تنخواہ میں بھی دس بیس روپے کا پھیر پڑنے لگا تھا۔

ایک دن محنتی پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ جب گئی رات تک جمّا گھر نہ آیا۔ وہ کئی گلیاں چھان آئی۔ بہت چلّائی اور کڑوے گھونٹ پیتی رہی۔ مگر جمّا کہیں نظر نہ آیا!

سب دنیا سو چکی تھی۔ جمال بھی خرّاٹے بھر رہا تھا۔ خطّجی ہر چیز سے بے خبر نیند میں کروٹیں بدل رہی تھی۔ بس ایک محنتی ہی تھی جس کی نیند آج روٹھ گئی تھی۔

رات کے پورے ایک بجے جمّا گھر لوٹا، لیکن نشے میں چور۔ بدمست، محنتی کی جان
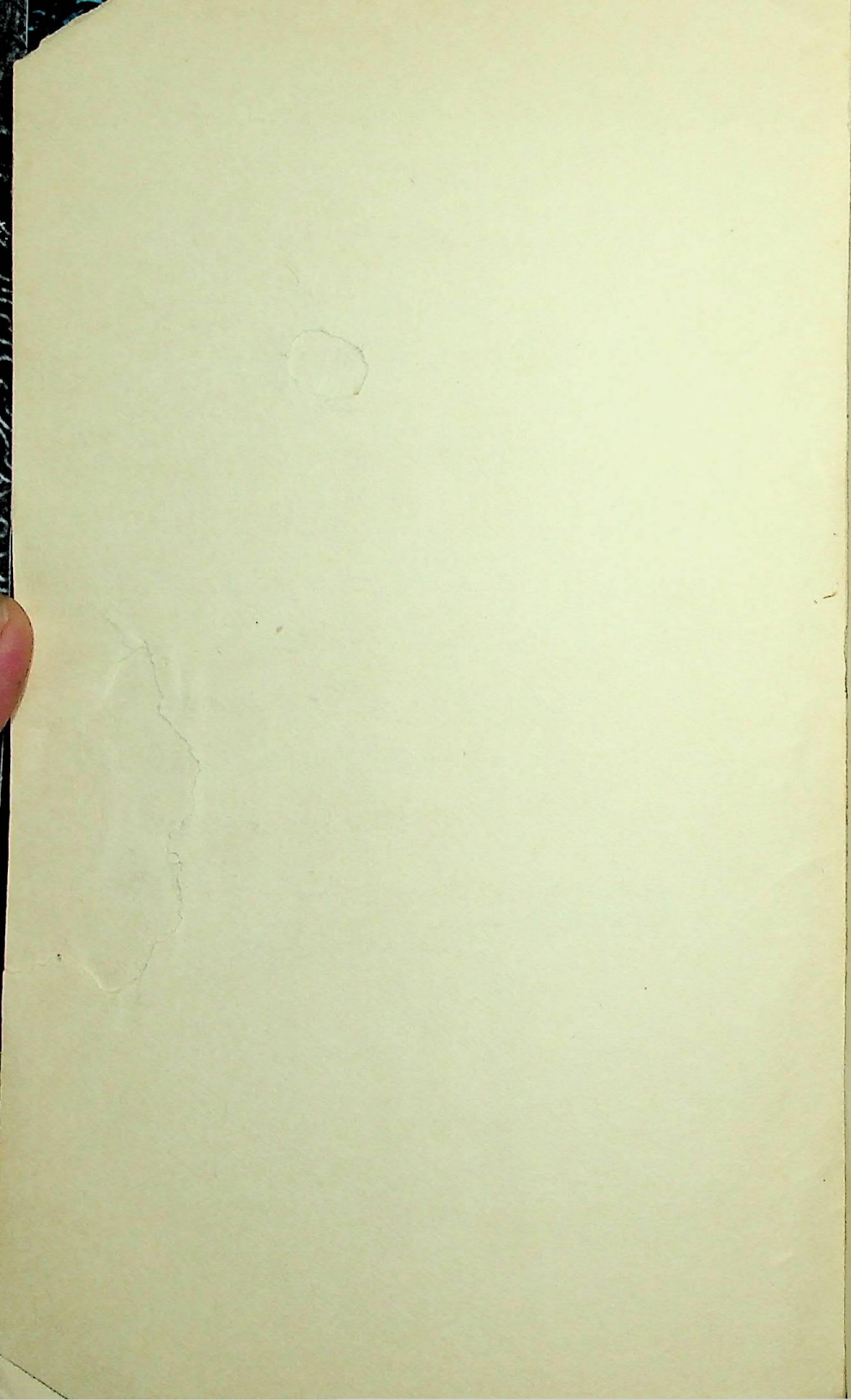
مختی کہنے کو تو بہت کچھ کہتی تھی۔ لیکن جو کچھ اُس کے اندر بیت رہا تھا، وہ زیرِ لب ہی پی رہی تھی۔

"دکھ سکتی نہ پھر گھر میں خانہ داماد کو۔ لائی تھی ایک فرہاد کو ڈھونڈ کے!" اُس کے کانوں میں یہ آوازیں پڑنے لگیں ——

خانہ داماد بھاگ جائے گا۔ گھر اس چوٹ کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ اور خطّی کے لئے ایسا ساتھی ملنا تو تقدیر کی ہی بات ہے۔ لیکن جمّا کو جس کی ضرورت ہے ...."

جُمّا کی ضرورت کے بارے میں سوچتے سوچتے مختی کانپ کے رہ جاتی۔

زخم بھرنے تک مختی نے جُمّا کو کام پر نہ جانے دیا۔ وہ خود اُس کے زخموں پر گرم گرم تیل اور ہلدی لگاتی رہی۔ اور اپنے ہاتھوں سے اُسے گرم گرم کھانے کھلاتی رہی۔ جمّا کے زخم بھر آئے۔ اُس کے چہرے کا رنگ لوٹ آیا۔ وہ کام پر دوبارہ چلا گیا۔ اور کام میں ڈوب کے رہ گیا۔ اُس نے شراب پینا چھوڑ دیا۔ وہ خوشی خوشی کام پر جاتا اور خوشی خوشی گھر واپس آتا۔ اور ساری کی ساری تنخواہ مختی کے دامن میں ڈال دیتا!

لیکن دھڑکتی مختی اب صرف ایک بُت بن کر رہ گئی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی رہتی۔ اُس کی پلکیں جمال کے سامنے جُھکی جُھکی رہتیں۔ اُسے جمال سے اب ڈر سا لگنے لگتا تھا!

———— { پنجابی سے ترجمہ: پریم سنگھ }